

روسی ادب

حصہ اول

188980

انجمن ترقی اُردو (ہند) دہلی

UNIVERSAL
LIBRARY

OU_I 188980

UNIVERSAL
LIBRARY

سلسلہ مطبوعات نمبر ۱۳۳

رؤسی ادب

محمد مجیب بی۔ لے (آکسن)

استاد جامعہ ملیہ اسلامیہ

پہلا حصہ

شائع کردہ

انجمن ترقی آزد و دہند، دہلی

۱۹۳۰ء

خاں صاحب عبداللطیف نے لطفی پریس دہلی میں چھاپا

اور

فیجر انجمن ترقی اُردو دہندہ نے دہلی سے شائع کیا

فہرست مضامین

۱-۲۹	دیباچہ
۳۰-۶۰	تمہید
۶۱-۱۰۴	پہلا باب : ادب العوام
	دوسرا باب : پہلی کوششیں
	رؤسی شاعری
۱۰۵-۱۰۹	پہلا باب : پشکن
۱۱۰-۱۶۸	دوسرا باب : لیرنٹوف
۱۶۹-۲۰۰	تیسرا باب : چیوچف
	چوتھا باب : دیل بے یف، باراتینسکی، مدزہ کوف،
۲۰۱-۲۳۸	کولٹ سوف، نی کی تن، تالتائی، نکر اسوف،
۲۳۹-۲۶۰	پانچواں باب : پارناسی شاعر، استعاریت اور انقلاب
۲۶۱-۲۹۰	رؤسی حکایتیں
	رؤسی ڈراما
۲۹۱-۳۱۱	پہلا باب : ابتدا
۳۱۲-۳۵۵	دوسرا باب : ادس تروفسکی
۳۵۶-۳۸۱	تیسرا باب : ادس تروفسکی سے انقلاب تک



دیباچہ

رؤسی ادب کی یہ تاریخ آٹھ برس میں تیار ہوئی۔ میرے لیے بڑے فخر کی بات ہوتی اگر میں یہ کہہ سکتا کہ میں نے آٹھ برس اس کتاب پر محنت کی، لیکن سچ تو یہ ہے کہ یہ مدت کتاب کی قدر بڑھانے بغیر گزر گئی۔ میں نے اس کا بہت بڑا حصہ مولوی عبدالحق صاحب کے زیر سایہ اور نگ آباد میں ۱۹۳۷ء میں لکھ لیا تھا، اور بعد کو میں بیشتر مسودے پر نظر ثانی کرتا رہا۔ مولوی صاحب کی مروت نے گوارا نہ کیا کہ مجھ سے کام جلدی ختم کرانے کو کہیں، اور مجھے اتنی یکسوئی نصیب نہ ہوئی کہ کتاب کو مکمل کر کے مولوی صاحب کی خدمت میں پیش کر سکوں۔

اب جو کتاب تیار ہو گئی ہے تو میں سوچتا ہوں کہ اسے کس حیثیت سے پیش کروں۔ وہ لوگ جو انگریزی میں رؤسی ادب کے شاہ کاروں کا مطالعہ کر چکے ہیں رؤسی نظم کے سوا اور کسی حصے کو نیایا پڑھنے کے لائق نہ پائیں گے، وہ جو اس کتاب کو رؤسی ادب سے تعارف کا ذریعہ بنائیں شاید اسے بہت طویل اور اکثر اسے دلچسپی سے خالی دیکھیں گے۔ سب سے زیادہ اندیشہ مجھے اُن دوستوں کی طرف سے ہے جنہیں رؤس کی قدر کرنا انقلاب کی تعلیم نے سکھایا ہے اور جنہیں صرف رؤسی ادب کے اس حصے سے مطلب ہے جو انقلاب کی طرح تازہ اور انقلاب کے رنگ میں ڈوبا ہوا ہے۔ یہ حضرات شاید اس کتاب کو ایک صریح دھوکا سمجھیں، اس لیے کہ انقلاب کے زمانے کے نئے مصنفوں کا اس میں ذکر ہی نہیں۔

میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ مجھے ان نظریوں سے اتفاق ہے جو انقلاب کے زمانے میں ادب اور ادیبوں کے فرائض سمجھانے کے لیے پیش کیے گئے، لیکن اس کا میں یقین دلاتا چاہتا ہوں کہ رؤسی ادب کی اس تاریخ میں یہ کمی کسی اصولی اختلاف کی وجہ سے نہیں ہو گئی۔

ب

اس کا سبب صرف میری معذوری ہو۔ میں اس زبان کو اچھی طرح نہیں سمجھ سکتا جو روس میں اچانک انقلابی تحریک کے ساتھ رائج ہو گئی اور اس زمانے کی تصانیف اہل زبان میں حاصل کرنا خاصا دشوار بھی تھا۔ جو دو چار مصنف قدیم زبان میں لکھتے رہے ان کا میں نے مطالعہ کیا، مگر یہ مطالعہ ان ادیبوں یا ادب کے اس دور کا حق ادا کرنے کے لیے کافی نہ تھا۔ اب شاید نئے روسی ادیبوں کو زبان اور اسلوب بیان میں اپنا الگ طریقہ اختیار کرنے کا وہ شوق نہیں رہا ہو جیسے پہلے تھا، اور ممکن ہو اس نئے دور کی تصانیف اہل روسی زبان میں جلد دستیاب بھی ہو سکیں۔ اگر ایسا ہوا تو انشا اللہ روسی ادب کی تاریخ کا تیسرا حصہ بھی تیار کر دیا جائے گا۔

انقلاب کے ادیبوں کے ساتھ چند ایسے مصنفوں کا ذکر بھی رہ گیا ہو جو نئے اور پرانے دور کی درمیانی کڑی ہیں۔ ان کی اس خاص حیثیت کو نظر انداز کر کے ان پر تبصرہ کرنا میں نے مناسب نہ سمجھا، اور ان کی تصانیف کا ذکر بھی میں نے اُس وقت کے لیے اٹھا رکھا ہے جب انقلاب اور اُس کی کفایتیں زیر بحث ہوں گی۔ یہیں اس کتاب کی وہ نمایاں جن کو مجھے بحیثیت مصنف خود بیان کر دینا چاہیے۔ ان کے علاوہ بہت سے عیب میں جنہیں تنقید کی نظر دیکھ گئی اور دکھائے گی اور انہیں بھی تسلیم کرنا میرا فرض ہو گا لیکن اگر اس کتاب سے کسی کا جی پہلے یا کام ٹھکے، اگر کسی کا خیال ہو کہ اس سے اردو ادب کے ذخیرے میں اضافہ ہوا ہے اور تذکرے اور تنقید کا ایک بہتر معیار قائم کرنے کی عام تحریک کو اس سے کچھ فائدہ پہنچا ہے تو اسے مولوی عبدالحق صاحب کی اس ادب پروری کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ جس نے شوق کی سدا اور استعداد کا ثبوت مانگے بغیر اتنا بڑا کام ایک انجان امیدوار کے سپرد کر دیا میں جانتا ہوں کہ میں اس لائق نہ تھا کہ مجھ پر اس طرح بھروسہ کیا جائے اور دوسری ذمہ داریوں نے مجھ اس کام کو قے نہ دیا کہ محنت سے ادبی استعداد کی وہ کسر پوری کر سکوں جسے میں قدم قدم پر محسوس کرتا رہا۔ یہ مولوی عبدالحق صاحب کی قدر دانی تھی کہ جس نے میری ہمت کو قائم رکھا، ان کی صحبت سے میں نے اتنا فیض اٹھا یا ہے کہ مجھے یقین ہو گیا ہے کہ ان کی قدر شناسی اور صلہ افزائی دوسروں سے اُس معیار کا کام کرائے گی جو مجھ سے نہ ہو سکا، اور ان کی بدولت اردو ادب کو وہ فروغ ہو گا جس کی انہیں اور ہم سب کو منتا ہے۔

روسی ادب

تمہید

ایک زمانہ تھا جب مورخ ہنسل کی ابتدا حضرت نوح کے کسی بیٹے سے کرتے تھے اور اس طریقے سے صرف مذہبی عقیدے کی پیروی نہیں ہوتی تھی، بلکہ نسلوں کے آغاز کے پیچیدہ مسائل آسانی سے حل ہو جاتے تھے۔ اب علم تاریخ کسی فرضی کارروائی کا روادار نہیں اور مورخوں کو مجبوراً اپنی لاعلمی کو علم کی صورت دینی پڑتی ہے، لیکن اگر سچ پوچھا جائے تو نسلوں کے شجرے ایسے اُلجھے ہوئے ہیں اور صحیح معلومات حاصل کرنے کے ذریعے اس قدر کم کہ ہماری کوششیں کسی طرح سے بار آور نہیں ہوتیں اور آخر میں یہی اقرار کرنا ہوتا ہے کہ پُرانا طریقہ بہتر تھا۔ مثلاً اگر روسی قوم کو سلاف، فن، قوت، سیخین، وریاگ، مورڈ، باشکیر، مہن، تاتار اور متعدد دیگر معروف ایشیائی نسلوں کا مجموعہ کہنے کے بجائے حضرت نوح کے کسی بیٹے کی اولاد بتا دیا جائے تو علم تاریخ کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا اور روسی قوم کی فطرت سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی۔ روسی قوم کی موجودہ خصوصیات ہم کسی ایک نسل کی طرف منسوب نہیں کر سکتے، کیونکہ یہ خصوصیات رفتہ رفتہ سرزمین اور فطری ماحول نے پیدا

کی ہیں اور جب کوئی نسل یا نسلوں کا مجموعہ ایک ملک میں آباد ہو جائے تو نئی نسلوں کا میل اُس کی قدیمی سیرت نہیں بدل دیتا۔ روس کی آبادی میں بہت سی نسلیں شامل ہیں جو مل جل کر تقریباً ایک سی بن گئی ہیں اور ایک ہی سرزمین کی پیداوار معلوم ہوتی ہیں تفتیش کے لائق اگر کوئی مسئلہ ہو تو صرف یہ کہ یہ نسلیں زیادہ تر یورپی ہیں یا ایشیائی، اس لیے کہ روسی تہذیب یورپ کے زیر اثر رہی ہے، لیکن روسی فطرت یورپی اثرات کو کبھی اچھی طرح سے جذب نہ کر سکی، جس سے قوم اور تہذیب دونوں کو بہت سخت نقصان پہنچا اور ہمیں اس نقصان کی وجہ معلوم ہو جائے تو روسی تاریخ اور ادب کے سمجھنے میں بہت کچھ مدد ملے گی۔ جغرافیہ کے لحاظ سے روس ایشیا کا ایک ٹکڑا ہے، اگر اس کا بھی قطعی علم ہو جائے کہ روسی نسلیں زیادہ تر ایشیائی ہیں تو ادیب اور مورخ کی بہت سی مشکلیں آسان ہو جائیں گی اور ایشیائی نسلیں جو اس وقت روسی قوم کی طرح یورپ کی تقلید کر رہی ہیں، روس کی سرگزشت سے عبرت حاصل کر سکیں گی۔

شمالی روس کی آبادی تقریباً ساری فن نسل سے ہے۔ فن لینڈ کے باشندے بلحاظ صورت و سیرت چینیوں سے مشابہ ہیں، اُن کا مذہب بھی گوتم بدھ کی تعلیم کا ایک چربا سا معلوم ہوتا ہے، گوہارے پاس اس کا کوئی تاریخی ثبوت نہیں لیکن اغلب یہی ہو کہ یہ نسل چین یا منگولیا سے ہجرت کر کے شمالی یورپ تک پہنچی اور نسلوں کے اُس سیلاب نے جو وسط ایشیا اور جرمنی سے ہر طرف بہ رہا تھا اس نسل کے ایک حصے کو فن لینڈ میں پناہ لینے پر مجبور کیا۔ دوسرا، جس کی تعداد کثیر تھی مغلوب ہو کر شمالی روس میں رہ گیا۔ وسط روس کی آبادی سلاو نسل سے ہے۔

سلاف نسل جس زمانے تک تحقیق سے دریافت ہو سکا ہے کوہ کارپتھین۔ کی مشرقی پہاڑ اور موجودہ سربیا اور بلغاریہ کے حدود میں دریائے ڈینیوب کے کنارے کنارے آباد پائی جاتی ہے۔ اس نسل کی ایک شاخ درمیانی روس کے مغربی اور جنوب مغربی حصے میں آباد ہوئی، جو ”چھوٹے روس“ کے نام سے مشہور ہے۔ اس نسل کے لوگ قد و قامت میں دوسری سلاف نسلوں سے چھوٹے ہوتے ہیں، اس وجہ سے یہ چھوٹے اور باقی بڑے کہلاتے ہیں۔ دریائے دون اور ڈنیپر کی وادیوں میں کو سکا آباد ہیں، ایک نسل جو سلاف، تاتار اور غالباً کچھ اور ناپید نسلوں کے میل سے بنی ہوئی روس کا مشرقی اور جنوب مشرقی حصہ کوہ اورال سے بحر کاسپین اور کوہ قاف تک زیادہ تر تاتار، باشکیر، کرگز اور دیگر ایشیائی نسلوں سے آباد ہے، جو ابھی تک اپنی پرانی وضع پر قائم ہیں؛ تاتاریوں میں سے کچھ عیسائی ہو کر سلاف نسل میں گھل مل گئے، جو مسلمان ہوئے اور جنھوں نے بعد میں یورپی تہذیب اختیار کرنے سے بھی انکار کیا وہ دوسری حقیر نسلوں کے ساتھ اقوام جہلم میں شمار ہوتے رہے۔ بحیثیت مجموعی روس میں سلاف نسل کی اکثریت ہے، اس لیے باوجود اپنے غیر محلول اجزاء کے روسی قوم سلاف کہلاتی ہے۔

اس امر کا قطعی فیصلہ مشکل ہے کہ سلاف نسل یورپی ہے یا ایشیائی۔ عام طور سے ہم یہ دیکھتے ہیں کہ نسلیں وسط ایشیا کے پاٹ میدانوں اور وادیوں کو چھوڑ کر لے روسی میں انھیں کزاک کہتے ہیں۔ لفظ تراق اسی نام کی ایک اور شکل اور اس قوم کی ایک اور تعریف ہے۔

یہ بولشک نظام نے انھیں اب انسانیت کا رتبہ عطا کر دیا ہے۔

مغرب یا جنوب مغرب کی طرف رخ کرتی رہی ہیں اور جنوبی روس مہاجر نسلوں کی شاہ راہ رہا ہے، جن میں سے تمام مشرق سے مغرب کی طرف گئی ہیں۔ سلاٹ نسل کی ہجرت کے بارے میں تاریخی ثبوت کوئی نہیں، لیکن یہ فرض کر لینے کی بھی کوئی وجہ نہیں کہ یہ نسل عام قاعدے کے خلاف چلی۔ وسطی یورپ سے جن نسلوں نے جنوب یا مشرق کا رخ کیا ہے ان کا حال تاریخ میں ملتا ہے، لیکن سلاٹ نسل ان میں سے نہیں ہے اور اس کے علاوہ جرمن نسلوں کی ہجرت سلاٹ نسل کے جنوبی یورپ میں آباد ہونے کے بعد شروع ہوئی۔ یونانی مورخ ہیرودوٹس کا بیان ہے کہ اس کے زمانے میں وحشی نسلیں ایک دریا کے دھارے کی طرح وسط ایشیا سے بہتی ہوئی یونان اور ایران کی شہرینا ہوں سے آکر ٹکراتی تھیں۔ سلاٹ نسل کا ذکر ہیرودوٹس یا کسی اور قدیم مورخ کی تصانیف میں نہیں ملتا، لیکن غالباً وہ بھی اسی سیلاب کی ایک موج تھی جسے کوہ کاہستھیہ کی لہج میں اور دریائے ڈینیوب کے کنارے ٹھکانا ملا۔

چوتھی صدی عیسوی میں ایک یورپی نسل بحیرہ بالٹک کی طرف سے آئی اور روس پر قابض ہو گئی۔ اس کا رہبر اور بادشاہ ہرمانرش تھا، اور یہ نسل جرمن تھی۔ ہرمانرش نے روس کو پہلی دفعہ ایک سلطنت بنایا، مگر یہ معلوم نہیں کہ جس نسل سے اس نے ملک چھینا وہ سلاٹ تھی یا کوئی اور۔ سلاٹ نسل ایک بارگی یا ایک ریٹے میں ملک پر قابض نہیں ہوئی اور اس کے شمال اور شمال مشرق کی طرف پھیل کر آباد ہونے کا حال جہاں تک ہمیں معلوم ہے وہ ہرمانرش کے بعد کا ہے۔ نویں و دسویں اور گیارھویں صدیوں میں جب سلاٹ نسل روس پر بتدریج قابض ہو رہی تھی

یورپ کی طرف سے ورہاگ اور دوسری جرمن اور سکینڈی نیوین نسلوں کے حملے ہوئے اور روسی شرفا کا دعویٰ تھا کہ وہ یورپی ہیں اور انھیں نسلوں کی اولاد میں فاتح نسلوں کی طرح ان جرمن مہاجرین نے بھی زمین پر قبضہ کر لیا، زمیندار بن گئے اور انھوں نے مغلوب سلاو نسل کی محنت کو اپنا ذریعہ معاش بنایا۔ اگر یہی صورت قائم رہتی تو یہ تسلیم کیا جاسکتا تھا کہ روس کے زاری عہد کے شرفا اور امرا سب جرمن نسل سے ہیں، لیکن تیرھویں صدی عیسوی میں تاتاروں نے روس کو تہ و بالا کر دیا، کوئی شہر کوئی شریف خاندان ان سے نہ بچ سکا، اور مشرقی روس میں انھوں نے دیہاتی آبادی تک کو نیست و نابود کر دیا۔ جس ملک میں تاتاروں نے قدم رکھا اس کے باشندوں میں تاتاری خون پہنچ گیا اور اگر روس میں کچھ ایسے خاندان بھی باقی رہ گئے جو تاتاروں کے پنجوں سے جان بچالے گئے تو یہ مشکل سے ثابت کیا جاسکے گا کہ اُن کی نسل میں تاتاری خون نہیں۔

شریف خاندانوں کے شجروں میں نقایص پیدا کرنے کے علاوہ تاتاری حملوں نے روس کو ایک اور نقصان پہنچایا۔ شہر کیف میں نویں صدی کے شروع سے عظمت کے آثار نمایاں ہو رہے تھے۔ پہلے اسے سلاو نسل نے جو رفتہ رفتہ واپس دنیپر کے عرض و طول میں پھیل رہی تھی، اپنی ایک منزل بنائی اور چونکہ قسطنطنیہ کی شاہ راہ پر واقع تھا، اس لیے وہ بہت جلد تجارت کا مرکز بن گیا۔ اسی صدی میں جب وریاگ نسل نے روس اور شہر کیف پر قبضہ کیا تو کیف کی سیاسی حیثیت بھی بڑھ گئی، یہاں تک کہ ۱۰۳۷ء میں اس کے بادشاہ نے قسطنطنیہ پر بھی حملہ

کر دیا۔ لیکن تجارتی لحاظ سے کیف کے بادشاہ حکومت قسطنطنیہ اور ان اسلامی ممالک کی سرپرستی کے محتاج تھے جن کے راستے میں قسطنطنیہ واقع تھا۔ مسلمانوں کا اثر تو صرف اس قدر ہوا کہ روسی بول چال میں بہت سے فارسی اور عربی الفاظ رائج ہو گئے، قسطنطنیہ کے اثر سے کیف کے بادشاہوں اور روس کی تقریباً کل آبادی نے عیسائی مذہب قبول کر لیا، شاہ زادہ عظیم، دلاجیر مونوماخ (۱۱۲۵ء) کے عہد میں روسی نسلیں عیسائی ہونے کی وجہ سے خود کو روشن ضمیر اور مہذب تصور کرنے لگی تھیں اور نی الا واقعہ قسطنطنیہ کے (سہانوں اور اسلامی ممالک کے تاجروں نے روس کی وحشی فطرت میں تہذیب اور تمدن کے بیج بودیے تھے۔ ان خانقاہوں میں جو بجا بقایم ہوئی تھیں چند روسی رہبانوں نے لکھنا پڑھنا سیکھا، نہر ہی ضرورتاً نے روسی ابجد اور ابجد کے ساتھ باقاعدہ زبان کی تخلیق لازمی کر دی۔ چنانچہ اسی زمانے میں کلیسائی روسی زبان کی بنیاد پڑی، لیکن تہذیب کی یہ روشنی بجلی کی سی چمک تھی اور ملک کو ایسی تاریکی میں چھوڑ گئی جو پہلے کی جہالت سے بھی زیادہ ہولناک تھی۔ شاہ زادہ عظیم کی موت کے بعد ملک میں سیاسی انتشار پیدا ہو گیا اور گذشتہ عہد کی جو تھوڑی بہت یادگار باقی تھی، اُسے تاتاروں نے ٹوٹ کر برباد کر دیا۔ تاتاری حملوں کے بعد کئی سال تک وہ شہر جو شاہان کیف کے زمانے میں آباد اور خوش حال تھے راکھ کے انبار بنے رہے، شہری زندگی اور شہری تہذیب کے تمام آثار مٹ گئے۔ تاتاریوں کے گشت و خون نے ایشیا اور یورپ میں باہمی ہیر کے

لے اسے اسلاف زبان بھی کہتے ہیں۔ انجیل کا ترجمہ ہل یونانی سے اسی زبان میں ہوا اور کلیسا میں بولشوک انقلاب تک یہی لارنج تھی۔

بیج بودیے، عیسائی مذہب کے رہنماؤں نے حسب معمول فتنے کو بڑھایا اور روسی قوم کو تاتاریوں کے توسط سے تمام ایشیائی نسلوں سے ایسی گہری نفرت ہو گئی جس کا صدیوں تک اثر باقی رہا۔ اب ہمارے زمانے میں آخر کار پولشوک انقلاب نے اُس کے نقشِ دلوں سے مٹائے ہیں۔

محض نسل کے لحاظ سے روسی قوم کو بحیثیت مجموعی یورپی تصور کرنا غلط ہے۔ لیکن وہ ایشیا کے تمدنی مرکزوں سے دور اور یورپ سے نزدیک رہی ہو یا جیسے روسی خود کہتے ہیں، اُن کا منہ یورپ کی طرف ہو اور پیٹھ ایشیا کی طرف، اس لیے روسی ذہنیت پر یورپ ہی کا اثر رہا ہے۔ تاریخی واقعات اور یورپ کی تقلید نے اسے ایشیا کا دشمن بنا دیا، با اقتدار ریاست ہونے کے بعد اس نے ایشیائی اقوام سے وہی عداوت برتی جو شروع سے اس وقت تک یورپ کی قوموں کا معمول رہی ہے۔ روسی کسانوں پر یورپی تہذیب کا اثر کبھی نہیں ہوا مگر مذہبی تعصب نے انھیں یورپ ہی سے وابستہ، یا کم از کم ایشیائی نسلوں اور ایشیائی تمدن سے بیگانہ رکھا۔ ایشیائی سیرت پر یورپی تہذیب کی قلم لگانے سے روس یورپ اور ایشیا کی درمیانی کڑی بن گیا، اور اگر اس تعلق سے روس کو نقصان ہوا اور یورپ اور ایشیا کو مطلق فائدہ نہ پہنچا، اگر روس نے یورپی اور ایشیائی تہذیب کو ارادۂ ایک جا کر کے اپنی خاص تہذیب تعمیر نہیں کی اور بنی نوع انسان میں باہمی مفاہمت کا ذریعہ نہیں بنا تو اس کا سبب اس کے رہنماؤں کی تنگ نظری تھی۔ لیکن پھر بھی روسی سیرت، تہذیب اور ادب میں ایشیائی عنصر موجود ہے، کہیں کہیں ایسی صورت میں بھی کہ ایشیا کے وطن پرستوں کو یوسف

گم گشتہ کی کہانی یاد آجائے۔

تاتاری حملوں کے بعد سے پندرھویں صدی کے وسط تک روس میں طوائف الملوکی رہی۔ ملک چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم تھا جو ایک دوسرے سے لڑتو سکتی تھیں مگر کسی میں اتنی طاقت نہ تھی کہ فتح یا شکست سے کوئی خاص نیتبہ نکلے۔ قیمت ریاست مسکو وٹلی کی، جو خاندان رومانوف کے قبضے میں تھی کسی قدر مددگار رہی اور وہ اپنے ہمسروں کے مقابلے میں پھیلتی اور مضبوط ہوتی رہی، یہاں تک کہ پندرھویں صدی کے وسط تک کوئی ایسی ریاست نہ تھی جو تنہا اس کا مقابلہ کر سکتی۔ ایک صدی کے بعد اوان چہارم (۱۵۲۳-۱۵۶۷) نے اس کے اقتدار کو اس قدر بڑھا دیا کہ وہ ملک پر حاوی ہو گئی اور بہت سی ریاستیں اس میں شامل ہو گئیں۔ اوان چہارم کے مظالم نے ملک میں بہت بے چینی پیدا کر دی اور اس کی موت پھر طوائف الملوکی کا باعث ہوئی، ریاست کا انتظام اتر ہو گیا، جان و مال تک محفوظ نہ تھے اور گزشتہ بد نظمی کے مقابلے میں اگر اس وقت حالت کچھ بہتر معلوم ہوتی ہو تو صرف اس لحاظ سے کہ اب روس ایک باقاعدہ ریاست بن گیا تھا، پہلے کی چھوٹی خود مختار ریاستیں غائب ہو گئی تھیں اور بیسیوں ظالم بادشاہوں کی بجائے صرف ایک بادشاہ تھا۔ اگر اوان کو سلیقے کا وارث ملتا تو غالباً روس اسی صدی میں مہذب نہیں تو باوقار اور مضبوط ریاستوں میں شمار ہونے لگتا، لیکن اوان کے مرتے ہی فساد اور خانہ جنگیاں شروع ہو گئیں اور ملک کا نہ کوئی پرسان حال تھا نہ ہمدرد۔

لہٰذا اس ریاست کا دار السلطنت شہر مسکو (ماسکو) تھا۔

سولھویں صدی کے آخر تک کم و بیش یہی کیفیت رہی۔ اوان چہارم کے ہاتھ کاگرام ہوا عصا اور اس کی ناکام امیدوں کا ورثہ پیٹر اعظم کو ملا جو اپنے مورث کی طرح خود سر، بے رحم اور بے باک تھا اور اتنا سنگ دل بھی کہ فساد اور بد نظمی کو جڑ سے اکھاڑنے کے لیے جتنا خون بہانا ضروری تھا وہ بہا سکے۔ اس کے علاوہ وہ بلند حوصلہ بھی تھا اور اس کے تخیل میں بھی وہی بہت تھی جو اس کے دل میں۔ اس نے یہ محسوس کیا کہ روس کو یورپ میں اقتدار حاصل کرنے کے لیے صرف اندرونی انتظامات درست کرنا اور فوج کی تعداد بڑھانا کافی نہیں تھا بلکہ انگلستان، جرمنی اور فرانس کا صنعت و حرفت میں ہم پلہ بننا بھی ضروری تھا۔ روس کی یہ حاجت پوری کرنے کے لیے اس نے خود ہالینڈ میں جا کر جہاز بنانا سیکھا اور روسیوں کو صنعت و حرفت میں کمال حاصل کرنے کی بہت ترغیب دلائی۔ روس کا قدیم دارالسلطنت ماسکو یورپ اور سمندر سے بہت دور تھا، پیٹر نے دریائے نیوا کے کنارے بحر بالٹک کے ساحل پر ایک نیا دارالسلطنت سینٹ پیٹرز برگ تعمیر کیا جو یورپ کے بڑے شہروں کی وضع پر تھا اور جس میں بہ دونوں نصفیں بھی موجود تھیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی پیٹر کو یقین ہو گیا تھا کہ روس کی ترقی صرف یورپ کی تقلید کرنے سے ہو سکتی ہے اور اُس نے روس کے سربراہان و درجہ طبقوں کو یورپی معاشرت اختیار کرنے پر مجبور کیا۔ کچھ مخالفت کے بعد جو خون کے دریاؤں میں بہا دی گئی، روسیوں نے پیٹر کے آگے تسلیم خم کر دیا۔ چند پشتوں کے بعد وہ اپنی پرانی وضع ایسی بھول گئے کہ اسے یاد کر کے انھیں خود تعجب ہوتا تھا اور اپنی نئی معاشرت کے ایسے فریفتہ ہو گئے کہ انھیں اپنی

گزشتہ زندگی اور اپنی تاریخ پر شرم آنے لگی۔ یورپ کی پیروی میں روسی ریاست نے عظمت اور اقتدار تو بہت کچھ حاصل کیا، لیکن اندھا دھند تقلید میں روسی قوم نے اپنی شخصیت گم کر دی، جو اُس کی روحانی اور اخلاقی زندگی کے لیے نہایت مہلک ثابت ہوا۔ اُس نے دنیا کی نعمتیں تو سب جمع کر لیں، لیکن دل کی وہ کیفیت ہو گئی کہ کسی بات میں مزہ نہ رہا۔

پیٹر نے روسی ادب کو ریاست کے زیر سایہ لے کر اُس کی نشوونما کے لیے راستہ صاف کر دیا، لیکن وہ زمانہ بھی بہت جلد آ گیا جب ریاست قوم کی ذہنی ترقی میں رکاوٹیں ڈالنے لگی اور جیسے پیٹر نے روسی ذہنیت کو قدیم روسی فلسفہ زندگی سے پاک کرنے کے لیے خون کے دریا بہائے تھے، ویسے ہی ایک صدی بعد زاری حکومت نے آنا دخیالی کو موت کا خوف دلا کر اور اکثر موت کی سزاؤں کے روکنا چاہا۔ روسی ذہنیت پر اس واروگیر کا بہت گہرا اثر ہوا، اور اُس عہد کی اکثر تصانیف پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہذیان کی حالت میں لکھی گئی ہیں، یا مصنف کے تخیل نے دیوانگی اختیار کر لی ہے۔ تقریباً ہر مصنف کے دل کو معلوم ہوتا ہے کہ مایوسی ایک روگ کی طرح لگ گئی ہے۔ مگر اس کیفیت کا الگ اور مفصل ذکر لازم ہے۔

روسی ادب کو جو سمجھنا چاہتا ہوں اس سے پہلے روسی فطرت کی نرالی خصوصیتوں، روسی دل کی نادکھیتیوں سے ضرور واقفیت پیدا کر لینا چاہیے۔ روسی ادب کا مورخ بھی اس پر مجبور ہے کہ اپنے پڑھنے والوں کو موضوع کی دشواریوں سے باخبر کر دے، اس لیے کہ روسی قوم کی طرح روسی ادب نے بھی باقاعدہ نشوونما

نہیں پائی (یعنی صحیح معنوں میں روسی ادب کی کوئی تاریخ نہیں۔ اُس کی صورت ایسے باغ کی نہیں ہے جس میں باغبان نے شوق اور نزاکت احساس سے ترتیب قائم کی ہو۔ وہ ایک خود رو جنگل ہے جس میں ہر پودا اور ہر پھول اپنی طبیعت کے زور سے اُگا ہے اور اپنی خوبیاں نمایاں کرنے کے لیے کسی غور پر داخت یا قدر دانی کا احسان مند نہیں) اس خود رو جنگل پر ایک سرسری نظر ممکن ہے کہیں نہ جے یا بھاڑیوں اور کانٹوں میں اُلجھ جائے، دیکھنے والے کو منظر کی سادگی اپنی طرف کھینچ نہ سکے اور وہ فطرت انسانی کی جلوہ افروزی کے دیدار کے لیے کسی اور طرف رُخ کر لے۔ روسی ادب کا مورخ اس جنگل میں آرائش کی رونق یا نظام پیدا کرنے کا دعویٰ نہیں کر سکتا، جو خود ادراک اور اشتیاق نہ رکھتا ہو اُسے اس جنگل کی سیر میں کوئی لطف نہیں آ سکتا، اس جنگل کا کوئی پھول اُس کے دل پر اپنا نقش قائم نہیں رکھ سکتا۔ سیرت کی دلفریبی اکثر صورت سے نہیں ظاہر ہوتی ہے، لیکن جسے حقیقت کی جستجو ہو اُسے ان ظاہری باتوں کے پھندے میں نہ پڑنا چاہیے اور یہ نہ بھولنا چاہیے کہ اُس کا مقصد تلاش کرنا اور پانا ہے، اعتراض کرنا اور بایوس ہو جانا نہیں۔ روسی ادب کی تاریخ صرف اسی امید پر لکھی جاسکتی ہے۔

روسی انقلاب کے کارناموں اور اس کے بعد ایک مکمل اشتراکی ریاست تعمیر کرنے کی پیہم اور بڑی حد تک کامیاب کوششوں نے روسی زندگی کا نقشہ بڑا بدلا ہے کہ اب انقلاب سے پہلے کی ساری ادبی تصانیف اور ان کی حقیقت نگاری جھوٹ اور روسی قوم پر ایک صریحی تہمت معلوم ہوتی ہے، صرف ان لوگوں کو نہیں

جو انقلابی تحریک سے ہمدردی رکھتے ہیں بلکہ انھیں بھی جن تک صرف روس کے تنظیمی کارناموں کی شہرت پہنچ گئی ہو۔ روسی ادب کے مورخ کا یہ کام نہیں ہے کہ وہ اس کا پلٹ کے اسباب بیان کرے، یا اس پر بحث کرے کہ جو کچھ ہم اپنے زمانے میں دیکھ رہے ہیں اس سے روسی طبیعت کا زیادہ صحیح اندازہ ہوتا ہو یا انقلاب سے پہلے کی حقیقت نگاری سے۔ اصل میں تو یہ معمہ زمانہ خود طے کرے گا۔ اس وقت اگر ہم یہ طے کر لیں کہ انقلاب سے پہلے کے ادیب اندھے یا جھوٹے تھے کہ روسی ادب کا مطالعہ نہ کرنا ہی بہتر ہے۔ لیکن اگر ہم کو یہ زیادتی اور بے انصافی معلوم ہو اور ہم روسی ادب کا بغیر کسی ذہنی تعصب کے مطالعہ کرنا چاہیں تو یہ ممکن ہے کہ ہم روس کی حیرت انگیز تبدیلی کو انسانی طبیعت کا ایک کرشمہ سمجھیں اور تاریخ اور موجودہ زندگی کا جوڑ ملا لیں۔ اس تہدید میں روسی طبیعت خصوصاً انفرادیت اور اتحادِ عمل کے جذبے اور صلاحیت کی عدم موجودگی کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا ہو وہ انقلاب سے پہلے کی حالت کو مدنظر رکھ کر لکھا گیا ہو اس بنا پر کہ روسی زندگی کا جس نے بھی مشاہدہ کیا، چاہے وہ ادیب ہو یا مورخ یا سیاح، اس حقیقت سے انکار نہیں کرتا۔

روسی مورخ کلیوچسکی لکھتا ہے: ”یورپ میں کوئی ایسی قوم نہیں جس کے افراد تھوڑی مدت تک اس جانفشانی اور تیزی سے کام کر سکیں جیسے کہ روسی کرتا ہے، مگر استقلال اور اندازے سے زیادہ عرصے تک محنت کرنے کی صلاحیت بھی کہیں اس قدر کیاب نہیں۔“ روسی ادب کو نظام اور نشو و نما سے محروم رکھنے کی سب سے زیادہ ذمہ دار قومی سیرت کی یہ خصوصیت ہے۔

ادب اور عام طور سے فنونِ لطیفہ میں اُن اصولوں کو بہت کم دخل ہے جن کے مطابق عمل کرنا عالم کا فرض ہے، لیکن روسیوں میں تلون مزاجی اور بیقراری اس حد تک پہنچ گئی تھی کہ وہ کسی قسم کا ادبی معیار یا تنقید کے کوئی اصول تک مقرر نہیں کر سکے۔ روسی مذاق اس حیرت انگیز تیزی سے بدلتا رہا ہے اور ہر نئے دور نے پچھلے دور کے ادبی دیوتاؤں اور بزرگوں کی یاد کو اس بے دلی سے مٹایا ہے کہ (مورخ کے لیے کسی قسم کا سلسلہ قائم کرنا صرت ناممکن نہیں بلکہ غلط بھی ہو جاتا ہے۔ اگر مورخ اٹھارہویں صدی کا ادبی ذخیرہ جمع کرتا ہے اور اس کا مطالعہ کر کے انیسویں صدی کے ادب میں وہ خصوصیات تلاش کرتا ہے جن کی اسے پچھلی صدی کے کارناموں میں ایک جھلک سی نظر آئی ہو تو اسے سراسر مایوسی ہوتی ہے، انیسویں صدی کے مصنفوں نے بالکل الگ رنگ اختیار کیا اور جدت کے شوق میں انھوں نے گزشتہ دور کی آرزوؤں اور کوششوں کو بالکل بالائے طاق رکھ دیا، انیسویں صدی کے پہلے حصے کا طرز نہ ہمیں اس کے آخری حصے میں نہیں ملتا، بیسویں صدی میں انقلاب سے قبل پھر ایک نیا دور شروع ہوا جس میں انیسویں صدی کے آخر کے اسلوب بالکل ترک کر دیے گئے اور روسی ادب کے آئینے میں اُس شکل میں بہ شکل پہچان سکیں گے جو اُس نے انقلاب کے بعد اختیار کی ہے۔ اٹھارہویں صدی کے وسط سے جب ادبی جدوجہد کا آغاز ہوتا ہے، روسی زبان نے بھی کئی جنم لیے ہیں۔ پہلے یہ کوشش تھی کہ اُس کی خامیوں کی خانہ پُری فرانسیسی زبان سے کی جائے، پھر جدت پسندی نے یہ عادت چھڑا کر اسے خالص روسی بنانا چاہا۔ انیسویں صدی کے نصف

دیکھ نہ رہا ہو، دوسروں کے ساتھ باہمی امداد کے اصولوں پر اسے عمل کرنے کی عادت نہیں اور خواہش بھی نہیں۔ وہ دل کی بات کہتے ہوئے گھبراتا ہی کسی کو اپنا راز داں بنانا نہیں چاہتا، ہر وقت چوکتا رہتا ہی، تنہائی اُسے ہر قسم کی صحبت سے زیادہ مرغوب ہوتی ہے، اپنے اوپر بیگانہ نظریں دیکھ کر وہ اپنے ہنر چھپا لیتا ہے اور یوں صحبت میں اس کی بہت سی خوبیاں پوشیدہ رہتی ہیں۔“ (کلیو چفسکی: ”تاریخ روس“)

سیردنی اثرات اور ملک کی نشوونما نے اقتصادی حالت بہت بدلی ہے ”جنگلوں“ میں محنت کرنے پر روسی مجبور نہیں، دوسری نسلوں کے شمول نے روسی طبیعت اور نفسی کیفیات میں رنگارنگی پیدا کر دی ہے، مگر پھر بھی یہ قدیم سلاوی خصوصیات قوم کے بڑے حصے میں پائی جاتی ہیں اور روسی کسانوں میں اب تک ہو بہو موجود ہیں۔ آگے چل کر جب روسی ناول نویس ہمیں روسی زندگی کی تصویریں دکھائیں گے، تو ممکن ہے یہ خیال پیدا ہو کہ روسی فطرت کو ان چند خصوصیات پر محدود کرنا اس کے حق میں نا انصافی ہے، مگر ہمیں کبھی انہیں بھولنا نہیں چاہیے، اس لیے کہ اگر یہ سطح پر نظر بھی نہ آئیں تو یہ ان کے معدوم ہونے کی کوئی دلیل نہیں اور اگر ہم نے ان کو ذہن نشین نہ کیا تو ہم روسی زندگی کے بہت سے معنی حل نہ کر سکیں گے، نادلوں اور ڈراموں کے بہت سے کیرکٹر ہمیں مصنوعی معلوم ہوں گے، جن فکروں میں وہ مبتلا ہیں ان کی اہمیت کا ہمیں احساس نہ ہوگا۔

یہی خصوصیات ہیں جن کی وجہ سے روسی ادب باقاعدہ نشوونما نہیں

پاسکا، انھیں نے اُس میں انفرادیت کا رنگ بھی گہرا کر دیا ہے۔ دوسری قوموں نے رنہ رنہ اپنے ادب کا ذخیرہ اکٹھا کیا ہے، اُن کا ادب ایک عمارت ہے جو اینٹ سے اینٹ جوڑ کر صدیوں میں تیار ہوئی، روسی ادب ایک طلسمی محل کی طرح حیرت انگیز تیزی سے وجود میں آگیا، اس کی ہستی محض جوہر ہی جوہر ہی اور اُس کا سارا سرمایہ چند عظیم الشان شخصیتیں، جن میں سے ہر ایک نے الگ رنگ اختیار کیا، جو ایک دوسری سے اور اپنی قومی تاریخ سے بالکل بے نیاز ہیں، دفعتاً نمودار ہوئیں اور دفعتاً ناپید ہو گئیں۔ کلیوچسکی نے روسی طبیعت کی جو تعریف کی ہے وہ دراصل بالکل صحیح ہے اور جس قدر ہم روسی ادب کی نرالی روش پر غور کرتے ہیں، اُس کے قول کی صداقت ظاہر ہوتی جاتی ہے: "خوش درخشید و لے دولت مستعجل بود" روسی ادب کی کل تاریخ اس ایک مصرع میں بیان ہو جاتی ہے اور اسی وجہ سے کہ روسی طبیعت میں تیزی ہے، استقلال نہیں، روسی ادب کی بے نیازی اور جدت پسندی کو انتہائی شدت پر اسی انفرادیت کے ماوس نے پہنچا یا ہے جو افراد کو تنہا اور سوسائٹی کے جو روا احسان سے بے فکر اور بے خبر رکھتا ہے۔

انفرادیت کا لازمی نتیجہ انتشار ہوتا ہے۔ روسی ادب کی خوبیوں کو دیکھتے ہوئے ہم اس کی زیادہ شکایت تو نہیں کر سکتے، اس لیے کہ انفرادیت اور انتشار کے بغیر بہت ممکن ہے کہ یہ خوبیاں نمایاں نہ ہوتیں، لیکن روسی فطرت کی اس پھڑکتی ہوئی رگ نے کچھ خامیاں بھی پیدا کر دی ہیں، جن کا اعتراف کرنا انصاف کا تقاضا ہے۔ پہلا نقص بیان ہو چکا ہے، یعنی یہ کہ روسی ادب کی کوئی مجموعی شکل اور مسلسل تاریخی نشوونما نہیں۔ تنقید کے لیے معیار مقرر ہونا درکنار روسی ادب کی کوئی مستند اور

مفصل تاریخ نہیں لکھی گئی ہو۔ لیکن کے سواروسی انشا پردازوں میں کوئی ایسی جامع شخصیت بھی نہیں ہوئی ہے جس کا ادبی حلقوں پر ایک نسل سے زیادہ اثر رہا ہو، اور لیکن کی بھی وہ حیثیت نہیں جو جرمنی میں گوٹے یا انگریزی ادب میں ٹیکسیر کی ہو۔ اس کی تلافی انفرادی عظمت نے ایک حد تک ضرور کی ہے، لیکن روسی ادب اس اعتراض سے بری نہیں کیا جاسکتا کہ اس میں سلسلہ مرکزیت اور نظام نہیں۔ اس سلسلے میں ایک اور الزام بھی ہے، جس کا اقرار کرتے ہوئے زیادہ افسوس ہوتا ہے: تالستانی کی چند تصانیف کے علاوہ روسی ادب میں تشکیل زندگی کی کوئی کوشش نظر نہیں آتی اور انفرادی حیثیت سے بھی بہت کم ایسے مصنف ہیں جن کے حق میں دعویٰ کیا جاسکتا ہو کہ یہ حوصلہ ان کا محرک تھا۔ لیکن تو گنیف اور دستفسکی کی تصانیف میں کبھی کبھی اس کی ایک جھلک سی دکھائی دیتی ہے، لیکن اس پر حزن مایوسی اور تقدیر پرستی حاوی رہتی ہے، یا تو جبر کسی اور سلسلے کی طرف منتقل کر دی جاتی ہے جس کی دلچسپی یا اخلاقی اہمیت کچھ بھی ہو اس سے تشکیل زندگی کا مقصد کسی طرح بھی نہیں پورا ہو سکتا۔ انگلستان میں ناول نویسی قوم کی اصلاح کے لیے ایجاد کی گئی تھی، اب بھی سنجیدہ ناول نویسوں سے یہ امید کی جاتی ہے کہ اگر وہ کسی خاص عقیدے یا تخیل کے مبلغ نہ ہوں، تب بھی قوم کے اُن افراد کو جو اُن کے زیر اثر ہیں، ایک قطعہ زندگی تعمیر کرنے میں مدد دیں، قومی زندگی پر نکتہ چینی کریں، قوم کو اپنے دماغ اور دل اور ذہنیت کی اصلاح کرنے کی رغبت دلائیں یا کسی خاص معاملے میں اس کی ضرورت سمجھائیں۔ جرمن تہذیب میں محض گوٹے کی شخصیت نے ایک ذہنی انقلاب پیدا کر دیا، اور

اپنی قوم کے لیے جو رومی کلیسا سے قطع تعلق کر چکی تھی اور جس کی روحانی ضروریات اس کا اپنا کلیسا اور کلیسائی تعلیم نہیں پوری کر سکتی تھی، ایک مکمل فلسفہ زندگی فراہم کیا جو اب تک ایک مذہب کا کام دے رہا ہے تشکیل زندگی کے لیے قومیت کا احساس لازم ہے اور اگر یہ احساس زیادہ شدید نہ ہو جائے تو اُس سے صرف ملک کی اندرونی زندگی میں ہم آہنگی نہیں پیدا ہو جاتی بلکہ قوم کو ذہنی اور روحانی نشوونما کی طرف رغبت دلانے کے لیے ایک محرک مل جاتا ہے اور افراد میں تخلیق اور تعمیر کی آرزو بھڑک اُٹھتی ہے۔ اگر قومیت کا احساس نہ ہو یا ضروری نہ سمجھا جائے تب بھی انسانیت کا تقاضا ہے کہ مجموعی زندگی کا ایک مقررہ نصب العین ہو جسے حاصل کرنے کی سوسائٹی ہمیشہ کوشش کرتی رہے۔ مگر قومی نصب العین اُسی وقت قائم ہو سکتے ہیں جب قوم کے افراد انھیں اپنی انسانیت اور ترقی کی شرط سمجھیں اور انھیں یقین ہو کہ قوم میں مجھ ہونے سے اُن کے جذبات کو وہ تسکین حاصل ہو سکتی ہے جو انھیں اپنی آرزوئیں اپنی ذات تک محدود رکھنے سے نہیں مل سکتی۔ یورپ کی دوسری قوموں نے ذہنی انفرادیت یعنی فرد کی ذہنی آزادی، خود مختاری اور بے نیازی قربان کر کے ایک قومی شخصیت تعمیر کی ہے، ایک عظیم الشان ہستی جس میں انفرادیت کی تمام خصوصیات موجود ہیں، وہ اس قومی شخصیت کے کمال کو اپنا کمال سمجھتی ہیں، اُسی میں اُن کے مذہب، اخلاق، جہانی اور روحانی زندگی کا سامان ہے۔ مگر روسی فطرت نہ تو اپنی انفرادیت کے ایشارہ پر راضی ہو سکتی ہے، نہ یقین کر سکتی ہے کہ قوم کی شخصیت میں فرد کو کبھی فلاح حاصل ہوگی۔ قوم اور ملک اُس کے نزدیک انسان نے چند سیاسی اور

اقتصادی ضروریات پوری کرنے کے لیے ایجاد کیے ہیں جب اُن کی اپنی کوئی ہستی نہیں تو وہ دوسروں کی ہستیاں کیا بنائیں یا سنواریں گے۔ چنانچہ روس میں باہمی زندگی نے کبھی صحیح معنوں میں ایک سوسائٹی کی صورت نہیں پائی، روسی قوم نے بحیثیت مجموعی کبھی ترقی کرنے کی جدوجہد نہیں کی اور کوئی سیاسی تحریک ایک ہنایت محدود حلقے کے باہر اثر نہیں کر سکی۔ روس کے خوش حال طبقوں کو پیٹر اعظم نے یورپی طرز معاشرت اختیار کرنے پر مجبور کیا اور یوں اُن کے لیے یورپی تہذیب کے دروازے کھل گئے، اُنھیں اپنی انسانیت کو فرح دینے کی کوئی خواہش نہیں تھی۔ روسی کسان انیسویں صدی میں جبراً آزاد کیے گئے، اُن کو اس طرح سے زمینداروں کے پنجے سے رہائی ملی، لیکن اُنھوں نے خود آزادی کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھی تھی، ہمیشہ سے دنیا کی ساری مصیبتیں خاموشی سے جھیلنے چلے آ رہے تھے اور اپنی اقتصادی حالت سے کبھی بے اطمینانی نہیں ظاہر کی۔ بولشوک انقلاب بھی کسی ایسی تحریک کا نتیجہ نہیں جس میں قوم کیا افراد کی بھی کثیر تعداد شریک ہوئی ہو یا اُس کے نصب العین سے ہمدردی رکھتی ہو۔ روس کی تاریخ میں سینکڑوں ایسے حوصلہ مند روشن ضمیر افراد ملیں گے جنھوں نے قوم کی ہمدردی کے لیے کسی ایثار کو دشوار نہ سمجھا، کسی سزل کے خوف سے قدم پیچھے نہ ہٹایا۔ مگر قوم نے کبھی اُن کی تباہی اور بربادی پر افسوس نہ کیا، نہ اُن کے ایثار سے محظوظ ہوئی اور نہ کسی علمی صورت میں ہمدردی ظاہر کی، اس لیے کہ روسی ”ہر کوشش کی ناکامیابی فرض کر لیتے ہیں“ روسی دماغ میں زندگی کے مسائل پر تنقید کرنے کے لیے

بہت سامان ہے، تخلیق اور تعمیر کے لیے کچھ بھی نہیں۔ روسی ادب روسی فطرت کا صحیح عکس ہے۔

لیکن روسی انشا پردازوں کی صفائی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ علاوہ ان کی اپنی طبیعتوں کے جو تخلیق کے مقابلے میں تنقید کی طرف زیادہ مائل تھیں اور علاوہ اُس انفرادیت کے جو روسیوں کو اس قدر عزیز ہے، کچھ تاریخی واقعات بھی ایسے ہوئے جنہوں نے تشکیل زندگی کی انگلیوں سے روسی ادب کو محروم رکھا۔ روسی قوم نے بحیثیت مجموعی ترقی نہیں کی، ماحول میں جو تغیر تبدیل دوسری قوموں میں تدریجی نشوونما نے پیدا کیا وہ روس میں انقلابوں کے ذریعے سے ظہور میں آیا۔ پہلا انقلاب، جو مہلک ثابت ہوا اُس وقت سے شروع ہوا جب پیٹر اعظم نے جبراً یورپی طرز معاشرت رائج کرایا۔ پیٹر اعظم کو انسانیت اور تہذیب کے گہرے مسائل سے کوئی واسطہ نہ تھا، نہ اپنی تحریک کے آخری نتائج کی پروا۔ روسی ریاست اور سربراہان اور وہ طبقات کی تمام کوششوں سے نقل اور اصل کا فرق نہیں مٹ سکا، یورپی تہذیب روس میں بالکل سطحی رہی، اس لیے کہ روسیوں نے لباس اور طرز معاشرت بدل لیا، اُن کی طبیعتیں وہی رہیں، دل وہی رہے۔ اُنہوں نے فرانسیسی اور جرمن زبانیں سیکھیں اپنے آپ کو فخریہ طور پر یورپی کہنے لگے۔ اس سے زیادہ تغیر بیرونی دباؤ یا بادشاہ کا حکم نہیں پیدا کر سکتا تھا۔ اس تغیر کا سب سے اہم نتیجہ یہ ہوا کہ روسی قوم کا وہی طبقہ جو رہبری کر سکتا تھا، خود گم راہ ہو گیا، تقلید نے اُس میں خودداری اور قومیت کا احساس بالکل مٹا دیا، یہاں تک کہ وہ تمدنی اور تہذیبی سلسلہ قائم رکھنے کا

فرض بھی بھول گیا۔ ممکن ہو یہ تجربہ اس قدر مہلک نہ ثابت ہوتا اگر قوم کے ہر طبقے نے اس میں شرکت کی ہوتی۔ لیکن روس کی دیہاتی آبادی پیٹر اعظم کے فہنی جبر و قہر کی زد سے باہر تھی، وہ اس انقلاب سے بے خبر اپنی پُرانی وضع پر قائم رہی اور رفتہ رفتہ جب یورپی تہذیب کے اثرات خوش حال شہری طبقوں میں سرایت کر گئے تو امیر اور غریب میں علاوہ اقتصادی فرق کے تہذیبی تضاد بھی پیدا ہو گیا، تعلیم یافتہ حلقے یورپ کی ترقی، یورپی زندگی کی بھرپور سے ایسے سرعوب ہو گئے کہ انھیں قوم کی حالت پر شرم آنے لگی، مگر وہ تعداد میں بہت کم تھے، ان کی اپنی روشنی ابھی تک بہت دھیمی تھی اور اگر وہ اس کی ہمت بھی کرتے کہ قوم کے رہبر بنیں تو وہ تفرقہ جو تہذیب اور طرز معاشرت نے شہری اور غریب دیہاتی کے درمیان ڈال رکھا تھا انھیں ایک قدم آگے نہ بڑھنے دیتا۔ بے بسی میں وہ قوم سے نفرت کرنے لگے، اپنی قوم، اپنی قدیم تہذیب ان کی نظروں سے گزرتی تعمیر اور تشکیل زندگی کی اُمنگیں انھوں نے مایوسی کے ایک ہمہ گیر غلطے میں ڈبو دیں، ہر کوشش کی ناکامیابی پہلے سے فرض سے کر لی۔ وہ ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے رہے اور ادھی اور سطحی تقلید کی وبا پھیلتی رہی۔

انیسویں صدی کے شروع میں جب مغربی شراب کا نشہ کچھ اُترا اور روشنی ضمیر ردیوں کو اپنی تہذیبی تہی دستی کا پورا احساس ہوا تو خانہ سازی کی اُمنگوں نے پھر جوش کیا۔ تعلیم یافتہ اور خوش حال طبقوں کے لیے اب بھی موقع تھا کہ ملک کی ذہنیت درست کریں اور روسی قوم میں خودی اور شخصیت کا جذبہ پیدا کر کے اُسے بے معنی تقلید کے مہلک مرض سے بچائیں۔ لیکن یہ بیماری حد سے

گذر گئی تھی، اب صرف قوم کے مختلف اجزا کو ترتیب دینا نہیں تھا، بلکہ ایسی ریاست کا مقابلہ بھی کرنا تھا جو ان اجزا کو پریشان رکھنا چاہتی تھی اور ذہنی اور سیاسی بیداری کو اپنی موت کا پیش خیمہ سمجھتی تھی۔ روس کا محدود روشن خیال طبقہ بالکل اس ریاست کے قابو میں تھا، اور ۱۸۲۵ء کی ڈیکبرسٹ بغاوت کے بعد اس نے یہ بھی دکھا دیا کہ اپنی حفاظت کے لیے وہ اس طبقے کو بیخ و بن سے اٹھاڑنے پر تیار ہے۔ دوسری طرف قوم نے ایسی بے پردائی اور بیگانگی برتی کہ ایشیا کی لذت جاتی رہی اور روشن خیال لوگوں کو عام طور سے دل ہی دل میں اپنی امانگوں کا گلا گھونٹ دینے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔

ڈیکبرسٹ بغاوت میں حاکموں کے ظلم اور قوم کی غفلت کا جو اندازہ ہوا وہ ایسا سبق تھا جسے حوصلہ مند قوم پرست کبھی نہیں بھولے۔ عمل اور تشکیل زندگی کے منصوبوں کو چھوڑ کر انھوں نے اپنے دلوں کو تحمل اور رضا کی تعلیم دی اور ان میں سیاسی جوش کو کبھی بڑھنے نہیں دیا۔ وہی نشوونما کے لیے انھوں نے اور راستے نکالے جو اس قدر خطرناک نہ تھے اور جن میں بہت افزائی اور تسلی کے لیے قوم کی طرف امید کی نگاہیں اٹھانا ضروری نہ تھا، نہ اس کی غفلت اور بے پردائی سے شرمندہ ہونے کا اندیشہ۔ روسی قوم اپنی صبح اور تاریخی شاہ راہ سے بھٹک گئی تھی، اسے گمراہ کرنے کے لیے اس کے خیر میں کافی مادہ موجود تھا۔ ہمیں اس کا افسوس تو ضرور ہے کہ تعلیم یافتہ طبقہ روسی قوم کی رہبری نہ کر سکا۔ لیکن روسی ادب اور انشا پردازوں پر زندگی سے بے تعلقی کا الزام لگاتے ہوئے تاریخی واقعات اور انسانی مجبور یوں کو نہ بھولنا چاہیے۔

روشن خیال روسیوں نے اگر تخلیق اور تعمیر کی تمنائیں دل سے نکال دیں تو انہوں نے اس کا خیارہ بھی بھگتا۔ انسان کو عام زندگی سے وابستہ اس کی آرزو رکھتی ہیں اور اس کی فطرت کا تقاضا ہے کہ وہ آرزو کرے اور اپنی زندگی کو اپنے ماحول سے وابستہ رکھے جو شخص روحانی تنہائی اختیار کرتا ہے اسے اپنی روحانی ضروریات اور فرائض سے رہائی نہیں ملتی، بلکہ وہ قوت جسے سماجی فرائض کی ادائیگی میں صرف کرنا اس کی فطرت کا تقاضا ہے اور کیفیتیں پیدا کرتی ہے جو اس کے لیے ایک مصیبت ہو جاتی ہیں۔ روسی کو اپنی ذات کا احساس بہت ہی فطرتاً تنہائی پسند ہونے کی وجہ سے وہ ان روحانی تکلیفوں کو بخوبی برداشت کر سکتا ہے جو تنہائی کی شدت کا لازمی نتیجہ ہیں۔ لیکن تنہائی کی شدت نے اس کی طبیعت کی ہم آہنگی اور توازن میں فرق ضرور ڈالا ہے، جو اس کے لیے کسی طرح سے فائدہ نہیں ثابت ہوا۔ انسان کو اپنی ذات کا احساس ضرور ہونا چاہئے لیکن اگر یہ احساس اسے عملی زندگی کی طرف مائل نہ کرے، یا عملی زندگی میں اس کی مدد نہ کرے تو وہ طبیعت کی خامی یا ذہن کی بیماری ہے، محض قوت مشاہدہ کی معجز نگاری نہیں۔ روسی ذہنیت میں اس بیماری نے بہت خطرناک صورت اختیار کر لی تھی اور جس اخلاقی اور سیاسی سستی سے ملک کو بولشوک انقلاب نے نجات دلائی وہ سب سے زیادہ اسی ذہنی مرض کا نتیجہ تھی۔ روسی انشا پر دازوں نے اس خصوصیت کو بہت خوبی اور سچائی سے ظاہر کیا ہے، لیکن کبھی کبھی ان کی حقیقت نگاری بھی کھلنے لگتی ہے۔ جو بیان روسی طبیعت کے لیے صحیح ہے اور روسیوں کو اپنی فطرت کی حقیقی تصویر دکھاتا ہے، وہ ہمیشہ ان طبیعتوں کے

متعلق صبح اور حقیقت نما نہیں ہو سکتا، جنھوں نے مختلف ماحول میں تربیت اور نشو و نما پائی ہو، یا جن کی افتاد اور ہی، اور انسانی فطرت کے بھید بوجھنے والوں پر لازم ہو کہ وہ اپنے ماحول کے محدود دائرے سے گزر کر تمام بنی نوع انسان کو اپنا مخاطب اور اپنا موضوع بنائیں۔ اس نقطہ نظر سے تقریباً تمام روسی انشا پرداروں پر کسی ذکسی حد تک یہ اعتراض کیا جاسکتا ہے کہ انھوں نے انسان کی صحت سے زیادہ اس کی بیماریوں کی طرف توجہ کی ہو، اُن کی نگاہ کا رجحان انسانی ہستی کی طرف ہو، بلندی کی طرف نہیں، یعنی انھیں پڑھ کر ہم اُس ہستی سے زیادہ واقف ہو جاتے ہیں جس میں نادانی اور قسمت کی خرابی انسان کو گرفتار کر سکتی ہے یہ نسبت اس بلندی کے جس پلاس کی فطرت کی پوشیدہ قوتیں اسے پہنچا سکتی ہیں اور حقیقت میں اگر انسان بہت بھی ہو تو اس کا بلندی اور بزرگی حاصل کرنا حقیقت سے بعید نہیں۔ مگر یہ ضرور ہو کہ جن مصنفوں نے ہستی کے غار کو سب سے زیادہ تاریک دکھایا ہو اور اس کی سیر کے لیے ان کا ذوق جفا کنی بڑی کثرت سے اور بڑے انہماک کے ساتھ انھیں لے جاتا ہو وہ بلندی کے خواب بھی اکثر دیکھتے ہیں اور ان خوابوں میں اصلیت اور یقین کی ایسی تاثیر ہوتی ہے جو اعتدال پسند مصنفوں کے امکان اور تصور سے باہر اور برتر ہوتی ہے۔ مثلاً ذہن اور دل کی بیماریاں مایوسی اور سبکی کی وہ فضا جس میں معلوم ہوتا ہے کہ دستفکس کا تصور ایک زخمی پرندے کی طرح پھڑپھڑا رہا ہو دراصل امید اور کامیابی اور فلک پہا بلندی پر دازی کی تمہید ہے، یہ ایک ایسی منزل ہے جس سے گزرنا ہر

ذی حس انسان کے لیے لازم ہے اور جس سے گزر کر ہم انسانیت کا جلوہ دیکھ سکتے ہیں، اس جلوے کا عکس ہمارے دلوں میں محفوظ رہ سکتا ہے، اور اگر ہم چاہیں تو انسانی زندگی کو اس سے روشن بھی کر سکتے ہیں میکسم گورکی جن مفلس، مصیبت زدہ اور بدچلن روسیوں کا ہم سے تعارف کراتا ہے ان کی فطرت غربت اور بُری عادتوں کی زنجیروں میں ایسی بُری طرح جکڑی ہوئی ہے ان کے دلوں کو بُرے اعمال اور ارادوں نے ایسا سیاہ کر رکھا ہے، ان کے ماحول میں براہِ راست پر چلنے کی ترغیب دلانے والے اثرات اتنے کم اور کمزور ہیں کہ ہمیں ان کے انسان ہونے کیا زندہ رہنے پر تعجب ہوتا ہے، لیکن انسانیت کی اس عبرت انگیز بربادی میں بھی ایک روشنی کبھی کبھی نظر آ جاتی ہے جس پر ہم اگر اپنی نظر قائم رکھ سکیں تو گورکی کے تمام دیرانے آباد معلوم ہونے لگتے ہیں، اس کے بیماروں میں صحت کے وہ آثار کمزوروں میں زندگی کی وہ علامات ظاہر ہونے لگتی ہیں جو ہم کو یقین دلا دیتی ہیں کہ انسانیت کا جو ہر کبھی گم نہیں ہو سکتا اس کے دشمن اسے چاہے جتنا چھپائیں وہ ہماری نظروں سے بالکل غائب نہیں ہو سکتا اور جب کبھی وہ نظر آئے گا تو اس شان سے کہ ہم صرف دوسروں کی نہیں بلکہ اپنی زندگی بھی اس سے روشن پائیں گے۔ گورکی نے انسانیت کا جو جو ہر دریافت کیا ہے، وہ انسانی ہمدردی ہے، ایک جذبہ جو پست حیوانی زندگی کی تاریکی کو اسی طرح سے ریزہ ریزہ کر دیتا ہے جیسے بجلی کالی گھٹاؤں کے اندھیرے کو۔

روسی ادب دراصل محض مایوس اور حزن کا ترانہ نہیں، جیسا کہ اس کے

چند نغادوں کا دعویٰ ہے، مگر روسی انشا پردازوں نے زندگی کو زیادہ شوخ رنگوں میں دکھا کر اکثر خود اپنی امیدوں پر پردہ ڈال دیا ہے۔ وہ ہمارے دلوں میں وہ کیفیت پیدا کرنا چاہتے ہیں جو ان کے دلوں پر گز رہ چکی ہو اور اس کا مطلق لحاظ نہیں رکھتے کہ ہم یہ بار برداشت کر سکتے ہیں یا نہیں، وہ ہمیں دوزخ کی سیر کراتے ہیں اور بخیرِ جنت کا راستہ بتائے ہوئے ہمارا ساتھ چھوڑ دیتے ہیں۔ اس طرزِ عمل سے شکایت زیادہ تر ان لوگوں کو جو جن کے خیال میں ادبی تصنیفات کا اصل مقصد دلچسپ ہونا جذبات میں گدگدی پیدا کرنا اور حسبِ فرصت یا بیکاری کا وقت ختم ہو جائے تو یاد سے محو ہو جانا ہے۔ سنجیدہ ناول نویسوں کا نصب العین کبھی اور کہیں بھی ایسا حقیر نہیں ہوا ہے کہ وہ اس مذاق کا لحاظ کریں، لیکن روسی انشا پرداز اکثر ایک قدم آگے بڑھ گئے ہیں اور ناول اور افسانوں سے حتی الامکان خالص دلچسپی کا عنصر بالکل نکال دیا ہے۔ روسی ناول وغیرہ عبرت اور تعلیم کا ذریعہ ہیں، صرف اس عبرت کا نہیں جو ہمارے سامنے دوسروں کی حاققتیں ایک غیبی تنبیہ کی شکل میں پیش کرتی ہے، بلکہ اس عبرت کا جو ہمارے دلوں کو انسانی مہمِ ردی کی جولاں گاہ، محبت اور ایثار کا سرچشمہ بننے کا حوصلہ دلاتی ہے وہ تعلیم کا ذریعہ ہیں مگر اس تعلیم کا نہیں جو ہمیں ”آسائش دو گیتی“ حاصل کرنے کی ترکیبیں سکھاتی ہے، بلکہ اس تعلیم کا جو دل کو خود غرضی اور ذاتی کامیابی کی ذلیل خواہشوں کے پیچھے سے رہا کر کے زندگی اور جذبات کا مرکز بناتی ہے، اس میں اتنی ہمت پیدا کرتی ہے کہ وہ ”روح“ کو نفس پر ترجیح دے سکے اور اپنے سکون اور آسودگی کو ہمیشہ

قربان کرنے پر تیار رہے۔ بہترین (روسی نادلوں کا مقصد زندگی کی صحیح اور سچی تصویر پیش کرنا ہی) جن میں ایک صحیح اور سچا فلسفہ بھی مضمر ہو، جن سے ذہن میں وسعت دل میں درد اخلاق میں محبت اور ہمدردی پیدا ہو۔ اس بلند حوصلے کے ساتھ ناممکن تھا کہ وہ ہر بوالہوس اور زندگی کی مشکلات کا مقابلہ کرنے کے ہر حوصلہ مند خدائی فوجدار کے مذاق کو اپنا معیار بنائیں اور محض لطف اور دلچسپی یا سوسائٹی سے خیالی لڑائیوں کا سامان مہیا کریں۔

روسی ادب میں تشکیل زندگی کی کوششیں بہت نایاب ہیں، لیکن بحیثیت مجموعی ایک فلسفہ زندگی اور فلسفہ کائنات ضرور ہر جو بالکل نالا، بہت معین اور بہت با اثر ہے۔ اگر ہم اسے اپنے یا کسی اور قوم کے معیار سے جانچیں تو ہر طرف مبالغہ، کج طبعی، خود بینی اور جہاں فراموشی کا گمان ہوتا ہے۔ انفرادیت اور اس سے زیادہ ذات کا مشاہدہ اور ذاتی نفسی مسائل میں غرق رہنا ایک خطا معلوم ہوتا ہے جس سے کوئی طبیعت (جو زیر بحث ہو) پاک نظر نہیں آتی۔ لیکن اگر ہم زیادہ غور کریں تو ہمیں یقین ہو جائے گا کہ یہ کوئی دیدہ و دانستہ کج روی نہیں ہے، نہ جدت پسندی جو حد سے اس قدر تجاوز کر گئی ہے کہ مہمل یا ناگوار ہو جائے۔ روسی انسا پردازوں کا نصب العین انسان اور انسان کی ہستی کو کائنات میں ایک نیا درجہ، نئی اہمیت دینا، خالق اور مخلوق میں ایسی آشنائی اور بے جالبی کی رسم قائم کرنا ہے کہ کسی توسط کی حاجت نہ رہے۔ انسان کی موجودہ بے کسی اور روحانی بے مانگی دیکھتے ہوئے یہ تمنا کرنا بہت کا کام ہے۔ اگر روسی انسا پرداز اپنی کوششوں میں کامیاب ہوئے ہوتے تو وہ ”اہل کتاب“ ہونے کا دعویٰ کر سکتے

تھے۔ وہ ناکامیاب رہے، لیکن انسانیت کی تعمیر صرف کامیاب روحانی اور اخلاقی تجربوں پر نہیں ہوتی، غفلت صرف انھیں کا حصہ نہیں اور نہیں ہونا چاہیے جو اپنی تمنائیں پوری کر لیتے ہیں، اس لیے کہ تجربہ ہمیں بتاتا ہے کہ کامیابی تناؤں اور آزمائشوں کو محدود کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔ ہم اگر صرف کامیابی ہی کے قائل ہوں تب بھی اُن حوصلوں کی داد دینا ہمارا فرض ہے جنہوں نے بلند پروازی کا بیڑا اٹھایا اور ناکامیابی یا شکست کی پرواز نہ کی۔

انسان جب کوئی مشکل ارادہ کرے تو اسے چاہیے کہ اپنی قوت اور امکان کا صحیح اندازہ کرے۔ روسی انفرادیت، خودی کا مشاہدہ، ذات سے گہری وابستگی دراصل انسان اور انسانیت کی ایک سخت آزمائش ہے اور اس آزمائش کی کس لوازمات پوری کرنے کے لیے روسی نظر نے اپنی تحلیل میں انسانی ہستی کے کسی پہلو انسانی فطرت کے کسی راز کو نہیں چھوڑا ہے۔ جستجو کے سلسلے میں بہت سی ناگوار باتیں دریافت ہوئیں جن کے اعلان کرنے میں روسی انشا پردازوں نے مطلق تکلف نہیں کیا ہے، بغیر اس کا خیال کیے ہوئے کہ دنیا کیا کہے گی اور کیا سمجھے گی، بہت سے راز فاش کر دیے جنہیں چھپانا ابھی تک ہر جگہ کا معمول تھا۔ ان پوشیدہ رازوں کے معلوم کرنے سے ہم اپنی فطرت کی اندرونی کیفیات بہت بہتر سمجھ سکتے ہیں اور کیرکٹر اور اخلاق اور اعمال کے پیچیدہ معمے بہت آسانی سے حل ہو جاتے ہیں۔ (روسی طبیعت میں جتنا ذوق جستجو سرگرم ہے اسی قدر خامیوں اور خرابیوں کا اعتراف کرنے کی ہمت بلند اور اسی وجہ سے روسی انشا پردازوں کی صاف گوئی پر ہم کو اکثر تعجب ہوتا ہے اور اس سے کبھی کبھی تکلیف

بھی ہوتی ہے۔ کم تکلیف اور معنی و مطلب سمجھنے کی دشواریاں جو اکثر روسی ادب کے مطالعے میں پیش آتی ہیں، ہمیں خوشی سے برداشت کرنا چاہئیں۔ ان کی بنا محض طرز اور اسلوب اور تخیل کی جدت پسندی نہیں، ان سے ہم کو وہ ذہنی تجربہ اور دل کی وسعت حاصل ہوتی ہے جو انسانیت کا طغرائے امتیاز ہے۔ اگر ہم اس نیت سے روسی ادب کا مطالعہ کریں کہ اپنی انسانیت کو فروغ دیں تو اس کی غفلت کا ہم کو صحیح اندازہ ہوگا اور اس کے جوہر پر کھنکھنے کی ہم میں صلاحیت بھی بہت زیادہ ہو جائے گی۔

پہلا باب

ادب العوام

ہر ادب میں دو عنصر ہوتے ہیں، ایک فطری یا طبعی اور دوسرا اکتسابی اور اس کی نشو و نما اس پر منحصر ہوتی ہے کہ یہ دونوں عنصر ایک دوسرے سے کس حد تک ہم آہنگی رکھتے ہیں۔ اکتسابی عنصر وہ ہے جو ہر نئی نسل کو ورثے میں ملتا ہے، جس میں اسلوب اور مذاق کی تمام خوبیاں ہوتی ہیں، لیکن عموماً تصنع اور قواعد کی پابندی اس حد تک پہنچ جاتی ہے کہ سچے جذبات ظاہر کرنے کی گنجائش کم ہو جاتی ہے۔ فطری عنصر قوم یا نسل یا ان دونوں کے رنگ میں رنگے ہوئے انفرادی جذبات ہوتے ہیں، جو اسلوب اور قواعد سے بے نیاز اور تنقید سے بے خون سیدھے دل سے زبان کا راستہ لیتے ہیں۔ انہیں ہم چاہیں تو کائنات کی پوشیدہ قوت سمجھ سکتے ہیں، یا فطرت انسانی کے وہ معے جن کا حل کرنا ہمارے امکان سے بالکل باہر ہے، ادبی لحاظ سے ان کی خصوصیت جوش اور سچائی، سادگی اور صاف گوئی ہوتی ہے جو ان میں کسی قسم کا تصنع اور آوار و بشارل نہیں ہونے دیتی۔ ادبی نشو و نما ان فطری جذبات کا وہ اسلوب مذاق اور معیار قبول کرنا ہے جو تاریخی سلسلے میں ایک نسل کو

دوسری سے ملتے ہیں۔ یورپ میں ادب کا ورثہ یونان سے روما کو ملا اور ان دونوں سے جدید یورپی قوموں کو۔ ایشیا میں بھی اسی طرح ادبی اسلوب، قواعد اور معیار ایک نسل سے دوسری کو ملتے رہے ہیں اور ہر نسل نے اپنی استعداد اور فطرت کے مطابق ان میں ترمیم اور اضافہ کیا ہے۔ مگر کبھی کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ اکتسابی عنصر کی قلم فطری عنصر پر نہیں لگ سکی اور اس کی نشو و نما رنگ گئی یا نہایت محدود اور مصنوعی رہی۔ اس ناکامی کی دو مثالیں ہیں، ہندوستان اور روس۔ ہندوستان میں مسلمان ایران سے ایک ایسے ادب کے اسلوب اور معیار لے کر آئے تھے جو اپنی اصل سرزمین میں مزید نشو و نما کی طاقت نہیں رکھتا تھا اور اس میں تخلیق کی گنجائش پیدا کرنے کے لیے لازم تھا کہ اس کی قلم کسی اور ملک میں کسی اور قوم کے فطری جذبات پر لگائی جائے۔ ہندوستان میں تعصب اور ذہنیت کی تنگی نے اس ادبی کرشمے کو تکمیل سے محروم رکھا، فارسی اور ہندی چند روزہ دوستی کے بعد ایک دوسرے سے جدا ہو گئیں اور جب ہماری اردو زبان رائج ہوئی تو ایسا انحطاط کا زمانہ تھا کہ جذبات کا دیرینہ اور مردہ اسلوب سے آزادی حاصل کرنا یا ان کی رہبری میں اپنی تخلیقی قوت کا ثبوت دینا بالکل ناممکن تھا۔ یہی روس میں بھی ہوا۔ روسی طبعیت نہایت درجہ موجود اور تصورات اور جذبات سے لبریز ہے، یورپ کے زیر اثر ہونے سے بہت پہلے وہاں عوام نے گیتوں، قصے، کہانیوں، پہیلیوں اور داستانوں کا کافی ذخیرہ جمع کر لیا تھا، جس کی بذاتِ خود ممکن ہے کوئی بلند ادبی حیثیت نہ ہو، لیکن مذاق سلیم اس بنیاد پر ایک عظیم الشان ادب تعمیر کر سکتا تھا۔ مگر روس میں فطری اور اکتسابی عنصر جدا رہے، جس کی وجہ سے انفرادیت

بے قابو ہو گئی اور ادب کی نشوونما معینہ اسالیب کے ماتحت نہ ہو سکی۔ افراد کے ذاتی جذبات اور ان کے نرالے انداز کو قوم کے عام نسلی جذبات اور ذہنیت میں تربیت پانا چاہیے تھا، مگر تقلید یورپ کی جو تحریک پیٹر اعظم کے اثر سے شروع ہوئی اس نے تعلیم یافتہ اور مہذب لوگوں کو قومی (اور فطری) ماحول سے نکال کر ایک مصنوعی دنیا میں پہنچا دیا جس میں دکھاوا تو بہت تھا لیکن روح کی تسلی اور جذبات کی تسکین کے لیے کوئی سامان نہ تھا۔ اسلوب اور معیار، چاہے وہ جس قدر بلند ہوں، دراصل مردہ قواعد ہیں، جن میں انسانی جذبات جان پھونکتے ہیں۔ جب پیٹر اعظم کے عہد میں روسی ادب کی بنیاد ڈالی گئی تو ان جذبات کا بہت کم خیال رکھا گیا اور ادب العوام سے ایسی بے تعلقی برتی گئی کہ اس پر فلم لگانا یا اسے نئے ادب کی بنیاد قرار دینا تو درکنار، اسے بالکل صفحہ ہستی سے مٹا دینے کی تدبیریں کی گئیں۔ فرانسیسی ادب کا مطالعہ اور اس کی کامیاب نقل — نئے روسی ادب کی قسمت میں معلوم ہوتا تھا یہی لکھا ہوا اور اس فرضی بد قسمتی کو ایک پُر درد حقیقت بنانے کے لیے روسی عوام کی ادبی جنس کا کوئی خریدار بازار میں نہیں چھوڑا گیا۔ جب خریدار پیدا ہوئے تو یہ جنس بد مذاقی اور بے پرواہی کے صدقے ہو چکی تھی اور عوام میں تخلیقی مادہ بھی باقی نہیں رہا تھا۔ برخلاف اس کے اگر ہم انگلستان یا جرمنی کی ادبی تاریخ کا مطالعہ کریں تو صاف ظاہر ہوتا ہے کہ کب اور کس طرح ان قوموں نے اُن اسالیب کو جو اُنھیں ورثے میں ملے تھے قبول کیا اور اُنھیں قبول کرنے سے اپنی شخصیت نہیں گنوا دی، بلکہ اس کی نشوونما کے لیے ایک نیا راستہ نکالا۔ یورپ میں قرون وسطیٰ

کی تہذیبی زبان لاطینی تھی، لیکن لاطینی ایک غیر اور مردہ زبان تھی اور کسی زندہ قوم کی ادبی زبان بننے کی طاقت نہیں رکھتی تھی، انگلستان اور جرمنی میں اس کی کوشش بھی نہیں کی گئی کہ اُس سے یہ کام لیا جائے۔ انگلستان میں چوسرنے کینٹربری کی کہانیاں لکھ کر اور ٹنڈیل اور ویکلف نے انجیل کا یونانی سے انگریزی میں ترجمہ کر کے انگریزی ادب کا بیج بویا۔ مگر ان سب نے لاطینی کے اسلوب قبول کیے اور اپنی تحریر کو حتی الامکان اُسی کا پابند رکھا۔ جب سولھویں صدی میں یونان اور روم کے دیوتا پھر جاگے اور اُن کے حسن نے یورپ کے دل اور دماغ کو فریفتہ اور محو کر دیا تب تک انگلستان اور جرمنی نے اپنی ادبی شخصیت تعمیر کر لی تھی اور اُن کی اس دور کی بے خودی نے اُن کی خودی کو اور محکم کر دیا۔ انگلستان میں سولھویں صدی کے آخری حصے کا فروغ یونانی ادب کا ایک شوخ اور روشن عکس تھا، جرمنی میں یونان کا اثر اس قدر جلد محسوس نہیں ہوا، لیکن جس وقت سے مارٹن لوتر نے انجیل کا جرمن زبان میں ترجمہ کیا، جرمنی میں ادب کی نشوونما ہونے لگی اور جرمن ادب یونانی تہذیب کا اگر زیر بار احسان ہو تو بھی اُس نے تقلید میں اپنی شخصیت ہرگز نہیں کھوئی۔ یورپ کے ہر ملک میں قومی فطرت کے کاشتکار نے یونانی اسلوب سے کھاد کا کام لیا اور اُس سے اپنی سرزمین کی پیداوار میں گونا گوں اضافہ کیا۔ محض کھاد پر کاشت کرنے کا تجربہ صرف روس میں کیا گیا، اس لیے کہ وہاں کی سرزمین ناقص سمجھی گئی۔ اسی وجہ سے روسی ادب کی نشوونما بے ڈھنگی ہوئی اور وہی دھوپ چھاؤں بارش اور بادل جو دوسرے ملکوں میں زندگی کا سرمایہ ہیں روس

میں ہلک ثابت ہوئے۔

فطری جذبات کی شان یہی ہو کہ وہ اپنی قوت سے ظہور میں آئیں اور مہذب انسان اس طرز کو جس میں اُس کے فطری جذبات شروع شروع میں ظاہر ہوتے ہیں بھونڈا اور اکثر لغو سمجھنے لگتا ہے، لیکن وہ اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ اس طرز میں ایک سادگی اور بے ساختہ پن ہوتا ہے جو تہذیب اور ذہنی نشوونما کے ساتھ غائب ہو جاتا ہے اور اگر وہ کبھی اپنی ذہنیت کو غرور اور تعصب سے پاک کر دیتا ہے تو یہی سادگی اور بے ساختہ پن اس کے جذبات میں وہ بے قزاقی پیدا کر دیتا ہے جو مہذب فنون لطیفہ کے امکان سے باہر ہے ہمیں روسی گیت پڑھ کر لطف نہیں آتا، بلکہ اُس قوم کے تصور کی بے ما لگی پر حیرت ہوتی ہے، لیکن اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ہم روسی ماحول اور سرزمین کے تاثرات سے دور اور بیگانہ ہیں اور عوام کے گیتوں کو ماحول اور سرزمین سے ایک خاص وابستگی ہوتی ہے، جس سے مہذب شاعری بالکل بے نیاز ہے۔ اس کے برعکس اگر ہم روسی قصے سنیں، خصوصاً وہ جن کا مقصد اخلاقی تعلیم ہے تو ہمیں ان میں ایک ایسا گہرا اور سچا فلسفہ نظر آئے گا کہ ہم خود اپنی اخلاقی بے ما لگی اور تہی دستی پر افسوس کریں گے۔ فنون لطیفہ میں عوام کا مذاق ہمارے جی کو نہیں بھاتا، لیکن یہ مذاق بھی قومی شخصیت کا ایک پہلو ہے، اگرچہ وہ اس قدر عالم گیر نہیں ہوتا جیسے ان کی اخلاقی تعلیم یا اُن کا فلسفہ۔

روسی گیت:

شاعری سے پہلے خود مذہب کو اس کا احساس ہوتا ہے کہ مسجد کے

ذیر سایہ خرابات چاہیے“ اور بعد کو چاہے وہ ایک دوسرے سے عداوت ہی کیوں نہ برتیں، فزون لطیفہ کی پرورش شروع میں مذہب ہی کے زیر سایہ ہوتی رہی۔ روسی گیتوں کی بڑی تعداد ایسی ہو جس کی تصنیف کا اصل مقصد مذہبی رسموں کو دھچپ بنانا تھا۔ لیکن یہ ایک خاص دور کی پیداوار ہیں اور اس کے بعد ہی بہت جلد وہ گیت بھی وجود میں آگئے جنہیں مذہب اور رسوم سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ انہیں کو شاعری کی بنیاد سمجھنا چاہیے۔

مذہبی رسموں کے گیت اُس زمانے سے چلے آرہے ہیں جب روسی میں نہیں ہوتے تھے اور جاڑے، گرمی، پالے، جنگل، سورج، چاند وغیرہ کی مختلف ناموں سے پرستش کیا کرتے تھے۔ ایسے مذہبوں میں بھوت پرست، جن، چڑیل اور مہیب فکلوں کے جانور انسان کے تصور پر مسلط ہوتے ہیں، اُس کے عقیدے عبرت انگیز یا ڈراؤنے قصے اور روایات ہوتی ہیں اور مذہب کی شان تہواروں اور رسموں کے ذریعے سے قائم رکھی جاتی رہی۔ کسی زمانے میں روس کے اس فطرت پرست مذہب کے تہواروں کا باقاعدہ سلسلہ تھا اور ہر تہوار کے لیے گانے اور نواح اور داستانیں مخصوص تھیں۔ عیسائی ہونے کے بعد کلیسا اور حکما کی کوششوں سے پُرانے تہواروں اور رسموں کی جگہ عیسائی مذہب کی رسمیں رائج کرائی گئیں اور چونکہ کلیسا اور مذہب نے کامیابی حاصل کرنے کے لیے ہر طرح کی سختی جائز سمجھی، روس کی پُرانی رسمیں اور پُرانے دیوتا ایسے ناپید ہو گئے کہ اب ان کام و نشان بھی نہیں ملتا۔

جہاں تک معلوم ہو سکا ہے پُرانے تہواروں کا سلسلہ جاڑے کے آخری نصف سے شروع ہوتا تھا، جب یہ سمجھا جاتا کہ گرمی اور روشنی (یعنی زندگی) کا دیوتا پیدا ہوتا ہے۔ اس دیوتا کا نام واژ تھا۔ اس کی پیدائش کی خوشی میں قربانیاں کی جاتیں اور عام دعوتیں ہوتیں، جن کے لیے ہر گھر سے سامان جمع کیا جاتا۔ جیسا کہ ایک قدیم گیت سے ظاہر ہوتا ہے، اس موقع پر جنگلوں میں آگ جلائی جاتی اور اس کے چاروں طرف لوگ جمع ہو کر گاتے بجاتے اور گانے بجانے کے بعد جو جانور قربان ہوتے انھیں بھون کر کھا لیتے تھے۔ لوگوں کا یہ عقیدہ تھا کہ جیسے جیسے بہار کا موسم قریب آتا جاتا ہے واژ جوان اور تندرست ہوتا جاتا ہے۔ اس کے بلوغ کی خوش خبری سنانے کے لیے دو تہوار تھے، ایک عیسائی ایسٹر سے کچھ پہلے ایک اس کے کچھ بعد یعنی شروع مارچ اور آخر اپریل میں۔ اس زمانے تک برف پگھل جاتی ہے اور زمین پر سبرے کی لہرتی ہوئی چا دبکھ جاتی ہے۔ دیہات کے لڑکے لڑکیاں اس سبزہ زار پر جمع ہو کر ناچتے تھے اور چونکہ سبزہ دیکھ کر خوش ہونے اور خوشی منانے کے لیے مذہبی احکام کی ضرورت نہیں اس لیے یہ رسم اب تک جاری ہے اور اس کے ساتھ جو قدیم زمانے میں گیت گائے جاتے تھے ان کی بھی ایک کثیر تعداد موجود ہے۔ اُس تہوار کے بعد عین گرمی کے مہینوں میں جو واژ کی قوت اور اس کے اقتدار کے عروج کا زمانہ ہوتا تھا متعدد تہوار تھے۔ چوبیس جون کو واژ کی شادی کا دن تھا۔ مانا یہ جاتا تھا کہ وہ اسی دن موت پر فتح حاصل کرتا ہے اور اسے قریبی سال کا سب سے اہم تہوار سمجھنا چاہیے۔ اس موقع پر

بھی بنگلوں میں آگ جلائی جاتی، لوگ جمع ہوتے، تماشے اور کرتب دکھائے جاتے، لڑکیاں رمالوں سے اپنی تقدیر کا حال پوچھتیں، ناچ گانا ہوتا، شادی بیاہ بھی اسی دن کے لیے اٹھا رکھے جاتے تھے۔ گویا اس روز پورے سال کی خوشی منائی جاتی۔

اُن تہواروں پر جو گیت گائے جاتے تھے اُن میں کوئی خاص خوبی نہیں پائی جاتی۔ دوسری ایشیائی نسلوں کی طرح روسیوں کو بھی وہ دل ملا ہو جو کبھی شاد نہیں ہوتا، اُن کا تصور اپنا کمال صرف غم کے جذبات میں دکھا سکتا ہے۔ اس غم کو جو روسی دیوں پر چھایا رہتا ہے، روسی شاعروں اور ناول نویسوں نے عوام سے بہت بہتر ظاہر کیا ہے، لیکن روسی ادب العوام میں بھی اس کی اچھی مثالیں ملتی ہیں۔

ایک لڑکی جس کا سرال میں جی گھبراتا ہے، یوں شکایت کرتی ہے:

”آہ! اگر برب نہ کرتی، پھول برستے۔“

جاڑوں میں بھی پھول کھلتے!

آہ! اگر میرے دل پر بوجھ نہ ہوتا۔

تو مجھے کوئی دکھ بھی نہ ہوتا۔

میں یوں ٹیک لگائے بیٹھی نہ رہتی،

حسرت سے میدانوں کو تکتی نہ رہتی۔

میں نے باپ سے کہا تھا:

باپ میرے، میرا بیاہ نہ کر۔

جو مجھ سانہ ہو، اُس سے بیاہ نہ کر
دوسرے کی دولت پر نہ جا۔

اوپنچے مکان کو نہ دیکھ۔

مجھے شوہر چاہیے، سو پیہ کیا کروں گی۔

اُجالے دن چاہیں، بڑا مکان کیا کروں گی۔

”یہ پروردگیت دوسروں کے دلوں کے تار بھی پھیر سکتا تھا، خصوصاً عورتوں

کی بہت سی شادیاں مرضی کے خلاف ہوتی ہیں اور ایسے گیت ایک طرح کا
مرہم ہیں جنہیں ہر زخم خوردہ دل تلاش یا ایجاد کرتا ہے۔ عورتیں جنہیں تدبیر یا تقدیر
سے وہی شکایت ہو جو اس گیت کی پہلی گلے والی کو تھی، بے بیاہی لڑکیاں جنہیں
ایسی ہی مصیبت کا اندیشہ ہو، سب اسے گاتی ہوں گی۔ ایسے گیت صدیوں تک
زندہ رہتے ہیں، اُن کی شکل میں چاہے کچھ تبدیلی ہو جائے مگر اُن کی ہستی ہمیشہ
قائم رہتی ہے، اس لیے کہ ایسی عورتیں بھی ہمیشہ ہوتی ہیں جن کا تقدیر سے کوئی باجرا،
دل سے کوئی معاملہ ہوتا ہے اور ایسے گیت سے بہتر نمگسارا انہیں نہیں مل سکتا۔
مصیبت زدہ لوگوں کے علاوہ بہت سے ایسے بھی ہوتے ہیں جو اس طرز کے
گیت سن کر انسانی ہمدردی کی خواہش پوری کرتے ہیں۔ یہی ان سب گیتوں
کی زندگی کا سامان ہے.....

”گزشتہ زمانے میں ہر شخص کو ایسے گیت یاد تھے، ہر ایک انہیں گاتا تھا۔

شادی بیاہ اور موت کے لیے مخصوص گیت تھے اور پیشہ ور گویے جنہیں تمام
ایسے گیت یاد تھے رئیسوں کے یہاں ایسے موقعوں پر بلائے جاتے تھے۔ ان

گوئیوں کا کام صرف کا ناہنیں بلکہ رسمیں بتلانا بھی تھا۔
 ”شادی کے جو زیادہ تر گیت ہیں ان سے اس رسم کی پُرانی حقیقت ظاہر
 ہوتی ہے، جب دو لہا ایک انجان بدلیسی ہوا کرتا تھا، جو دلہن کو زبردستی پکڑ لے
 جاتا تھا اور وہ اپنے باپ اور بھائیوں سے اس سے بچانے کے لیے التجا کرتی
 تھی۔ جیسا کہ ذیل کے گیت سے معلوم ہوتا ہے، فیصلہ اکثر مول تول سے ہوتا تھا:
 ”میرے بابا، میرے چمکتے چاند،

پیاری اماں، میرے روشن آفتاب!
 لکھتیوں کا حساب کیا لگاتے ہو،
 دعوت کا سامان کیا کرتے ہو،
 مجھ غریب کو بیچ کر شراب نہ پیو،

مجھ غریب غمزدہ کو پردیس میں بیاہ نہ دو۔“

گیت، گانے میں روسی تصور اپنے آپ کو مذہب یا اخلاق کا پابند نہیں
 سمجھتا۔ یہ کوئی عجیب بات نہیں، ساری دنیا میں یہی ہوتا ہے۔ لیکن روسی طبیعت
 بات بنانا نہیں جانتی، اور جو آزادی دوسری جگہ لوگ شرمناک مانگتے ہیں اُس کا
 اعلان کرنا دوسری اپنا فرض یا اپنی مجبوری سمجھتا ہے۔ جنسی جذبات کے بیان اور
 جنسی تعلقات کی داستانیں سنانے میں وہ خاص طور پر نفاست سے پرہیز کرتا
 ہے اکثر اس حد تک کہ پڑھنے یا سننے والے کو ناگوار گزرتا ہے۔ روسی
 فطرت کے محرم راز اس کی وجہ یہ بتلاتے ہیں کہ روسی ہنایت درجہ تقدیر پرست
 لے اوسولوفسکی: روسی ادب۔

ہوتا ہے، ہر مصیبت، اپنی ہو یا پرہی، اُسے تقدیر کا ایک کھیل معلوم ہوتی ہے جس پر وہ ماننے زنی یا شکایت نہیں کرتا، اُس لیے کہ تقدیر پر اُسے کوئی قابو نہیں، نہ تقدیر کی مصلحتوں میں دخل۔ یہ بھی کوئی نرالی خاصیت نہیں، لیکن روسی ایسے گناہوں کو جو اُس نے دیدہ و دانستہ کیے ہوں تقدیر کے سرِ عقوبت پر، اس لیے کہ اس کے جذبات نہایت شدید اور قوی ہوتے ہیں اور انہیں قابو میں رکھنے کے لیے جس مضبوط ارادے کی ضرورت ہے اُس سے وہ محروم رکھا گیا ہے۔ جنسی جذبات سب سے زیادہ قوی ہوتے ہیں، اس لیے ایسے گناہوں کے معاف کرنے پر روسی طبیعت آسانی سے آمادہ ہو جاتی ہے، اور ان کا اعتراف کر کے روسی اپنی بے بسی اور مجبور می ثابت کرتے ہیں۔ یہ ذہنیت نہراہ گیتوں کی تصنیف کی ذمہ دار ہے، جن میں روکھی بھکی شہوت کے سوا کچھ نہیں۔

یہ ایک لڑکی کی داستان ہے:

”میری ماں مجھ سے بہت محبت کرتی تھی، مجھے پوچھتی تھی،

کہتی تھی مجھ سے نظر بٹانا دشوار ہے:

لیکن میں اُسکی لڑکی، اندھیری رات کو، خزاں کے موسم میں

ایک بیگانے مرد کے ساتھ بھاگ نکلی،

میں کبھی گھٹنے جنگل میں بھاگی،

کبھی گھٹنے کنج میں،

آسمان کی طرف دیکھا، ٹھنڈی سانس بھری،

اور اپنا پیدائشی گھریا وکیا -
 مجھے گھنے کنج سے کیا مطلب،
 پیدائشی گھر سے کیا واسطہ؟
 جب کبھی گھر کے پاس کا دریا یاد آیا،
 تو دو ایک گرم آنسو بہا دوں گی -
 نہ ہر کچھ زیادہ قیمتی نہیں،
 دو چار پیسے کی چیز ہو -
 مگر لعنت تجھ پر، میری بے رحم زندگی،
 میں تیرا بھی خاتمہ کرتی ہوں، ٹھہر تو!
 میں نے اپنے رقیب سے کہا:
 ”تو بھی نہ ہر کھالے -“

مجھے تو نے اس دنیا سے مار بھگایا،
 تو بھی کمبخت مر جا“
 میرے دوستو، آؤ،

میں اب میز پر لٹائی جاؤں گی لے
 تم میرے اعمال پر رائے زنی نہ کرنا،
 میرے جنازے کو کسی خاموش جگہ دفن کر دینا“

لے رسم یہ ہو کہ جنازہ دفن ہونے سے پہلے لکڑی کے کفن میں میز یا کسی ادنیٰ جگہ پر رکھ دیا
 جاتا ہو، تاکہ عزیز اقارب اُسے آخری بار دیکھ لیں -

روسی گیت پڑھنے کے لیے نہیں تصنیف کیے گئے تھے، ان کے پڑھنے میں کوئی لطف نہیں آتا۔ ان کی تاثیر کا صحیح اندازہ ہم اسی وقت کر سکتے ہیں جب وہ گائے جائیں اور گانے والے خود روسی ہوں۔ روسی عوام، دولگا کے ہر لاک اور وادی دون کے کو سبک انھیں گیتوں کے بے معنی الفاظ کو اپنے ہاں گدا جذبات کا ترجمان بناتے ہیں۔ ان کا لہجہ غم یا خوشی کی وہ داستان سنا تا ہر جو گیت کے الفاظ میں مضمون نہیں معلوم ہوتی۔ عوام کے گیتوں کو دراصل نامکمل سمجھنا چاہیے جب تک وہ ایک خاص ماحول میں ایک خاص ادا سے گائے نہ جائیں۔ الفاظ دل کی ترجمانی شاعری میں کرتے ہیں، گیتوں میں نہیں کر سکتے۔

رزمیہ شاعری اور داستانیں

ادبی نقطہ نظر سے روسی گیتوں کا سب سے دلچسپ حصہ وہ ہے جس میں ”جواں مردوں“ اور ”جواں مردی“ کی داستانیں لکھی ہیں۔ ان میں سے کچھ رزمیہ نظمیں ہیں اور زیادہ تر قدیم زمانے کے تھیں۔ روسی رزمیہ نظموں کی مطلق وہ حیثیت نہیں جو فردوسی کے شاہنامے یا ہومر کے ایلید یا اوڈیسی کی ہے۔ ان کے ہیرو پورے انسان بھی نہیں، سوا ایک ایلیا سورومٹز کے، جس میں رسم کی کچھ جھلک سی نظر آتی ہے اور ان کے کارنامے بھی کچھ بے تکیے سے ہیں۔ کسی کی تعریف یہ ہے کہ وہ چڑیوں کی طرح بول لیتا ہے، کوئی ایک قدم میں تیس میل طوکڑ لیتا ہے۔ کوئی اس قدر وزنی ہے کہ ہر قدم پر اس کا آدھا دھڑ زمین میں دھنس جاتا ہے۔ ان حضرات کے نہ دل پر نہ دماغ، محض طاقت اور وزن ہے اور انھیں بھی وہ

لہ روسی دریا۔ ہر لاک وہ مزدور ہے جو اس دریا پر کشتیاں کھینچتا یا گھسیٹتا ہے۔

استعمال کرنا نہیں جانتے۔ نمونے کے طور پر ایامور و مٹز کی سوانح عمری کا ایک حصہ پیش کیا جاتا ہے۔

ایلامور و مٹز اپنے گھر کے دروازے پر بیٹھا تھا۔ اسے بیٹھے بیٹھے تیس برس ہو گئے تھے۔ اُس کے سر کے بال خاصا جنگل بن گئے تھے، جس میں چرند پرند آباد تھے، اس کے ہاتھ پر پتھر کے ستون تھے، جن میں جنبش کی طاقت باقی نہیں رہی تھی۔ ایک روز حضرت عیسیٰ اپنے ایک چیلے کے ساتھ بھیس بدلے ہوئے اُس کے گھر کے سامنے سے گزرے اور اُس سے پینے کو پانی مانگا۔ ایلامور و مٹز نے معذرت کی اور کہا کہ میں چلنا پھرنا بھول گیا ہوں۔ یہ سن کر حضرت عیسیٰ نے کچھ پڑھ کر اُس پر پھونک دیا اور اُس کے اعصاب میں جنبش کی قوت آگئی۔ اُس نے اُٹھ کر مسافروں کو پانی پلایا اور وہ اُسے دعا دے کر چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد مور و مٹز کو ایسی شدید پیاس لگی کہ وہ تیس گھڑے پانی پی گیا، اور ایسی بھوک لگی کہ وہ بھیڑیوں کے ایک پورے گلے کو بھون کر کھا گیا۔ کھانے پینے کے بعد اس کے جسم میں جوان مردوں کی سی طاقت آگئی اور جوان مردوں کے حوصلے پورے کرنے کے لیے اس نے سیر و سیاحت پر کمرباندھی اور پردیس جلنے کے لیے اپنے باپ کے پاس اجازت لینے گیا۔ رزمینظم اس موقع کا ذکر اپنے نرے انداز میں یوں کرتی ہے:

”ہوا کے جھونکوں نے سر بھاگ شاہ یلوط کو زمین تک نہیں جھکا

دیا ہی، پہاڑوں میں موسلا دھار بارش نہیں ہو رہی ہی۔ الیا

مور و مٹز اپنے باپ کے سامنے سر جھکائے کھڑا ہی اور اس کی آنکھوں

سے آنسو جاری ہیں۔

باپ سے رخصت ہو کر الیا مور و مٹر شہر کیف کی طرف روانہ ہوا، جہاں اس نے سنا تھا کہ شاہ دلاجیر رونق افزونہ ہے۔ رستے میں اُسے ایک جگہ خبر ملی کہ ایک دیونے جس کا نام سولو ویتی (یعنی بلبل) ہے، ساری مخلوق کو پریشان کر رکھا ہے، نہ آدمی اُس سے محفوظ ہیں نہ چرند و پرند۔ مور و مٹر اُس کے مقابلے کو گیا اور لڑائی کے بعد اُسے فید کر کے دلاجیر کے دربار میں بطور تحفے کے لے گیا۔ وہاں ایک مباحثے کے بعد جس میں مور و مٹر نے اپنی چالاکی کا ویسا ہی ثبوت دیا جیسے میدان میں اپنے زور بازو کا دیا تھا، اُس نے بادشاہ کے حکم سے دیو کو قتل کر دیا۔ اس کے بعد مور و مٹر نے میدان کا رزار میں اپنی ہمت اور دلیری سے بہت شہرت حاصل کی، یہاں تک کہ وہ بادشاہ ٹھہکا خاص مشیر اور سپہ سالار بن گیا۔

چونکہ رزمیہ نظمیں بڑے عرصے تک ضبط تحریر میں نہیں آئیں اور پیشہ ور گوئیوں کے حافظے کے سوا اُن کی بقا کا اور کوئی ذریعہ نہ تھا، اس لیے اُن میں بہت تبدیلیاں ہوتی رہیں اور شاعرانہ مذاق کے گویے اُن میں اپنی طرف سے دوسری رزمیہ چونکہ تمام دیہات کی تصنیف ہے اس لیے اُس کے بیان میں رنگا رنگی نہیں میدان ہر جگہ "صاف" میدان ہے، زمین ہمیشہ "کھلی دھرتی مانا" تشبیہ کا بھی یہی ایک انوکھا طریقہ ہے جس کی مثال ادپردی گئی ہے۔

۱۱۱۲ء دلاجیر مونوناخ (۱۱۱۲ - ۱۱۲۵) کا دربار اسی طرح جوں مردوں کا مرجع مانا گیا ہے جیسے آرتھر کا انگلستان میں اور شارلین کا یورپ میں۔

سے کچھ نہ کچھ اضافہ کرتے رہے۔ کہیں کہیں تو ایسی ترمیمیں کی گئی ہیں کہ ساری روسی رزمیہ شاعری کے مستند ہونے میں شک پیدا ہو جاتا ہے۔ مثلاً ایک جگہ موردِ شتر و شمن کی فوج کو دیکھنے کے لیے ”جرمن نال“ یعنی دورِ بین استعمال کرتا ہے۔ یہ ترمیم ۱۹۷۷ء کے بہت بعد کی معلوم ہوتی ہے۔

رزمیہ کے علاوہ جواں مردوں کی جو داستانیں ہیں وہ ادبی اور تاریخی لحاظ سے بہت زیادہ دلچسپ اور قابلِ توجہ ہیں۔ ان کی تصنیف کا زمانہ زیادہ تر زارِ اداں چہارم کا عہد یعنی سولہویں صدی کا وسط ہے اور ان کا تعلق رزمیہ نظموں کی طرح فرضی شخصیتوں سے نہیں۔ روس میں زارِ اداں کے عہد تک کامل نراج رہا، ہر شخص کو اپنی جان و مال کی حفاظت خود کرنا ہوتی تھی اور اس کے مال اور جان کے درپے بھی بہت سے رہزن، قزاق اور لٹیرے ہوا کرتے تھے۔ زارِ اداں نے تخت پر بیٹھے ہی تمام مفردوں کو چُن چُن کر مارنا شروع کیا، مگر آخر عمر میں خود ایسا ظالم بن گیا کہ قزاق اور رہزن اس کے مقابلے میں خلقِ خدا کے خیر خواہ نظر آنے لگے۔ جواں مردی کی داستانوں کے لیے اس سے بہتر نضا تصور کرنا مشکل ہے۔ لیکن اداں کے ظلم نے قوم میں ایک ہیبت ناک مایوسی اور سرد مہری پیدا کر دی۔ اس زمانے کے قصوں میں اچھے اور بُرے ظالم اور مظلوم میں کوئی امتیاز نہیں کیا جاتا۔ جواں مرد وہ ہے جو جواں مردی دکھائے، ارادہ اس کا چاہے جو کچھ ہو، اس لیے کہ نیت اور ارادے کی پروا نہ زارِ اداں نے کبھی کی، نہ تقدیر کرتی ہے۔ ایک چوراہی زندگی کا انجام یوں تصور کرتا ہے :

”اے ہرے بھرے کتے، شور نہ مچا،
 مجھ جواں مرد کے سوچ بچار میں دخل نہ دے۔
 کل مجھے اپنے خوف ناک منصف کا سامنا کرنا ہی،
 اپنے خوف ناک منصف، خود زار کا۔
 مجھ سے میرا آقا، روس کا زار پوچھے گا:
 ”تو بتا، بتا مجھے اے کسان کے بیٹے،
 تو نے کس کے ساتھ مل کر چوری کی، کس کے ساتھ مال تقسیم کیا؟“
 ”میں کہتا ہوں تجھ سے، سچے مذہب کے والے بادشاہ،
 تجھے ٹھیک ٹھیک سچی بات بتاتا ہوں:
 میرے چار ساتھی تھے۔
 پہلا ساتھی اندھیری رات تھی،
 دوسرا ساتھی میرا تیز گھوڑا،
 تیسرا میرا آبدار چاقو،
 چوتھا میری کڑی کمان۔
 میرے سفیر میرے بجھے ہوئے تیر تھے“

کیا جواب دے گا میرا سچے دین والا بادشاہ؟

لے زار روس کا خطاب ”دین برحق کا“ یا ”سچے دین والا بادشاہ“ ہے۔ عیسائی مذہب کی جو شکل روس میں رائج ہے اسے ”مصحح سلاف“ کہتے ہیں۔ یہ مشرقی بازنطینی کلیسا کی ایک شاخ ہے۔

”میں نے مانا اسی کسان کے بیٹے،
 تو چوری کرنا جانتا ہی اور جواب دینا بھی۔
 میں تیرے لیے تجویز کرتا ہوں۔ اے کسان کے بیٹے،
 بیچ میدان میں ایک چبوترہ،
 اور اُس پر تین بتلیاں، دو کھڑی ایک پڑی“
 ”سستینکار ازن اور ایرانی شہزادی“ کی داستان جواں مردی کے ایک اور
 پہلو پر روشنی ڈالتی ہے:

جزیرے کی آڑ میں، موجوں کے میدان میں
 رنگ برنگی تیز کشتیاں تیر رہی ہیں۔
 سب سے اگلی پرستینکار ازن
 شہزادی کو بغل میں لیے بیٹھا ہے۔
 اُس کی نئی نئی شادی ہوئی ہے،
 جس کی خوشی میں وہ مغرور ہے۔
 دلدلوں کے پیچھے سے بڑبڑانے کی آواز آ رہی ہے وہ
 ہمیں ایک عورت کے بدے چھوڑ دیا ہے،
 شادی کی ایک رات گزری مہنیں،
 سویرے خود زنا نہ ہو بیٹھا۔

بڑا ہٹ اور فقرے خوفناک اتمانؑ نے سنے،
 اور وہ شہزادی کو بغل میں دبائے تھا۔
 سیاہ بھنوں نے سمٹ کر طوفان کی خبر دی۔
 قزاق آنکھوں میں خون بھر آیا :
 ”میں سب کچھ سچ دوں گا۔
 اپنا سرتک نثار کر دوں گا“
 قزاق کی بھاری آواز سے وادی گوبخنے لگی۔
 شہزادی نگاہیں نیچی کیے ،
 بسمل، نیجان، اتمان کی مست باتیں سن رہی تھی۔
 دولگا، دولگا، دولگا مائی
 دولگا روس کی مایہ ناز۔
 تجھے کبھی کسی دولگے کو سک نے۔
 کوئی ایسا تحفہ نہ دیا ہو گا۔
 تاکہ جواں مردوں میں فساد نہ پھیلے،
 آپس میں بیر نہ ہو،
 دولگا، دولگا، دولگا مائی

لے سردار۔

لے روس کا دریا۔

لے روس کا دریا جس کی وادی میں کو سک نسل آباد ہے۔

تو ہی اُس حسینہ کو قبول کر لے۔

اتمان نے جوش میں آ کر

حسین شہزادی کو موجوں کے حوالے کر دیا۔

اے شیطانو، تم نے کیا صورتیں بنائیں؟

فیلکا مسخرے، تو ناچا کیوں نہیں؟

آؤ بھائیو، اُس حسینہ کی یاد میں

ایک اچھا سا گیت گائیں۔

جزیرے کی آڑ میں، موجوں کے میدان میں۔

ستینکا رازن کی رنگ برنگی کشتیاں،

تیر رہی ہیں، کھیل رہی ہیں۔

یہ اُن جواں مردوں کی داستانیں ہیں جو بادشاہ اور شاہی نظام کے

دشمن تھے۔ خود بادشاہ کے انصاف کی داستان اور بھی دردناک ہے۔

دوموسکو والوں کی سازشوں سے بیزار ہو کر سخت گیر اداں نے شہر کے

باہر محل بنوایا اور جب معصوم خون بہانے سے طبیعت سیر ہو جاتی تو وہ اپنے منظم

کی یاد شراب خواری اور عیش و طرب کی مجلسوں میں بھلاتا تھا۔ اُن قتل و خون آؤ

بدستی کے دنوں میں امیر اور غریب اپنی عزت اور جان کے لیے لرزتے تھے۔ صرت

اداں کا مسخرہ اپنے رنگ برنگی پیوندوں کا کفتان پہنے ہوئے اس کی جرات

لے ایک نام ہے۔

تہ کفتان یا خفتان، ایک قسم کی عباتھی جو اچکن سے بہت مشابہ تھی۔

کر سکتا تھا کہ بادشاہ سے مذاق کرے اور کبھی کبھی اداں اپنی ظالمانہ حرکتوں پر نادم ہو کر سچی بات سننا گوارا کر لیتا تھا، بشرطیکہ وہ کسی دل لگی کے پیرائے میں ہو۔ ایک مرتبہ نازا اداں اپنا گروہ دار عصابا تھد میں لیے ہوئے باسمنوف^۱ اور ملیوٹا کے ہمراہ مجلس میں آیا۔ ساری رات تعذیب خانے میں جلاوکی تلوار خون آسٹام بہی تھی۔ نازا اداں، ابھی تک تھکا مانڈا پیلا اور بد مزاج غور و نوش کے کمرے میں اپنی میز پر آکر بیٹھا۔ ہر طرف سے خوش پوشناک ملازم طرح طرح کی شرابیں لا کر اس کے سامنے رکھ رہے تھے۔ مسخرہ اپنی سفید چادر پر اس کے پیروں کے پاس لیٹا تھا۔

”ارے نازا اداں“ مسخرے نے بادشاہ سے کہا ”ذرا ایک پیالے میں خوب بھر کر شرب تو پلا!“ ”جائے احمق“ نازا نے جواب دیا اور میز پر ایک سنہرا قدح الٹ دیا۔ شراب کی موج میز پر سے بہ کر مسخرے کے کفنان اور چادر پر بکھر گئی۔ درباری سب خوف سے کانپ گئے مگر کفنان سے شرب کے قطرے جھاڑتے ہوئے مسخرے نے کہا۔

✓ ”قیمتی شراب کے دریا کیوں بہا تا ہی..... کیا یہ بھی بے گناہوں کا

خون ہے؟“

درباریوں میں ہل چل مچ گئی، ایک دوسرے کی آڑ لینے لگے۔ اداں کا عدا

تیر کی طرح نہناتا ہوا اڑا اور مسخرے کے حلق کے پار ہو گیا۔“

کہانیاں اور قصے:

کہانیاں اور قصوں میں روسی فطرت ایک اور ہی انداز میں نظر آتی ہے۔ ان کے

لے نازا اداں کے دو شیر جو بڑی حد تک اس کی خونریزیوں کے ذمہ دار تھے۔

یا تو محض مذاق مقصود ہوتا ہے یا اخلاقی تعلیم، مگر نہ تو ان کے مذاق میں وہ بھونڈا ہے
 ہونہ وہ خوشخواری جو اکثر مذاق گیتوں میں ملتی ہے، اور نہ ان کی اخلاقی تعلیم میں اُس
 سرد مہری، حزن، ایسے رنجی اور پستی کی کوئی جھلک ہے جو اچھے روسی گیتوں تک کو تلخ
 نہیں تو بد مزہ ضرور کر دیتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ گیتوں پر مذہب کا اثر نہیں پڑا،
 اور قصہ کہانیاں روسی تصور کی گہری اور سچی مذہبیت کی گل کاریاں ہیں۔
 قصے کہانیوں کا سلسلہ بھی زمانہ جاہلیت سے شروع ہوتا ہے، جب ہوا،
 سورج، پالا وغیرہ زندہ ہستیاں سمجھی جاتی تھیں اور انسان کا ذکر اگر کیا بھی جاتا
 تو محض اُس کی اپنی سبکی اور اُس کے دیوتاؤں کی قدرت دکھانے کے لیے۔ ایک
 مختصر سا قصہ بطور نمونے کے بیان کیا جاتا ہے۔

سورج، پالے اور ہوا میں بحث ہو رہی تھی۔ سورج نے کہا: ”میں قادر مطلق
 ہوں“ پالے نے کہا: ”نہیں میں ہوں“ ہوا بولی: ”تم دعوے چاہے جتنے بڑھ بڑھ کر
 کرو، میری مدد بغیر تم کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ دیکھو یہ کسان جا رہا ہے، اگر تم میں اس کی
 قدرت ہو تو اُس سے اُس کا موٹا لبادہ اتر داناؤ۔ میں کوشش کروں گی کہ وہ
 اُسے پہنے رہے“ سب اس امتحان پر راضی ہو گئے۔ سورج خوب زور سے چمکا،
 زمین پر آگ برسنے لگی۔ بچا رہے کسان نے ادھر ادھر گھبرا کر دیکھا اور لبادے
 کے ٹن کھولے ہی تھے کہ منہ پر ٹھنڈی ہوا کا جھونکا اگا اور جیسے گرمی بڑھی ویسے
 ہی ہوا ٹھنڈی ہوتی رہی۔ کسان کو بڑی حیرت ہوئی کہ اس قدر گرمی میں ہوا ایسی
 ٹھنڈی کیسی اور اس اندیشے میں کہ کہیں اُسے جاڑا نہ لگ جائے اُس نے اپنا
 لبادہ نہیں اتارا۔ سورج کی فاش شکست دیکھ کر پالے کو بہت غصہ آیا۔

اُس نے تاؤ میں آکر کہا: ”اس بیچارے کسان کی ہستی کیا ہے۔ میں ابھی اس ہاتھ پیرالیے ٹھنڈے دوں گا کہ یہ ایک قدم آگے نہ بڑھ سکے گا۔“ کسان پر پھر آفت آئی۔ پالے کے تیرا لیے تھے کہ اگر ہوانے کسان کی مدد نہ کی ہوتی تو اُس کے ہاتھ پیر سردی سے نیلے پڑ جاتے اور وہ وہیں کا وہیں جم کر مر گیا ہوتا۔ لیکن پالا اپنی طاقت دکھانے ہی والا تھا کہ ہوا کے تیز جھونکے چلنے لگے۔ ہوا تیز چل رہی ہو تو سردی ضرور ہو جاتی ہے، لیکن پالا نہیں پڑ سکتا۔ پالا اسی انتظار میں رہا کہ ہوا اُس کے تواپنا زور دکھاؤں۔ بھلا ہوا کب رکنے والی تھی۔ جھونکے پر جھونکا آتا رہا، اور آخر پالے کو بھی ہاری ماننا پڑی۔ بیچارہ کسان خیریت سے گھر پہنچ گیا۔

(زمانہ جاہلیت ہی سے وہ کہانیاں بھی تصنیف ہونے لگیں جن کے فقہانوں جانور ہیں۔ یہ قصے زیادہ تر مذاقیہ ہیں، اور ان میں عموماً لومڑی جیسے چالاک جانور دوسروں کو بیوقوف بناتے ہیں۔) کبھی کبھی آدمی کا فرق دکھانے کے لیے نود قہم اور دور اندیش روسی کا کندھن اور احمق تاتاری سے بھی مقابلہ کر دیا جاتا ہے۔ ایک لومڑی کا قصہ سنئے، جس نے ایک بوڑھے آدمی اور ایک بھیڑیے کو چکادیا۔)

”بہت دن ہوئے ایک تھا بڈھا اور ایک تھی اُس کی بڑھیا۔ بڈھے نے بڑھیا سے کہا: بڑھیا تو سوسے پکا، میں گاڑی جوتا ہوں، جا کر مچھلی پکڑ لاؤں گا۔ اُس نے دریا پر جا کر بہت سی مچھلیاں پکڑیں، اتنی کہ پورا ڈھیر لگ گیا، اور تب واپس چلا۔ راستے میں اس نے دیکھا کہ ایک لومڑی گیند

کی طرح لپٹی پڑی ہے۔ بڑھا گاڑی پر سے اُترا اور لومڑی کے پاس گیا وہ ذرا بھی نہیں ہلی، ایسی پڑی رہی گویا بالکل مر گئی ہے۔ بڑھے نے سوچا کہ اس کی کھال بڑھیا کے کام آئے گی۔ لومڑی کو اٹھا کر گاڑی پر رکھ لیا اور خود آگے آگے چلنے لگا۔ لومڑی یہ دیکھ کر اٹھی اور ایک ایک کر کے مچھلیاں گاڑی میں سے گرانے لگی۔ اسی طرح سب مچھلیاں نیچے پھینک دیں اور پھر خود کو دگر بھاگ گئی۔

بڑھا گھر پہنچا اور جلدی سے بڑھیا کو خوش خبری سنانے گیا: ”بڑھیا، بڑھیا دیکھ میں تیرے بادلے کے لیے کیا گلوبند لایا ہوں“

”کہاں ہے“ بڑھیا نے پوچھا۔

”گاڑی پر۔ گلوبند بھی اور مچھلیاں بھی“

بڑھیا لپک کر دیکھنے لگی۔ وہاں نہ مچھلیاں تھیں نہ گلوبند وہ بڑھے کو

گالیاں دینے لگی: ”ارے نگوڑے تو بڑھاپے میں بھی ایسی چالیں چلتا ہے“

بڑھے کو کبھی دھوکا دینے کا خیال بھی نہ تھا۔ اُسے تو لومڑی نے بیوقوف بنایا تھا۔

لومڑی نے سب مچھلیاں اکٹھا کیں اور المیناں سے کھانے بیٹھی۔ اتنے

میں ایک بھورا بھیڑیا پہنچا۔

”بوا سلام“

”جیتے رہو بھیا“

”بوا اکیلی اکیلی کیا کھا رہی ہو، ہم کو بھی مچھلیاں دو!“

”مہ میں کیوں دوں؟ تم آپ پکڑ لاؤ اور کھاؤ۔“

”میں کیسے پکڑوں“

”جیسے میں نے پکڑیں۔ بہت آسان ترکیب ہے۔ دریا میں دُم لٹکا دو اور چلاؤ: آجاؤ مچھلیو، آجاؤ، چھوٹی مچھلیو، بڑی مچھلیو، آجاؤ۔ مچھلیاں خود آکر تمہاری دُم سے چمٹ جائیں گی۔ مگر دیکھو، دیر تک بیٹھنا، نہیں تو ایک بھی نہ ملے گی“ بھیرے نے جا کر پانی میں دُم لٹکا دی اور جیسے بومڑی نے سکھایا تھا ویسے ہی چلاتا رہا، تھوڑی دیر میں ساری مچھلیاں ہضم کر کے بومڑی خود بھی آئی بھیرے کے ارد گرد گھومنے لگی اور منتر کی طرح یہ چنے لگی: آسان صاف ہو جا لے بھیرے کی دُم ٹھٹھر جا، بھیرے نے پوچھا: بوا، کیا کر رہی ہو؟ بومڑی نے ہنایت مشفقانہ لہجے میں جواب دیا: ”تیرے لیے دعا کر رہی ہوں“

رات کو پالا پڑا، غضب کی سردی تھی، مگر بھیرے یا تمام رات پانی میں دُم لٹکائے بیٹھا رہا اور آخر کار اُس کی دُم بالکل ٹھٹھر گئی۔ ایک دو بار اُس کا جی چاہا کہ دُم نکال کر دیکھے کہ اُس میں کتنی مچھلیاں چبٹی ہیں، اور اُس نے دُم کو ذرا سا جھٹکا دیا۔ مگر جب دُم پانی سے نہیں نکلی تو اُس نے سوچا: افوہ، اتنی مچھلیاں آکر چبٹی ہیں کہ دُم نکالے نہیں نکلتی!۔ ایسے ہی بیٹھے بیٹھے سویرا ہو گیا۔ گانؤ سے عورتیں پانی بھرنے آئیں اور بھیرے کو دیکھ کر چلانے لگیں: ”بھیرے، بھیرے، مارو، مارو۔ بہت سے آدمی اُن کی آواز سن کر لٹھیلے دوڑے ہوئے آئے اور بھیرے کو دے لائیں دے ڈنڈا خوب پٹیا۔ پہلے تو بھیرے یا مچھلیوں کے لالچ میں پٹتا رہا، پھر ایک بار جو در لگا کر بھاگا تو اُس کی دُم ٹوٹ کر دریا میں رہ گئی یہ

لے ہرنگ کرنے کے بعد آسان کا صاف ہو جانا پالا پڑنے کی خاص نشانی ہے۔

لے ادمو لوفسکی: روس ادب۔

روسی ادب العوام کے روحانی قصوں کا باب بہت لمبا ہے۔ ان میں اخلاق اور مذہب کی اصلیت عجیب پیاری پیاری ترکیبوں سے دکھائی گئی ہے، جن سے صرف یہی نہیں ثابت ہوتا کہ روسی عوام نے اپنے دین کو خلوص سے قبول کیا ہے، بلکہ یہ بھی کہ مذہب عیسوی اپنی اصل صورت میں روسی کے دل کے باہر کہیں اور ملتا ہی نہیں۔ قصے کہانیاں یورپ کے ہر ملک میں، ہر قوم نے تصنیف کی ہیں مگر دین عیسوی کہیں اور اس شان سے نہیں نظر آتا۔

((ہر روسی مصنف نے اپنا فرض سمجھا ہے کہ عوام کی جو اخلاقی کہانیاں اُس کے سننے میں آئیں، انہیں ضبط تحریر میں لانے۔ اس سے یہ فائدہ تو ضرور ہوا کہ بہت سی کہانیاں جنہیں ممکن ہو لوگ سنا سنا کر بھول جاتے، اس وقت تک موجود ہیں، مگر اتنا نقصان بھی ہوا کہ اب ہم ان کے اصل پیرایے میں نہیں دیکھ سکتے اور وہ سادگی جو ان کی خاص صفت ہے، اس ادبی لباس میں نظر سے چھپ جاتی ہے۔ ذیل میں دو قصے مختصر کر کے بیان کیے جاتے ہیں، جنہیں تاتاری نے ادبی جام پہنایا ہے، ان سے اس قسم کے قصوں کے اوصاف واضح ہو جائیں گے پہلا قصہ ایک ”احمق“ کا ہے جو فطرتاً مذہب عیسوی کا پیرو ہے اور اپنی ”حماقت“ کی کامیابی سے اپنے مذہبی اصولوں کی سچائی ثابت کرتا ہے۔

احمقِ اِوان

ایک خوش حال کسان کے تین لڑکے تھے، یم یون، جو فوج میں نوکرتھا، تراس، جس نے تجارت شروع کی تھی اور اِوان، جو گھر پر کھیتی کرتا تھا اور اپنی سادہ دلی کی وجہ سے احمق کہلاتا تھا۔ ان کے علاوہ اُس کی ایک لڑکی مارتھا

بھی تھی، جو پیدائش سے گونگی اور بہری تھی۔ سب سے بڑے بیٹے نے ایک امیر کی لڑکی سے شادی کی، جو اس قدر فضیل خیر تھی کہ شوہر کی گزراوقات قرضے پر ہونے لگی۔ دوسرے نے ایک تاجر کی لڑکی سے نکاح کیا۔ اس کی مالی حالت بڑے بھائی سے تو اچھی تھی، لیکن لالچ کی وجہ سے اُسے اپنی دولت کم نظر آتی تھی یکے بعد دیگرے دونوں بھائی باپ کے پاس پہنچے اور جائیداد کا بٹوارا کرنا چاہا۔ باپ نے انکار کر دیا:

”تم جائیداد پر محنت تو کرتے نہیں، تمہیں حصہ کیوں ملے؟ تم کو حصہ دینا اِوانِ ادماس کی بہن کے حق میں نا انصافی ہوگی“

لڑکوں نے کہا: ”اِوانِ امتن ہی، مارکھا بوڑھی، یہ دونوں جائیداد لے کر کیا کریں گے؟“

باپ نے جب اِوان سے پوچھا کہ بھائیوں کو جائیداد دی جائے یا نہیں، تو اِوان نے ہنس کر کہا: ”اُن کا جو جی چاہے لے جائیں۔ میں محنت کر کے اُسے پھر حاصل کروں گا“ بھائیوں نے اپنے حصے بیچ ڈالے اور ردیہ لے کر اپنے کاموں پر واپس چل دیے۔

شیطان مکار کو اس سمجھوتے پر بہت غصہ آیا۔ وہ چاہتا تھا کہ تینوں میں لڑائی ہو۔ اس لیے اس نے تین چھوٹے شیطان بلائے اور اُن سے کہا: دیکھو یہ تین بھائی ہیں، انہیں آپس میں لڑنا چاہیے تھا، مگر اس امتن اِوان نے سارا معاملہ بگاڑ دیا۔ تم جاؤ اور ان تینوں میں فساد ڈالو اور دیکھو اس امتن کا خاص خیال رکھنا۔ یہ کم محنت ایسا محنتی ہو کہ دونوں بڑے بھائیوں کو کھلاتا پلاتا رہے گا۔“

تینوں شیطان بچے اپنے اپنے کام پر روانہ ہوئے۔ پہلے نے سم یون کو ایسا مغرور بنا دیا کہ اس نے اپنے بادشاہ کے لیے ساری دنیا فتح کرنے کا دعوے کیا اور جب وہ فوج لے کر لڑنے گیا تو شیطان بچے نے فوج کی ساری بارود گیلی کر دی اور سم یون کو میدان جنگ سے بھاگنا پڑا۔ بادشاہ بہت خفا ہوا۔ وہ چاہتا تھا کہ سم یون کا سر قلم کرادے، مگر سم یون قید خانے سے نکل بھاگا اور باپ کے گھر کا رُخ کیا۔ دوسرے شیطان نے تراس کے دل میں ایسی ہوس پیدا کر دی کہ وہ ہر چیز خریدنا چاہتا تھا، یہاں تک کہ اُس پر ڈھیروں قرض چڑھ گیا اور وہ اپنے قرض داروں سے بچنے کے لیے گھر بھاگ گیا۔ جس شیطان بچے نے اِوان کو ورغلانا اپنے ذمے لیا تھا وہ بہت ناکامیاب رہا۔ پہلے تو اُس نے اِوان کے کٹورے میں تھوک دیا اور اِوان نے جب پانی پیا تو اُس کے پیٹ میں بہت سخت درد اُٹھا۔ لیکن اس کے باوجود وہ اپنے کام پر گیا اور کھیت میں ہل چلانے لگا۔ شیطان بچے اُس کی مستعدی دیکھ کر بہت حیران ہوا اور اُس کو کام سے بیزار کرنے کے لیے وہ زمین میں گھس گیا اور نیچے سے ہل پکڑ لیا لیکن اِوان نے ایسا زور لگایا کہ یہ ترکیب نہ چلی اور ہل کی تیز دھار سے شیطان بچے کے ہاتھ زخمی ہو گئے۔ شیطان بچے نے عاجز آکر ہل کو دونوں ہاتھ پیر سے پکڑ لیا۔ اِوان سمجھا کہ ہل کسی جڑ میں پھنس گیا ہو اور اُس نے اپنا ہاتھ زمین میں گھسا دیا کہ اُسے کھینچ کر نکالے۔ لیکن جڑ کی جگہ اس کے ہاتھ میں ایک نرم نرم سی چیز تھی۔ اُسے اِوان نے باہر نکالا تو دیکھا کہ جڑ نہیں، شیطان بچے ہاتھ میں ہے، وہ بالکل کالا، چھبکی کا سا تھا۔

ادان کو اُس سے دیکھ کر بہت گھن آئی اور وہ چاہتا تھا کہ اُسے کسی پتھر پر
 پٹک کر مار ڈالے۔ مگر شیطان بچے نے چلا کر کہا: ”مجھے مار دہنیں مجھے چھوڑ دو، تم جو
 کچھ کہو میں کروں گا“ اِوان نے پوچھا: ”تو پیٹ کا درد اچھا کر سکتا ہو؟“ شیطان
 بچے نے اُسے اچھا کر دینے کا وعدہ کیا تو اِوان نے اُسے چھوڑ دیا، اور اُس نے
 وہیں زمین میں سے اِوان کو تین بتلی جڑیں نکال کر دیں اور کہا: ”جو انھیں
 کھائے گا وہ ہر بیماری سے اچھا ہو جائے گا“ اِوان نے ایک جڑ کھائی اور اس کا
 درد فوراً رفع ہو گیا۔ شیطان بچے نے پھر کہا: ”مجھے جانے دو، میں زمین میں دھنس
 جاؤں گا اور تمہیں پھر کبھی نہ پریشان کروں گا“ اِوان نے کہا: ”اچھا جاؤ خدا
 حافظ، مگر خدا کا نام سننے ہی شیطان بچہ زمین میں اسی طرح غائب ہو گیا، جیسے پتھر
 پانی میں، صرف ایک سوراخ دکھائی دیا۔

سارے کھیت میں ہل چلا کر اِوان شام کو گھر واپس آیا تو اُسے وہاں اُس کا
 سب سے بڑا بھائی سیم یون ملا۔ اُس نے اپنی پوری داستان سنائی اور کہا:
 ”اب میں نہیں رہنا چاہتا ہوں“ اِوان نے کہا: ”اچھا خوشی سے رہو“ لیکن رات
 کو جب سب کھانے پر بیٹھے تو سیم یون کی بیوی نے کہا: ”میں ایک میلے کچیلے کسان
 کے ساتھ کھانا نہیں کھا سکتی“ سیم یون نے اِوان سے کہا: ”میری بیوی تمہارے
 ساتھ کھانا نہیں کھا سکتی۔ تم باہر جا کر کھا لو“ اِوان نے کہا: ”بہت اچھا،
 اور اپنا کوٹ لے کر باہر چلا گیا۔

دوسرے دن دوسرا شیطان بچہ جس کے سپرد سیم یون کی بربادی ہوئی
 تھی، اپنے ساتھی کو تلاش کرتا ہوا آیا، مگر ساتھی کے بجائے اُسے ایک سوراخ ملا۔

وہ سمجھ گیا کہ اس کے ساتھی کا کیا انجام ہوا ہے، اس لیے وہ اوان سے بدلہ لینے پرتل گیا۔ لیکن پہلے کی طرح اسے بھی اوان نے پکڑ لیا اور چاہتا تھا کہ اسے مار ڈالے، مگر شیطان بچے نے چلا کر کہا، ”مجھے چھوڑ دو، میں تمہیں پھر نہیں ستاؤں گا اور تم جو کچھ کہو گے وہ کروں گا۔“ اوان نے پوچھا ”تم کیا کر سکتے ہو؟“ شیطان بچے نے جواب دیا: ”میں تمہارے لیے جس چیز سے چاہو سپاہی بنا دوں گا۔“ سپاہی میرے کس کام آئیں گے؟“ اوان نے کہا۔ ”جس کام میں لانا چاہو“ شیطان بچے نے جواب دیا۔ ”کیا وہ گاسکیں گے؟“ ”ہاں اگر تم چاہو۔“ اوان نے آخر میں کہا: ”اچھا تو تھوڑے سے بنا کر دکھاؤ“ شیطان بچے نے منتر سا پڑھا اور دو چار گہیوں کی بالیاں زمین پر پھینک دیں۔ فوراً سپاہیوں کی ایک جماعت جس میں ہر ایک کے پاس کوئی نہ کوئی باجا تھا، اوان کے سامنے کھڑی ہو گئی اور سب نے باقاعدہ باجا بجا نا شروع کر دیا۔ اوان باجے سن کر بہت خوش ہوا۔ ”واہ، کیا خوب! اب میں گانوں کی لڑکیوں کے سلسلے یہ باجا بجوائوں گا تو وہ سن کر بہت خوش ہوں گی۔“ اوان کو خوش دیکھ کر شیطان بچے نے جانے کی اجازت مانگی، مگر اوان نے کہا، ”نہیں پہلے تم ان سپاہیوں کو پھر غلہ بنا دو۔ میں اپنا ناچ نہیں خراب کرنا چاہتا۔“ شیطان بچے نے اُسے ایک منتر بتایا جس کے پڑھنے سے سارے سپاہی پھر گہیوں کی بالیاں ہو گئے۔ اوان نے شیطان بچے کو چھوڑ دیا اور کہا: ”جاؤ خدا حافظ“ مگر خدا کا نام سنتے ہی شیطان بچہ زمین میں غائب ہو گیا، جیسے پتھر پانی میں۔ صرف ایک سوراخ دکھائی دیا۔

آدھی سلطنت اور داماد کا رتبہ انعام میں پائے گا۔ اداوان کے ماں باپ کو معلوم تھا کہ اُس کے پاس ایک بڑی جوہر بیماری کو اچھا کر دیتی ہے۔ انھوں نے اداوان سے کہا کہ شہزادی کو جا کر اچھا کر دے، پھر سب چین سے بسر کریں گے۔ اداوان راضی ہو گیا مگر وہ ہنسا دھوکا اور صاف ستھرے کپڑے پہن کر گھر سے نکلا ہی تھا کہ اُسے ایک بڑھیا ملی جس کا ایک ہاتھ سوکھ گیا تھا۔ بڑھیا نے اداوان سے دوا مانگی اور اداوان نے اُسے ایک جڑ دے دی۔ اُس کے پاس یہ ایک ہی جڑ رہ گئی تھی۔ پہلی وہ خود کھا چکا تھا، دوسری اُس نے ایک بیمار کُتے کو کھلا دی تھی، تیسری جس سے وہ شہزادی کو اچھا کرنا چاہتا تھا بڑھیا کے نذر ہوئی۔ اب اُس کے پاس کچھ بھی نہ تھا، لیکن وہ بادشاہ کے محل پر گیا اور اتفاق سے جیسے ہی اس نے دروازے کے اندر قدم رکھا، شہزادی اچھی ہو گئی۔ بادشاہ بہت خوش ہوا اور اس نے اداوان سے کہا: ”میری لڑکی سے شادی کر لو۔ اداوان نے کہا بہت اچھا“ اور دونوں کی شادی ہو گئی۔ اب تینوں بھائی بادشاہ ہو گئے۔ شادی کے تھوڑے ہی دن بعد اداوان کا خسر مر گیا۔ اداوان نے اپنا شاہانہ لباس اتار کر کس میں بند کر دیا اور پھر وہی سن کی قمیص، حُجبت پائجامہ اور چھال کے جوتے جو پہلے پہنتا تھا پہن لیے اور پُرانا مشغل بھی شروع کر دیا۔ اس نے کہا: ”میری زندگی بہت بے مزہ ہو گئی ہے، میں موٹا ہوا جاتا ہوں، مجھے بھوک نہیں لگتی، نیند نہیں آتی، اس نے اپنے ماں باپ اور بہن کو بھی اپنے پاس بلا لیا اور ویسے ہی محنت کر کے کھانے کمانے لگا، جیسے پہلے کرتا تھا۔

لوگوں نے کہا: ”تم تو بادشاہ ہو،“ اداوان نے جواب دیا کیسا بادشاہ بھوکوں

مرا کرتے ہیں؟ میں محنت نہ کروں تو کھاؤں کیسے؟“ اِوان کے پاس ایک وزیر نے اگر خبر دی: ”ہمارے پاس تنخواہیں مینے کے لیے روپیہ نہیں“ اِوان نے کہا ”تو تنخواہیں مت دو“۔ ”پھر ہمارا کام کوئی نہ کرے گا؟“ وزیر نے گھبرا کر کہا۔ اِوان نے جواب دیا: ”نہ کریں۔ ان کو خود محنت کر کے کھانے کے لیے اور وقت ملے گا۔“ اُن سے کہو کھاؤ ڈھونڈیں، پاخانہ صاف کریں“ اِوان کے پاس لوگ انسان کے لیے آئے۔ ایک نے کہا: ”فلاں شخص نے میرا روپیہ چرائیا ہے“ اِوان نے جواب دیا: ”اچھا تو کیا ہوا؟ اس سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ اُسے روپے کی ضرورت تھی۔“

سب کو یقین ہو گیا کہ اِوان احمق ہے۔ اُس کی بیوی نے ایک دن اُس سے کہا: ”لوگ کہتے ہیں تم بُرے احمق ہو“ ”اچھا“ اِوان نے جواب دیا: ”کہتے ہیں تو کہنے دو۔“ اِوان کی بیوی اس مسئلے پر بہت غور کرتی رہی۔ آخر کار اُس نے بھی اپنا شاہانہ لباس اُتار کر صندوق میں بند کر دیا اور اِوان کی بہن کے ساتھ کام کرنے لگی۔

اِوان کی سلطنت سے سارے عقلمند لوگ چل بیسے، صرف احمق ہی احمق باقی رہ گئے۔ کسی کے پاس روپیہ نہ تھا، سب محنت کر کے کھاتے اور دوسروں کو کھلاتے تھے۔

شیطان نے اپنے چیلوں کا بہت دنوں تک انتظار کیا۔ جب وہ واپس نہیں آئے تو اُس نے خود جا کر تینوں بھائیوں کو آپس میں لڑانے کا ہتھیہ کیا۔ پہلے وہ سیم یون کے پاس گیا اور اُسے فوج بڑھا کر شہرت حاصل کرنے اور دنیا کے

تمام ملک فتح کرنے کا لالچ دیا اور پھر ہندوستان کے بادشاہ سے ایک عظیم الشان جنگ کرائی جس میں سیم یون کو فاش شکست ہوئی اور ہندوستان کے بادشاہ نے اُس کے ملک پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد شیطان تراس کے ملک میں ایک بڑے سوداگر کا بھیس بنا کر پہنچا۔ تراس لوگوں سے کام لیا کرتا تھا اور انھیں ہمیشہ بہت اچھی اجرت دیا کرتا تھا، مگر شیطان نے اُس سے زیادہ روپے خرچ کرنا شروع کیا۔ تراس نے اپنی رعایا کے دل میں روپے کی ہوس پیدا کر دی تھی، اور جب شیطان نے اُس سے زیادہ روپیہ دینے کا وعدہ کیا تو سب اُس کی نوکری چھوڑ کر بھاگ گئے۔ شیطان نے اُس کے ملک میں کھانے پینے کی سب چیزیں بھی خریدیں اور چند مہینوں میں یہ نوبت آگئی کہ تراس کے پاس روپے کے سوا اور کچھ نہ رہا، اور وہ بھوکوں مرنے لگا۔ ایک روز سیم یون اُس کے پاس آیا اور ہندوستان کے بادشاہ سے لڑنے کے لیے مدد مانگی۔ تراس نے کہا: ”میں تمھاری مدد کیا کروں میں خود وودن سے فاقہ کر رہا ہوں“

اب شیطان اِوان کے پاس پہنچا اور اس کو سمجھایا کہ بادشاہ کو بغیر فوج کے نہ رہنا چاہیے۔ اِوان نے اُسے فوج اکٹھا کرنے کی اجازت دیدی، لیکن اُس کی رعایا نے بھرتی ہونے سے انکار کر دیا۔ شیطان نے لوگوں کو دھمکی دی کہ اگر وہ بھرتی نہ ہوئے تو بادشاہ انھیں قتل کرادے گا۔ یہ سن کر لوگ بہت حیران ہوئے اور اِوان سے آکر کہنے لگے: ”آپ نے ایک افسر رکھا ہے، جو کہتا ہے کہ اگر ہم فوج میں بھرتی نہ ہوئے تو آپ ہمیں قتل کرادیں گے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“ اِوان نے جواب دیا: ”میں احمق نہ ہوتا تو تمھیں بتا دیتا۔ مگر خود میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیسا

تم سب کو کیسے مار ڈالوں گا“

شیطان نے دیکھا کہ یوں کام نہیں چلتا۔ اس لیے وہ ترکان کے بادشاہ کے پاس گیا اور اس کو اِوان سے لڑنے پر آمادہ کیا۔ لوگوں نے جا کر اِوان سے کہا: ہم نے سنا ہے کہ ترکان کا بادشاہ ہمارے ملک پر چڑھائی کرنے والا ہے، اِوان نے جواب دیا: ”اچھا، تو اُسے آنے دو“ ترکان کا لشکر جب اِوان کے ملک میں پہنچا تو اس کے مقابلے پر کوئی فوج نہیں آئی۔ لشکر کے سپاہیوں نے ٹوٹنا شروع کیا، تب بھی کسی نے ردک ٹوک نہ کی۔ اِوان کی رعایا سب اُن سے کہتی تھی: ”ارے بیچارو، تمہارے گھر کھانے کو نہیں تو تم ہمارے پاس آ کر کیوں نہیں رہتے؟“ ترکان کی فوج آخر کار لوٹے لوٹے تنک گئی۔ یہ دیکھ کر اُس کے بادشاہ نے حکم دیا کہ سارے ملک میں آگ لگا دی جائے۔ یہ ترکیب بھی نہ چلی۔ اپنا گھر بار جلتے دیکھ کر اِوان کی رعایا میں بوڑھے بچے سب روتے تھے اور کہتے تھے: ”تم آخر یہ اچھی چیزیں برباد کیوں کرتے ہو؟ اگر تمہیں کسی چیز کی ضرورت ہو تو خوشی سے لے جاؤ“ اس انداز نے ترکان کے سپاہیوں کو تھوڑے دنوں میں غارت گری سے عاجز کر دیا۔ اور ایک ایک کر کے تمام سپاہی اپنے اپنے گھر بھاگ گئے۔

شیطان نے ایک اور چال چلی وہ نہایت نفیس کپڑے پہن کر اور بہت سا روپیہ لے کر آیا اور اِوان کی رعایا میں روپے کا لالچ پیدا کرنا چاہا۔ پہلے تو لوگوں نے چھکیلے سونے کے سکے دیکھ کر انہیں حاصل کرنا چاہا، اُن کے حاصل کرنے کے لیے محنت بھی کی، چیزیں بھی بیچیں، لیکن جب سب کے پاس بہت سے سکے

ہو گئے تو انہوں نے مانگنا چھوڑ دیا اور آخر میں یہ نوبت ہو گئی کہ شیطان اپنے چمکیلے
سکے لیے لیے پھرتا تھا اور اُسے اُن کے بدے میں کوئی چیز نہیں ملتی تھی۔ لوگ
کہتے تھے کہ مسیح کے صدقے کچھ خیرات مانگو تو ہم کھانے کو دیدیں گے، سونے کے
سکے ہمیں نہیں چاہئیں۔

تب شیطان نے لوگوں سے کہنا شروع کیا: ”تم بڑے بے وقوف ہو، تم
ہاتھ پیر سے محنت کر کے روزی حاصل کرتے ہو، تمہیں دماغ سے کام کرنا چاہیے۔ آؤ
میں تمہیں سکھاؤں کہ دماغ سے کیسے کام کرنے میں ”ادان کو یہ خبر ملی، اُس نے
کہا: ”ہاں ضرور سکھاؤ، ہمارے ہاتھ کام کرتے کرتے خشک جاتے ہیں۔ اگر ہم کبھی
کبھی دماغ سے بھی کام لے سکیں تو بہت اچھا ہوگا۔“ اِدان کے ملک میں ایک
اوپنچا سا مینار تھا اور اُس نے یہ تجویز کی کہ شیطان اُسی پر کھڑے ہو کر تمام رعایا
کو اپنے دماغوں سے کام کرنے کی ترکیب بتائے۔ چنانچہ شیطان مینار کے اوپر
چڑھ گیا اور وہاں سے تقریر کرنے لگا۔ کچھ دیر تک سب بڑے غور سے سنتے
رہے، لیکن جب وہ سمجھ گئے کہ شیطان صرف بغیر محنت کیے روزی حاصل کرنے
کو ترکیبیں بتا رہا ہے تو سب اپنے اپنے گھر چل دیے۔ شیطان تین دن تک کھڑا
تقریر کرتا رہا، نہ کچھ کھایا نہ پیا، تیسرے دن اُس میں کھڑے رہنے کی بھی طاقت
نہ رہی اور وہ مینار کے زینے پر سے لڑھکتا ہوا نیچے آگرا۔ کچھ لوگ اُسے سنبھالنے
کے لیے پکے، لیکن جیسے ہی وہ نیچے گرا، زمین بھٹ گئی اور وہ اُس میں سما گیا،
اور صرف ایک سوراخ دکھائی دیا۔

دوسرا قصہ جو بطور نمونہ پیش کیا جاتا ہے، مذہب اور پارساتی کی حقیقت

بیان کرتا ہے۔ پچھلے قصے کی طرح اسے بھی تالستانی نے عوام کی زبانی سُن کر اپنی طرز پر لکھا ہے۔

تین زاہد

ایک مرتبہ ایک اسقف جاتریوں کے جہاز پر ایک خانقاہ کا معائنہ کر لے جا رہا تھا۔ رستے میں جہاز ایک جزیرے کے پاس سے گزرا، جس پر اُسے معلوم ہوا کہ تین زاہد رہتے ہیں۔ لوگوں کی زبانی اُس نے اُن کے زہد و اتقا کے ایسے حالات سنے کہ اُسے ان مقدس بزرگوں سے ملاقات کی خواہش پیدا ہوئی۔ جہاز کے افسر سے کہ سن کر اُس نے جزیرے پر جانے اور ان تین زاہدوں سے ملاقات کرنے کی اجازت حاصل کر لی اور افسر کے حکم سے چند ملاحوں نے اُسے ایک چھوٹی کشتی پر سوار کر کے جزیرے تک پہنچا دیا۔ سمندر کے کنارے ہی پر اُسے تینوں زاہد دکھائی دئے۔ وہ ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے کھڑے تھے اور جیسے ہی اُس نے زمین پر قدم رکھا، تینوں نے جھک کر ہنایت ادب سے اُسے سلام کیا۔ ان میں سے ایک قد میں بہت چھوٹا تھا، اُس کی کمر تھکی ہوئی تھی اور ضعیفی سے اُس کے بال سفید ہو کر سنبر ہو چلے تھے، مگر اس عمر میں بھی اُس کا چہرہ ایک دائمی تبسم سے روشن رہتا تھا۔ دوسرا قد میں ذرا لمبا اور کافی سن رسیدہ تھا۔ اُس کی ڈاڑھی کارنگ زردی مائل تھا اور وہ اُس کے چوڑے سینے پر بکھری رہتی تھی۔ تیسرا قد میں سب سے اونچا تھا۔ اُس کی ڈاڑھی برف کی طرح سفید تھی، آنکھیں بھنودوں سے ڈھکی ہوئی تھیں اور چہرے پر کچھ جلالی کیفیت تھی۔ تینوں کے لباس میں بھی ایسا ہی فرق تھا۔ پہلا

اور سب سے جھوٹا، ایک بھٹی پُرانی پادریوں کی عبا پہنے تھا۔ دوسرا میا نے قد والا، ایک کسانوں کے طرز کا کوٹ، تیسرا، جو سب سے لمبا تھا، تہمد کی جگہ ایک چٹائی پیٹے تھا۔

اسقف نے پہلے تینوں کو مغفرت کی دعا دی، جسے سُن کر تینوں اُس کے سامنے زمین تک جھک گئے اور اُس کے بعد اسقف نے کہا: میں نے سنا ہے کہ تم تین خدا کے برگزیدہ بندے نجات حاصل کرنے کے لیے یہاں گوشہ نشین ہو اور خدا کے تمام بندوں کے لیے مغفرت کی دعا مانگتے رہتے ہو۔ میں بھی عیسیٰ مسیح کا ایک حقیر خادم ہوں اور خدا کے کرم سے دین عیسوی کے تمام پیروں کی نگہداشت میرے سپرد کی گئی ہے۔ میں تم تینوں سے ملنا چاہتا تھا، کہ اگر تم کچھ سیکھنا چاہو تو تمہیں سکھا دوں۔

تینوں بڈھے ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکرائے، مگر خاموش رہے۔ اسقف نے پوچھا: ”اچھا یہ تو بتاؤ کہ تم خدا کے قہر سے بچنے کے لیے کیا کر رہے ہو اور اس کی خدمت کس طرح سے کرتے ہو؟“ میا نے قد والے زاہد نے ایک آہ بھری اور سہتہ قد والے کی طرف دیکھا، اس نے مسکرا کر کہا: ”ہم کو نہیں معلوم کہ خدا کی خدمت کیسے کی جاتی ہے، ہم صرف اپنی لبردقات کرتے ہیں۔“

”مگر تم خدا سے دعا کیا مانگتے ہو؟“ اسقف نے پوچھا۔

زاہد نے جواب دیا: ”ہم کہتے ہیں: تم بھی تین ہو، ہم بھی تین ہیں، ہمارے اوپر رحم کرو۔“ زاہد نے جیسے ہی یہ کہا، تینوں کی نظریں آسمان کی طرف اٹھ گئیں اور انہوں نے ایک ساتھ اپنی دعا دہرائی: ”تم بھی تین ہو“

ہم بھی تین ہیں، ہم پر رحم کرو۔“

اسقف مسکرایا: ”معلوم ہوتا ہے“ اُس نے کہا ”کہ تم نے تثلیث کے بارے میں کچھ سنا ہے۔ مگر تم جس طرح سے دعا مانگتے ہو وہ غلط ہے“ اور اس کے بعد اسقف نے انھیں وہ دعا سنائی جو حضرت عیسیٰ نے انجیل میں بتائی ہے، انھیں دین عیسوی کے عقیدے سمجھائے اور اُن سے کہا کہ یہ صحیح دعا سیکھ لو۔ زاہد دل کو دعا یاد کرنے میں بہت دشواری ہوئی۔ وہ خاموشی کے ایسے عادی ہو گئے تھے کہ اُن کے منہ سے الفاظ بڑی مشکل سے نکلتے تھے۔ جو سب سے لمبا تھا اُس کا منہ بانوں میں چھپ گیا تھا اور اُس کی آواز نہیں سنائی دیتی تھی، سب سے چھوٹے کے سارے دانت گر گئے تھے اور وہ الفاظ کا صحیح تلفظ نہیں کر سکتا تھا۔ اسقف جب تینوں کو دعا سکھا چکا تو شام ہو گئی تھی اور چاند نکل آیا تھا۔

جہاز پر واپس جا کر اسقف ایک کونے میں کرسی پر بیٹھ گیا اور خبریے کی طرف دیکھتا رہا۔ رات کا ایک پہر گزر گیا اور مسافر سب جا کر سو گئے، مگر وہ بیٹھا رہا ایک بارگی اُسے پانی کی سطح پر جہاں چاند کی روشنی نے ایک رستہ سا بنا دیا تھا، کوئی سفید چمکیلی چیز نظر آئی۔ پہلے اُسے وہ کوئی دریائی پرند سمجھا، پھر جب وہ اور پاس پہنچی تو اُسے خیال ہوا کہ کوئی کشتی ہوگی۔ لیکن اُس کی رفتار جہاز سے بہت زیادہ تیز تھی، ایک منٹ میں وہ کہیں سے کہیں پہنچ گئی۔ اسقف کی کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا ہے اور اُس نے جا کر جہازِ زمان سے کہا: ”دیکھو جی، وہ کیا ہے، وہ کیا ہے؟“ اُس نے یہ سوال کئی بار پوچھا،

لیکن اب اُسے صاف دکھائی دے رہا تھا کہ وہی تین زاہد پانی پر دوڑے چلے آ رہے ہیں۔ اُن کے جسم سفید تھے، ڈاڑھیاں چمک رہی تھیں اور وہ جہاز کے نزدیک اس تیزی سے چلے آ رہے تھے کہ گویا جہاز کھڑا ہو۔
جہاز کے پاس پہنچتے ہی تینوں نے سر اٹھایا اور اسقف کو مخاطب کر کے بولے:

”خدا کے مہربان بندے، تم نے جو دعا ہمیں سکھائی تھی وہ ہم بھول گئے ہیں۔ جب تک ہم اُسے دُہراتے رہے وہ یاد رہی، لیکن ہم تھوڑی دیر دم لینے کے لیے رُکے تھے کہ کہیں سے ایک دو لفظ چھوٹ گئے، اور اب وہ ہمیں بالکل بھول گئی ہو۔ ہمیں پھر سے یاد کرا دو،“ اسقف نے سینے پر صلیب کا نشان بنایا اور اُن سے کہا:

”وہ خدا کے برگزیدہ بندو، تمھاری اپنی دعا خدا تک پہنچ جائے گی۔ تم خود ہم گنہگاروں کی مغفرت کے لیے دعا مانگو۔“

یہ کہہ کر اسقف اُن کے سامنے زمین لبوس ہٹا اور وہ واپس چلے گئے جہاں وہ نظر سے غائب ہوئے تھے اُس جگہ پر سویرے تک ایک روشنی سی چمکتی رہی۔

دوسرا باب

پہلی کوشش

ولاجی میر بادشاہ کی نف کے عہد میں (۹۷۰ - ۱۰۱۵) مذہب عیسوی کا روس میں پرچار شروع ہوا اور مذہب کے ساتھ ہی تعلیم کا سلسلہ بھی جاری ہو گیا۔ اس وقت تک اُن سلاطینوں کی جو روس میں آیا ہو وہی تھیں کوئی اپنی تحریری زبان نہیں تھی اور باندھن یعنی کلیسا کے اُن مبلغوں اور سفیروں نے جو روسیوں کو عیسائی بنا رہے تھے سلاطین زبان کی ایک شکل کو جو بلغاریہ کے اطراف میں بولی جاتی تھی اور جس میں یونانی زبان کے الفاظ کثرت سے تھے اس نئے کلیسا کی باضابطہ زبان قرار دیا۔ انجیل کا اس زبان میں ترجمہ موجود تھا اور یوں انھیں طالب علموں کو یہ نئی زبان سکھانے میں ایک آسانی بھی ہو گئی۔ کی نف میں کلیسا کی بنیاد پڑتے ہی مذہبی بزرگوں کے مقولوں، وعظوں اور خطوں کو نقل اور ترجمہ کرنے کی رسم جاری ہو گئی اور مذہبی رنگ کی تصانیف کا ذخیرہ رفتہ رفتہ بڑھنے لگا۔

عیسائی مذہب کی اشاعت کے ساتھ جا بجا خانقاہیں قائم ہونے لگیں۔

جیسا کہ اور ممالک میں بھی ہوا، روس میں یہاںوں نے اپنے زمانے کی یادگار

قائم رکھنے کے لیے وقایع نگاری شروع کر دی۔ نس توڑ کی تصنیف جو ۸۶۲ء سے ۱۱۱۰ء تک کے حالات بیان کرتی ہو وقایع نگاری کا پہلا نمونہ ہو۔ اکثر محققوں کی رائے ہو کہ نس توڑ دراصل ایک فرضی ہستی ہو اور اس کی تصنیف میں مختلف اجزا ہیں جن کی زبان اور طرزِ تحریر مختلف زمانوں اور مصنفوں کا پتہ دیتا ہو نس توڑ کی روس کے بہت سے رہبانوں نے پیروی کی اور اس وقت سے لے کر سترھویں صدی تک کی روسی تاریخ رہبانوں کے وقایع میں ملتی ہو۔ لیکن افسوس ہو کہ ان وقایع نگاروں نے اصل واقعات لکھنے سے زیادہ اس شہر یا شاہی خاندان کی عظمت جتانے کا خیال رکھا جس سے ان کا تعلق تھا اور اس طرح سے اپنی تاریخی حیثیت بہت گرا دی۔ زبان کے روسے ان مصنفوں کی خصوصیت یہ ہو کہ انھوں نے اس سلاطین زبان کے بہت سے الفاظ استعمال کیے جو بول چال میں رائج تھے اور اگرچہ ان کی زبان الفاظ اور نحو کے لحاظ سے خالص روسی نہیں کہی جاسکتی، لیکن اس میں قومی عنصر اس قدر شامل ہو گیا تھا کہ وہ محض باز نطینی یا قدیم سلاطین نہیں رہی۔

وقایع اور خالص اندہی تصانیف کے علاوہ سولھویں صدی سے پہلے کی دو تاریخی داستانیں ہیں، ”ایگور کے حملے کی داستان“ اور ”زودن ٹیچی نا“ جو بڑی حد تک اول الذکر کی نقل ہو۔ ایگور کے حملے کی داستان کی نفع کے بادشاہ ایگور کی پولوف ٹی ٹی سے، جو روس کے جنوب مشرقی حصے میں آباد تھی، ایک لڑائی کا قصہ سناتی ہو۔ ایگور جب اپنے بائیکوں کو لے کر روانہ ہوا تو اس نے راستے میں بہت سی یدِ سنگونی کی علامتیں دیکھیں، لیکن اس نے ان کی مطلق پروا نہیں کی اور آگے بڑھتا چلا گیا۔ آخر کار پولوف ٹی کے لشکر سے مقابلہ ہوا، اور لڑائی

میں ایگور نے شکست کھائی، اگرچہ جنگ میں پرندے اور درندے روسی فوج کی اپنے اپنے طور سے مدد کر رہے تھے اور خود روسی بھی انتہائی بہادری اور جفا فٹانی سے لڑے۔ ادبی نقطہ نظر سے اس داستان کا جوہر ایگور کی ملکہ یاروسلافنا کا نوحہ ہے، جب وہ شہر پوتیفیل کی فصیل پر میٹھی ایگور کا راستہ دیکھ رہی تھی اور اس کے دل میں ہر طرح کے اندیشے پیدا ہو رہے تھے۔

”یاروسلافنا کی آواز کوئل کی فریاد کی طرح گونجتی ہے۔ سورج نکلتے ہی گونجتی ہے:

”میں کوئل بن کر دریا کے کنارے کنارے اڑ کر جاؤں گی۔ میں اپنی سمور کی آستینیں کیا لا دوں یا میں بھگوؤں گی، ان سے اپنے شہزادے کے زخم دھوؤں گی۔ اپنے سمور ما کے کاری زخموں کو۔

”یاروسلافنا پوتیفیل کی فصیل پر آہ وزاری کرتی ہے۔

”درا می ہوا، بیدار ہوا! میری آقا، تو اتنی تیز کیوں چل رہی ہے؟ تو اپنے ہلکے پردوں پر خانے کے تیر کیوں اڑا کر لائی، کہ میرے سمور ما کی فوج پر گریں؟ کیا وہاں ارباب دلوں میں اڑنے سے تیراجی نہیں بھرتا؟ سمندر پر جہازوں کو تھو لا اٹھلانے میں جی نہیں لگتا؟ تو نے میرے پیارے کوزمین پر کیوں لٹا دیا؟

”یاروسلافنا پوتیفیل کی فصیل پر آہ وزاری کرتی ہے۔

”ایم شان دار ونیر، تو نے چٹانوں بھری پہاڑیوں کو چیر کر پوٹوٹ ٹسی

لے پوٹوٹ ٹسی کا سردار آگے چل کر معلوم ہوتا ہے کہ اس کا نام کو بیاک تھا۔

لے جنوبی روس کا ایک دریا۔

کے ملک تک اپنا راستہ بنایا ہے۔ تو سفیا تو سلاط کی کشتیوں کو لے گیا تھا، جب وہ کو بیاک خان سے لڑنے گیا۔ آہ، میرے آقا، میرے شوہر کو میرے پاس بھسپہ پہنچا دے اور میں تیرے دھارے میں سمندر کی طرف اپنے آنسو بہا نا چھوڑ دوں گی۔ ”یار و سلا فنا پو تیغل کی تفصیل پر سہاہ و زاری کرتی ہے۔

”ای روسشن سورج، ای چکنے و کتنے سورج! تو اپنی گرمی سب تک پہنچاتا ہے سب کے لیے چمکتا ہے۔ تو نے اپنی جلتی ہوئی کرنیں میرے شوہر کے جوانوں پر کیوں برساتی تو نے ان خشک میدانوں میں ان کے ہاتھوں میں ان کی کمانیں کیوں سکھا دیں؟ تو ان کو پیاسا کیوں کرتا ہے، ان کے تیروں کو ان کے کندھوں پر بھاری کیوں کر رہا ہے؟“ ایگور کے حملے کی داستان ”بارھویں صدی کے آخر یا تیرھویں کے شروع میں تصنیف کی گئی اور ”زدون شچی نا“ روسیوں اور تاتاریوں کی ۱۳۷۰ کی ایک لڑائی کا بیان ہے۔ یہ زمانہ اس قسم کی داستانوں کے لیے موزوں تھا اور غالباً یہ دو یادگاری جو محفوظ رہیں اپنی جہی بہت سی مثالیں رکھتی ہوں گی۔ لیکن پندرھویں، سولھویں اور سترھویں صدی میں کلیانے، اس خیال سے کہ ایسی کہانیاں بے دینی کا باعث ہوتی ہیں، لوگوں سے ان کی یاد بھلانے کی بہت سخت کوشش کی اور عوام کے گیتوں کی طرح یہ بھی کثر مذہب کے بھینٹ چڑھیں۔ روسی ادب کو اس طرح سے جو نقصان پہنچا اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔

تیرھویں صدی میں تاتاریوں کے گشت و خون کے بعد ماسکو کی ریاست کا

لے ایگور کا دوسرا نام ہے۔

لے کرد پوت کن: ”روسی ادب“

عروج ہوا اور اس کے ساتھ ہی وہ شگفتگی جو روسی قوم اور اس سے قبل کی تصنیف اور گیتوں وغیرہ میں پائی جاتی ہے، بالکل ناپید ہو گئی۔ وقایع نگاری تک کا انداز نہ بدل گیا۔ نوٹ گورود، ولاجی مر، پسکوف اور دوسرے بڑے شہروں کے وقایع نگار جو اپنی مقامی زندگی سے بے حد دلچسپی ظاہر کرتے تھے ماسکو کی ریاست کے گن گانے میں مصروف ہو جاتے ہیں اور روکھے سوکھے واقعات کے سوا کچھ نہیں لکھتے۔ سو لھویں صدی میں پادری سلوستر کی کتاب ”گھر کا نظام“ زار ادان چہام اور اس کے باغی امیر گربسکی کے خطوط اور گربسکی کی ایک تاریخ روس اس دور کی ادبی یادگاریں ہیں جو تیرھویں صدی سے شروع ہوا اور اٹھارھویں صدی میں پیٹر اعظم کی اصلاحوں کی بدولت آخر کار ختم ہوا۔ سلوستر کی تصنیف ادب سے زیادہ روسی معاشرت کی تاریخ میں اہمیت رکھتی ہے۔ اس میں روسی گھر گریستی دالوں کو طرح طرح کے مشورے دیے گئے ہیں اور عیسائی مذہب کے مطابق ان کے جو حقوق و فرائض ہیں وہ سب سمجھائے گئے ہیں۔ روسی عورتیں اس کتاب کے نام سے جلتی ہیں، کیونکہ اس میں شوہروں کو اجازت دی گئی ہے کہ بد مزاجی یا نافرمانی کی سزا میں اپنی بیویوں کو مارا کریں۔ کتاب کے مصنف نے تاکید کر دی ہے کہ ایسی چیز سے نہ مارنا چاہیے کہ بیوی کے زخم پڑ جائیں یا ہڈی پسلی ٹوٹ جائے نہ ایسی جگہ پر کہ ہسائے اس کے رونے پٹنے کی آواز سن سکیں، مگر معلوم ہوتا ہے یہ تاکید روسی عورتوں کے لیے باعث تسلی نہیں ہوئی ہے۔ ”گھر کے نظام“ کے علاوہ اس صدی کی دوسری ادبی یادگار، زار ادان اور گربسکی کے خطوط بھی ”گھر کے نظام“ کی طرح صرف ضمناً ادب میں شامل کیے جاسکتے ہیں۔ کیونکہ زار

اور اس کے باغی امیر کے درمیان سیاسی مسائل پر بحث ہوئی تھی اور دونوں نے نہایت بھونڈی، بھڑکی اور پیچیدہ زبان میں اپنے خیالات ادا کیے، اگرچہ زار اوان کی عبارت میں اس کی طبیعت کے زور اور قوت کا کچھ عکس نظر آتا ہے۔ گربسکی کی تاریخ روس اوان کے مطالعہ کی داستان سنلنے کی غرض سے لکھی گئی تھی۔ زبان اور طرز تحریر کی رو سے اس کی کوئی وقعت نہیں۔

پیٹر اعظم (۱۶۸۲ - ۱۷۲۵) نے روسی ذہنیت پر دینی کے بجائے دنیاوی رنگ چڑھانا اپنی زندگی کا ایک اہم مقصد قرار دیا تھا اور یہ اسی کی اصلاحوں کا نتیجہ تھا کہ روسی ادب کو کلیسا کے پنجے سے رہائی ملی۔ اس کی تخت نشینی کے ساتھ جس طرح روسی ریاست نے اپنا جہم لیا ویسے ہی روسی ادب میں بھی نئی جان پڑ گئی۔ اس زبان کی جس نے انیسویں صدی میں اپنے جوہر دکھائے، اس ذہنیت کی جس میں روسی تخیل نے پرورش پائی، اس معاشرت کی جو روسی قوم نے بالآخر اختیار کی، پیٹر اعظم کے عہد میں بنیاد ڈالی گئی اور صحیح معنوں میں روسی ادب کی تاریخ اسی زمانے سے شروع ہوتی ہے۔ پیٹر اعظم کو ادب سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی، لیکن اسے یقین تھا کہ تعلیم کے بغیر اس کی اصلاحیں بالکل سطحی رہیں گی اور ان میں مطلق استحکام نہ ہوگا، اس وجہ سے اس نے روسی زبان کی طرف بہت توجہ کی۔ اس نے روسی ابجد میں ترمیم کرائی، عربی ہندسے رائج کئے اور ملک میں علم کو فروغ دینے کے لیے درجنوں فرانسیسی اور جرمن کتابوں کے ترجمے کرائے اور کئی خود بھی کیے۔ روسی عوام اور شرفاء کی رائے عموماً جدت اور اصلاح کے خلاف لے موجودہ ہند سے عربوں نے رائج کئے اور اس وقت یورپ میں جو ہند سے متعلیٰ ہیاسی وجہ سے عربی کہلاتے

تھی، لیکن جیسا کہ کوتوشی خن (۱۶۳۰-۱۶۶۷) اور کرمی رانج کی تصنیف سے ظاہر ہوتا ہے، روس میں پیٹر اعظم سے پہلے بھی اصلاح اور ترقی کے حوصلہ مند موجود تھے۔ خود پیٹر کو ایک ایسا حامی اور مشیر ملا جو علمی اور ادبی قابلیت کے لحاظ سے روس میں کیستاتھا، یعنی نے وفان پروکوپوویچ (۱۶۸۱-۱۷۳۶) نوٹ گوروو کا اسقف۔ وہ بہترین مقرر تھا اور اس کی تصانیف، جن میں ایک دو ڈرامے بھی شامل ہیں، بہت جوشیلی اور ایک نئی زندگی کی امیدوں سے لبریز ہیں۔ پیٹر اعظم کا ہم عصر ایک اور خود آموختہ انشا پرداز تاجر پولوش نکون تھا، جس نے اپنی تصانیف میں ریاست کو قوم کی اصلاح کرنے کی ترغیب دلائی اور بادشاہ کو معاشیات کے صحیح اصول سمجھانے کی کوشش کی۔

مضن اس وجہ سے کہ وہ اپنی کمی اور کمزوری محسوس کرتے تھے، پیٹر اعظم اور قومی اصلاح کے حامیوں نے انشا پردازی کا ہتھیار اٹھایا اور اسی کو اپنے خیالات کی تبلیغ کا ذریعہ بنایا۔ لیکن شروع میں نہ تو یہ ہتھیار ایسا تھا کہ اس کے وار کارگر ہو سکیں، نہ اسے استعمال کرنے والے ایسے ماہر کہ اس کی خامیاں دور کر سکیں۔ ابجد کی اصلاح اور بیرونی زبانوں کے ترجموں نے صرف ایک ہی مشکل حل کی، روسی انشا پردازوں کو ابھی بہت سی دشواریوں کا سامنا کرنا تھا، بہت سے مرحلے طے کرنا، جن میں سب سے پہلا اپنے فن کو سیکھنا اور سکھانے کے لیے استاد تلاش کرنا تھا۔ روسی زبان میں بھی نازک احساسات اور خیالات ادا کرنے کی صلاحیت نہ تھی، اس لیے کہ وہ ابھی تک قدیم سلاط اور مختلف عوام کی بولیوں کا ایک بے ترتیب مجموعہ تھی، جس میں تقریباً ہر ملک کے الفاظ اور محاورے بھی

شامل ہو گئے تھے۔ اس پر طرہ یہ تھا کہ صرف و نحو کے کوئی قواعد بھی نہیں تھے جن کے مطابق اصلاح کی جاسکے۔ قدیم سلاطین زبان کے اصول ترک کر دیے گئے تھے، کیونکہ ان میں جدید مضامین بیان کرنے کا امکان نہ تھا اور نئی روسی زبان کے قواعد ابھی معین نہیں ہوئے تھے۔ یوں روسی انشا پردازوں کی پہلی کوششیں زبان کو درست کرنے اور جدید اسلوب کے لیے موزوں بنانے میں صرف ہوئیں روسی انشا پردازی کو خود مختار بننے کے لیے بڑے عرصے تک شاگردی اختیار کرنا پڑی اور اس کے استاد فرانسیسی شاعر، نثار اور نقاد تھے ۴

روسی ادب کے اس دور کی چار ہستیاں یہ خاص اہمیت رکھتی ہیں کہ انھوں نے جدید انشا پردازی کی بنیاد ڈالی اور اپنی کوششوں سے دوسروں کی مشکلیں قدرے آسان کر دیں۔

نواب آنت یوخ کان تے میر (۱۷۰۹-۱۷۴۴) مول داویا کے ایک امیر کارل کا تھا جس نے روس میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ کان تے میر نے ماسکویں جدید طرز پر تعلیم پائی تھی اور شروع ہی سے پیٹر اعظم کی اصلاحوں کا حامی تھا۔ جب پیٹر اعظم کے انتقال کے بعد قدامت پسند جماعتوں نے اس کی تمام جدتوں اور اصلاحوں کو رد کر دینے کا ہتھیہ کیا تو کان تے میر نے ان کی عملی اور تحریری مخالفت

لے اور اس طوفان کی: ”روسی ادب“

لے روسی لقب ”کنیاز“ کا ترجمہ اکثر ”پرنس“ یعنی شہزادہ کیا جاتا ہے: یہ ترجمہ غلط ہے اور چونکہ اردو میں خاص طور سے غلط فہمی کا اندیشہ ہے اس لیے اُس کا ترجمہ ”نواب“ کیا گیا ہے، جو عہدے اور درجے کے لحاظ سے زیادہ صحیح بھی ہے۔

کی، لیکن اس کی شخصیت ایسی نہیں تھی کہ وہ کوئی خاص اثر پیدا کر سکے۔ اسے اپنی قوم کی مگر اہی اور قومی رہبروں کی تنگ نظری سے جو صدمہ پہنچا وہی اس کی تصانیف کا محرک تھا اور اسی کی وجہ سے اس کی تصانیف مانتی ہیں یا طرہ۔ اس کی سب سے قابل قدر ادبی یادگار ایک طنزیہ نظم ہے جس میں اس نے نئی روشنی کے مخالفوں اور ان کی ذہنیت کی ایک مضحکہ خیز تصویر کھینچی ہے۔ نظم کے ”ہیرو“ ایک رہباز کری توں اور تین رئیس، سل دان، لوکا اور بے دوریں۔ چاروں نئی روشنی اور جدید تعلیم کے مسئلے پر اپنے خیالات ظاہر کرتے ہیں۔ کری توں کہتا ہے:-

”فرقہ بندیوں اور اتحاد، یہ علوم کی اولاد ہوتے ہیں،

جو سب سے زیادہ غور کرتا ہے وہی جھوٹ بھی سب سے زیادہ بولتا ہے۔
جو کتابیں پڑھتا ہے خود بخود اپنا دین کھو بیٹھتا ہے۔

جسے دیکھو باتیں بناتا ہے، ہر بات کی وجہ، دلیلیں مانگتا ہے،
اور کلیسا کے عہدہ داروں کا ادب نہیں کرتا ہے۔

لوگوں کے اخلاق گر گئے ہیں، کوئی کو اسے نہیں پیتا۔
کیا مجال ہے کوئی بھونا گوشت چھو بھی لے۔

سل دان علوم پر دوسرا الزام لگاتا ہے۔

”تعلیم ہم کو فائدے کراتی ہے۔ اس سے قبل

جب ہم میں سے کوئی لاطینی زبان نہیں جانتا تھا۔

ہم بڑے عیش و آرام سے زندگی بسر کرتے تھے۔

لے پھلوں کا منشی شربت جو روس میں کثرت سے پیا جاتا ہے۔

جہالت میں ہمارے پاس روٹی افراط سے تھی : اب ہم نے
پرانی زبانیں سیکھ کر اپنی روٹی گنوا دی ہے۔

بحث مباحثہ، الفاظ میں اگلے پھلے کا فرق کرنا، کینوں کا کام ہے؛
شریف آدمی تو بس کرک کر "ہاں" کہتے ہیں یا گرج کر "نہیں"؛

کائناتے مری کی نظم پڑھنے سے ان دشواریوں کا اندازہ ہوتا ہے جو اس زمانے میں
روسی انشا پردازی کو درپیش تھیں۔ وہ عروض کے کسی خاص قاعدے کی پابندی
نہیں کرتا، اس کی نظم کہیں مرتجز ہے کہیں موزوں، محض اس وجہ سے کہ اس وقت
تک روسی نظم کے قواعد معین نہیں ہوئے تھے۔ اس کی زبان بھی کہیں بھاری
اور پُرانے طرز کی ہے، کہیں پراسی روزمرہ جس پر بازاری ہونے کا شبہ ہوتا ہے اور
اس معاملے میں اس پر کوئی الزام بھی نہیں لگایا جاسکتا، کیونکہ روس میں دراصل
ابھی تک کوئی ادبی زبان تھی ہی نہیں۔ عروض اور زبان کے قواعد بنانے کی
خدمت ترح یا کوٹ سکی اور لومونوسوف، دو عالموں نے انجام دی۔

وسیلی کیریل لویج ترحیا کوٹ سکی (۱۷۰۱ - ۱۷۶۹) اپنے زمانے کے
بہترین عالموں میں سے تھا۔ اسے علم کا اتنا گہرا شوق تھا کہ اسکو کے دارالعلوم سے
فارغ التحصیل ہو کر وہ پیدل بھیک مانگتا ہوا پیرس گیا اور وہاں مختلف شرفا
کی سرپرستی میں پڑھتا رہا۔ وطن واپس ہونے پر اس کے ادبی ذوق کی خبر ملکہ شیمک

لہ جس طرح نثر مرتجز میں قافیہ نہیں ہوتا، وزن ہوتا ہے، اسی طرح عروض کے ہر قاعدے
میں قافیہ نہیں ہوتا اور الفاظ کے ارکان کے مطابق وزن ہوتا ہے۔ فرانسیسی نظم میں بھی یہی قاعدہ رائج ہے

ملکہ ای لی زوے تا پتر دفنا (۱۷۴۱ - ۱۷۶۱)

پہنچی، دہرائیں اس کی رسائی ہوگئی اور رواج کے مطابق اسے خاص خاص موقوفوں پر نظمیں پڑھنے کا حکم ملنے لگا۔

فرانسیسی شاعروں کی نقل میں روسیوں نے بھی مرجز نظمیں لکھنا شروع کر دیا تھا، ترجیا کوٹسکی نے یہ ثابت کر دیا کہ روسی زبان کی خصوصیات دیکھتے ہوئے نظم کو موزوں کرنے کا قاعدہ اختیار کرنا بہتر ہوگا، گو وہ نظمیں جو اس نے اپنا نظریہ ثابت کرنے کے لیے بالکلہ کی فرمالین پر لکھیں نہایت ہمل تھیں۔ موزوں نظم رائج کرانے کے علاوہ ترجیا کوٹسکی نے روسی علم نحو میں بہت قابلِ قدر اضافہ کیا اور یہ بڑی حد تک اسی کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ روسی نحو کے قواعد بہت جلد ایک مستقل اور معین شکل میں مدون ہو سکے۔ ان علمی خدمات کے ساتھ ہی روسی ادب پر اس کا ایک اور احسان یہ بھی ہو کہ سب سے پہلے اسی نے تعلیم یافتہ روسیوں کو ان کے ادب العوام کی طرف متوجہ کیا اور انھیں اس کی خصوصیات اور خوبیاں سمجھائیں۔ اس موضوع پر اس کے چند بہت اچھے مضمون اب تک موجود ہیں۔

می خائل دیشل یوچ لومونوسوف (۱۷۶۵-۱۷۹۲) ایک خوش حال کسان کا لڑکا تھا۔ بچپن ہی سے اس نے غیر معمولی قابلیت کا ثبوت دیا اور شوق نے اسے علم کی جستجو پر ایسا مجبور کیا کہ سترہ سال کی عمر میں وہ اپنا پیدائشی شہر آرخانگل چھوڑ کر ماسکو چلا گیا۔ یہاں اسے شروع میں بہت مصیبتیں اٹھانا پڑیں، لیکن رفتہ رفتہ اس نے اپنی استعداد تسلیم کرائی اور جب وہ ماسکو کے دارالعلوم سے سند حاصل کر چکا تو ریاست کی طرف سے اسے جرمنی جا کر اپنے

علمی حوصلے پورے کرنے کے لیے وظیفہ مل گیا جرمنی سے علم کا وہ نہایت وسیع اور ہمہ گیر ذخیرہ لے کر روس واپس ہوا۔ آؤئی لڑ، جرمنی کے مشہور عالم ریاضیات نے اس کے بارے میں لکھا ہے کہ علوم طبعی اور کیمیا میں اس نے جو کام کیا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بہت غیر معمولی ذہانت کا عالم تھا معدنیات اور طبعی جغرافیہ میں بھی اسے بہت ملکہ تھا، اور ان علوم کے علاوہ وہ ادب اور لسانیات کا بھی ماہر تھا۔ شاعر لٹکن نے بہت سجا کہا ہے کہ لومونوسوف پہلا روسی دارالعلوم تھا۔“

لومونوسوف کی ذات سے روسی ادب کو جو فائدہ ہوا اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ اس نے روسی زبان کو کلیسا کی سلاطین زبان سے بالکل علیحدہ کر دیا، اور اسے سلیجھانے اور صاف کرنے کا سلسلہ جو پیٹر اعظم کے زمانے سے شروع ہوا تھا اپنی کوششوں سے تکمیل کو پہنچایا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے بیرونی زبانوں سے الفاظ اخذ کرنے اور انھیں اپنانے کے لیے قواعد بنائے اور نئی روسی زبان کے قواعد صرف و نحو ایک کتاب کی شکل میں شایع کیے جو اب تک سندھانی جاتی ہے۔ ان اصولوں کے مطابق اس نے طبع آزمائی بھی کی۔ معاصرین اسے بہترین یونانی اور روسی کلاسیکی شاعروں کا ہم پلہ قرار دیتے تھے اور گو اس رائے میں بہت مبالغہ معلوم ہوتا ہے، پھر بھی اتنا ضرور ہے کہ روسی شاعر، خصوصاً انیسویں صدی کے نصف اول میں اسے استاد مانتے رہے اور اس کی نظمیں زبان اور محاورے کے لحاظ سے بہت اعلیٰ ہیں۔ لیکن لومونوسوف دراصل عالم تھا، باوجود اس کی نصاحت اور بلاغت کے ہمیں اسے شاعر کی حیثیت سے نہیں جانچنا چاہیے۔ اس کے زمانے کی تعلیمی حالت ایسی تھی کہ جو شخص تک بندی کر لیتا اسے عام رائے شاعر بنا دیتی تھی

اور لوگوں کو اس طرح زبردستی کے شاعر بنانے میں خود دربار بہت پیش پیش رہتا تھا۔ اس قدر دانی سے روسی انشا پردازی کی کسی قدر ہمت افزائی تو ضرور ہوئی، لیکن اس بات پر افسوس ہوتا ہے کہ اس قدر دانی کی وجہ سے لومونوسوف جیسے عالم نے نہ باری شاعر بن کر اپنا وقت ضایع کیا اور روس میں علوم اور فنون کو فروغ دینے پر اپنی پوری قوت صرف نہ کر سکا۔

لومونوسوف کی نظمیں تعداد میں بہت ہیں، مگر ان میں سے اکثر دربار کی فرمائش پر لکھی گئی تھیں اور ان میں کوئی خاص خوبی نہیں۔ اس کے کلام کا بہترین حصہ چند نظمیں ہیں جو اس نے حمد میں لکھیں: ”حمد سحر گاہی“ کا ایک بند ملاحظہ ہو: ”یہ ہیبت ناک کرۂ آتشیں تیرے نزدیک ایک چنگاری ہے۔

ہاں، جب تو اس چراغ کو روشن کرتا ہے، کہ تیری محسوس،
جسے تو نے اپنے شوق سے بنایا، جسے تو اپنی رحمت سے زندہ رکھتا ہے،
محنت کر سکے اور اپنی حاجتیں پوری کرے،

تو کوہ اور دشت ہموار اور دریا
رات کی تاریکی سے نجات پاتے ہیں۔
ہماری نظروں کے سامنے تیری کائنات کا منظر
بے پردہ ہو جاتا ہے اور تیرے کرشمے دیکھ کر
ہمارے دلوں سے خود بخود آفریں کی صدا میں نکلتی ہیں۔
”بے شک ہمارا خدا احسن الخالقین ہے!“

اس نظم سے ظاہر ہوتا ہے کہ لومونوسوف کے وقت تک روسی شاعری نے

بہت کم نشوونما پائی تھی، لیکن لومونوسوف کے کلام میں بڑی خوبی اس کی پائی ہے۔ اس نے کلاسیکی شاعری کو اپنا معیار قرار دیا تھا اور اکثر اس کی پیروی کرتا تھا، مگر اس کی شاگردی میں بھی ایک متانت تھی جو اس کے معاصرین میں بہت کمیاب تھی خواہ وہ انشا پردازی میں طبع آزمائی کرتے ہوں یا نہ کرتے ہوں۔ اس سچا تقلید کی جو اس زمانے میں روسی ذہنیت کا ایک روگ بن گئی تھی الگ سے ہی ترویج سوارو کوٹ (۱۷۸۰-۱۷۷۷) ایک عبرت انگیز مثال ہے۔ سوارو کوٹ کو روس کا پہلا ڈراما نویس ہونے کا فخر حاصل ہے۔ اس نے نوالیہ اور تقریباً پچاس فرحیہ ڈرامے لکھے، جن میں سے اس کے المیہ ڈرامے خاص طور سے مقبول ہوئے۔ اس نے فرانس کے مشہور ڈراما نویس کورنے ٹی، رسین اور مولییر کا بہت گہرا مطالعہ کیا۔

لیپ پیئر کورنے ٹی (۱۶۰۶-۱۶۸۴) فرانسیسی ڈراما نویس کا بانی۔ اس کے ڈراموں کے اشخاص قدیم یونان اور روما کے مشابہ ہیں، مگر ان کے کیرکٹروں میں فرانسیسیت کی آمیزش بھی ہے۔ کورنے ٹی کا موضوع عموماً اعلیٰ اور ادنیٰ جذبات کی جنگ ہے اور اس کے کیرکٹر دراصل جیتے جاگتے انسانوں کے عکس نہیں بلکہ مختلف اخلاقی خصوصیتوں کے مجسمے ہیں۔

سے رسین (۱۶۳۹-۱۶۹۹) نے بھی کورنے ٹی کی طرح قدیم یونان اور روما کی شخصیتوں کو اپنے ڈراموں کے اشخاص بنایا۔ کورنے ٹی کے مقابلے میں اس کے پلاٹ بہت سلیجے ہوئے ہیں اور اسے زبان میں بھی زیادہ ملکہ ہے۔

سے ژان باپتست مولییر (۱۶۲۲-۱۶۷۳) فرحیہ ڈراما نویسوں کا سرتاج مانا جاتا ہے۔ یونان اور محاورے کی رو سے اس کی عظمت رسین سے کچھ کم نہیں اور اس کے ڈراموں میں ایک حقیقت نگاری ہے جو اپنا جواب نہیں دیتی۔ اس کے اکثر کیرکٹر ضرب المثل بن گئے ہیں۔

کیا تھا اور اپنے ڈراموں میں زیادہ تر ان استادوں کی نقل اُتارنے کی کوشش کی۔ یہ استاد خود، خصوصاً رسین اور کورنے نئی تصنع اور مردہ قواعد کے بندے تھے، سوار و کوف نے ان کی نقل کر کے اپنی طبیعت اور مذاق کے ظاہر ہونے کی کوئی گنجائش نہیں چھوڑی اور یہی اس کی تصانیف کی سب سے نمایاں خامی ہو۔ معاصرین اس کے بلند پرواز طرز بیان اور دقیق فلسفے سے بہت مرعوب ہوتے تھے، لیکن اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ ان کا معیار بہت گرا ہوا تھا اور چونکہ وہ سمجھتے تھے کہ جس کسی نے فرانسیسی انشا پردازوں کی کامیابی سے نقل اُتاری وہ عروج کی انتہا تک پہنچ گیا، انھیں سوار و کوف کی ناقابلِ برداشت تصنع اور خیالات کی کھلی چوری سے شکایت نہیں ہوتی تھی۔

آخر عمر میں سوار و کوف کو معلوم ہوا کہ اس کی طبیعت ڈراما نویس کے لیے اتنی موزوں نہیں جتنی کہانیاں لکھنے اور طرز یہ شاعری کرنے کے لیے۔ اس کے کلام کا یہ حصہ اس کے ڈراموں کے مقابلے میں بہت کم ہو، مگر ادبی خوبیوں کے لحاظ سے اس کے ڈراموں سے بہت بہتر ہو۔ سوار و کوف خود اس پر افسوس کرتا تھا کہ اس کا اصل ہنر اس کی نظروں سے اتنے عرصے تک چھپا رہا۔ یہ جیسا تقلید کی منزل تھی اور اس سزا کا ملنا انصاف کا تقاضا تھا۔ لیکن خطا سوار و کوف کی نہیں بلکہ اس کے ماحول، یعنی عام روسی ذہنیت کی تھی۔

پٹر اعظم کے مرنے کے بعد تعلیم یافتہ لوگوں کی تعداد بڑھتی گئی، مگر اس تعلیم سے ان کی ذہنی نشوونما مطلق نہیں ہوئی۔ جیسا کہ نووی کوف نے اپنے ایک رسالے میں لکھا ہو، اس زمانے کے بہت سے ”جاہل شریف زادوں“ کا خیال تھا کہ

”علم حاصل کیے بغیر بھی آدمی تعلیم یافتہ ہو سکتا ہے“ لوگوں کے دلوں میں ایسے اعلیٰ جوصلے نہیں تھے جو وہ تعلیم کے ذریعے سے پورے کرتے اور عام مذاق کو راہِ بہت پر لانے والا کوئی رہنما بھی نہیں تھا۔ قدیم روس میں پڑھے لکھے لوگ کم تھے، کتابیں بہت کم تھیں اور وہ بھی خالص مذہبی۔ پیٹر اعظم نے ریاست کے تمام ملازموں کو اپنا علمی ذخیرہ بڑھانے پر مجبور کیا اور مطالعے کی وہ حدیں جو کلیسا نے مقرر کی تھیں بالکل توڑ دیں۔ اس کی کوششوں کا نتیجہ یہ تو ضرور ہوا کہ روس میں جہالت پہلے کی طرح فخر کی بات نہیں رہی، ”لوگ کتابوں کو دیکھ کر اس طرح نہیں جھجکتے تھے جیسے دوا فروش کی دکان دیکھ کر“ اور کتب بینی کی رسم بھی ایک مجبوری کے طور پر تسلیم کر لی گئی۔ لیکن ریاست کے دباؤ یا ملازمت کے لیے امتحان پاس کرنے کی شرط سے علمی ذوق نہیں پیدا ہو سکتا تھا۔ ملازمت کے امیدوار اپنا مطلب حاصل کرنے کی غرض سے تھوڑا بہت پڑھ لیتے تھے مگر وہ معلومات جو اس وقت تک کی ترجمہ کی ہوئی کتابیں بہم پہنچا سکتی تھیں بہت کم تھیں اور خاص خاص لوگوں کے سماں سے کسی اور کو دلچسپی نہیں ہو سکتی تھی۔ تعلیم پھیلنے کا پہلا اثر یوں ظاہر ہوا کہ پڑھے لکھے لوگوں کو جن میں عورتیں اور لڑکیاں بہت پیش پیش تھیں، عشقیہ گیتوں کا چسکا لگا اومان گیتوں نے انھیں ادنیٰ جذبات پرست ڈراموں اور شہوت انگیز نادلوں کی قدردانی کے لیے تیار کر دیا جو یورپ کے مختلف ممالک اور خصوصاً فرانس میں اس وقت ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں لکھے اور پڑھے جاتے تھے۔ ”علم اور ادب لطیف، جنھیں متحد ہو کر زندگی کے مسائل کو سمجھنا اپنا خاص مقصد بنا چاہیے، ان لوگوں کی نظروں میں ایک دوسرے کے جانی دشمن

ہو گئے اور ان لوگوں نے یہ فیصلہ کیا کہ تعلیم کے گراں اور تلخ جزو کو الگ کر کے اسے
 خالص مسرت کا ذریعہ بنانا ممکن ہو اور انھیں ایسا کرنا بھی چاہیے، چنانچہ ناولوں کے
 چرچے کے ساتھ علم کی وقعت گھٹتی گئی، لوگ انسانیت کے فرائض، تہذیب اور
 شائستگی کی لوازمات سے بیگانہ ہوتے گئے اور لذت پرستی کے سوا انھیں اپنی زندگی
 کا کوئی مصروف نظر نہیں آیا جسے وہ قابل توجہ سمجھتے۔ یہ لذت پرستی جسمانی سے زیادہ
 ذہنی تھی اور اس نے ان کے تصور میں زندگی کا نقشہ بالکل بگاڑ دیا۔ ناول نے ان
 میں حقیقت بینی کی صلاحیت باقی نہیں رکھی اور جیسے بچوں کو ان کے گڈے گڑیا
 پیسچ بچے کے آدمی معلوم ہوتے ہیں، ان لوگوں کے نزدیک ناولوں کی خیالی دنیا
 میں محو ہونا تجربہ حاصل کرنے اور زندگی کا مشاہدہ کرنے کے برابر ہو گیا۔ پشگلین کی
 ہیروئن تفتیانہ کی طرح وہ سب رچر ڈسٹھ اور روسو پر جان دینے لگے۔۔۔ بیرونی
 ممالک کے ان شرفا کو جنہوں نے روس میں سکونت اختیار کی تھی، روسی سوسائٹی کے اعلیٰ طبقوں میں
 اکثر ایسی بگیاں اور شریف زادوں سے ملنے کا اتفاق ہوتا تھا جو چار پانچ بیرونی زبانیں بول سکتی
 تھیں، موسیقی میں اچھی استعداد رکھتی تھیں اور فرانس، انگلستان اور اطالیہ کے
 سربراہان و ناول نویسوں کی تصانیف کا مطالعہ کر چکی تھیں۔ لیکن اس مطالعے کو
 ایسے علمی ذوق کی طرف منسوب کرنا مشکل ہے جو غور و فکر کی ترغیب دلاتا ہو۔۔۔

لے کلیوجن سکی: ”مضامین اور تقریریں“

لے پشگلین کا ذکر بعدی شاعروں کے سلسلے میں آگے آئے گا۔

۱۷۸۹-۱۷۹۱) انگریزی ناول نویس۔ ژان ژک روسو (۱۷۱۲-۱۷۷۸)
 ۱۷۷۸) فرانسیسی انشا پرداز۔

”عین اس وقت جب جذبات پرست اور شہوت انگیز نادلوں کا دور دورہ تھا، آزاد خیالی کے فلسفے کا اثر روسی سوسائٹی میں سرایت کرنے لگا یورپ کے کسی ملک میں یہ فلسفہ اپنی بڑی صورت میں اس طرح نہیں نظر آتا جیسے روس میں... ملکہ کیمٹرین (۱۶۶۲-۱۷۹۶) کی تخت نشینی کے وقت روس میں ایسے سمجھ دار اور خیر اندیش مدبر موجود تھے جو اصلیت سے واقف تھے اور جانتے تھے کہ اس فلسفے سے ریاست، قانون اور عام زندگی کو کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے....

لیکن عام لوگوں میں یہ فلسفہ اس وجہ سے نہیں مرغوب ہوا کہ انھوں نے نئی زندگی تعمیر کرنے کے منصوبے باندھے تھے بلکہ اس وجہ سے کہ وہ انھیں اپنی قوم کی ذہنیت اور اپنے ماحول پر نکتہ چینی کرنے میں مدد دیتا اور نکتہ چینی میں چٹ پٹاں پیدا کر دیتا تھا۔ روس کے جدید ترین طرز پر تعلیم پائے ہوئے طبقوں نے نکتہ چینی کا وہ انداز جو یہ فلسفہ سکھاتا تھا بہت شوق سے اور بہت جلدی اختیار کر لیا، خصوصاً اس وجہ سے کہ حسب حال ہونے کے علاوہ اس میں نمک مرچ بہت تھا۔ رات کے پتنگوں اور پردانوں کی طرح ان کی غور و فکر سے نا آشنا طبیعتیں اس زمانے کے شوخ اور مبیاک ذہنی رہبروں کے مقولوں پر اندھا دھند ٹوٹ پڑیں

لے آزاد خیالی کے فلسفے سے وہ تعلیم مراد جس کی فرانس میں اٹھارھویں صدی میں بہت تبلیغ کی گئی اور جس کا نصب العین انسانی ذہنیت کو چھالت، تعصب اور مذہب کے آغوش میں پرورش پائے ہوئے ادہام سے آزاد کرنا تھا، بالکل (۱۶۴۷-۱۷۰۶) دویلیر (۱۶۹۴-۱۷۷۸) روسو (۱۷۱۲-۱۷۷۸) دی دے رو (۱۷۱۳-۱۷۸۴) اور ولیم بر (۱۷۱۷-۱۷۸۳) وغیرہ اس کے مبلغ تھے۔

اور ان کی عقل سلیم کا وہ حصہ جو عشقیہ نظموں اور ناولوں سے بچ رہا تھا ان مقبول کی آگ نے جلا کر غارت کر دیا۔ ”اس تباہی کا الزام دراصل اس تعلیم اور فلسفہ حیات پر نہیں لگایا جاسکتا جو اس کا باعث ہوا، کیونکہ وہ روسی جن کی عقل سلیم تباہ ہوئی حقیقت میں اس کے متعلق بہت سطحی اور اکثر غلط معلومات رکھتے تھے۔“ ڈراما نویس فون وی زین کا بیان ہے کہ اس زمانے میں نوجوانوں نے حلقے قائم کیے تھے جن کی غرض فلسفیانہ بحث مباحثہ تھی، لیکن مذہب کی توہین اور مقدس چیزوں کی بے آبروی کرنے کے سوا ان فلسفیوں کا اور کوئی شغل نہ تھا۔ دول تیر کے اکثر روسی پیر و جنوں نے اس کے بارے میں محض انواہیں سنی تھیں اسے احکا د کا مبلغ سمجھتے تھے اور روس کی تصانیف سے انھوں نے صرف اتنا سیکھا تھا کہ عقل مذہبی کا اصل جبر علم کے فریب سے بچا رہنا ہے۔ یوں آزاد خیالی کے فلسفے نے اس لہ کلیو جف سکی، ”مضامین اور تقریریں“

۲۷ فرانس کا مشہور دانش پر دار (۱۷۷۸-۱۷۹۴) مذہبی رد و داری کا حامی، تعصب کا ڈن طنز میں بکتا تھا۔

۲۸ حالانکہ دول تیر کا مقولہ ہے کہ اگر خدا نہ بھی ہوتا تو ہمیں کوئی نہ کوئی بنانا پڑتا۔

۲۹ روس نے ۱۷۹۲ میں ایک رسالہ لکھا جس میں اس نے ثابت کیا تھا کہ علوم اور فنون انسان کے اخلاقی تنزل کا سبب ہوتے ہیں۔ اس کا خیال تھا کہ یورپ کی قوموں کو وہ سادہ اور فطری طرز معاشرت اختیار کر لینا چاہیے جو قدیم یونان اور روم میں رائج تھا۔

اس کے ناول ”نرولی“ یا ”نئی اے نوآد“ نے، جس میں اس نے ایسی زندگی کی نہایت دل ربا تصویر کھینچی ہے، فرانسیسی ذہنیت میں ایک انقلاب پیدا کر دیا۔ جیسا کہ دول تیر نے طنزاً کہا ہے ”اُسے پڑھ کر چاروں ہاتھ پیر پر چلے کوچی چاہتا ہے“

اس جہالت اور ذہنی جمود کو جو روس میں پہلے سے موجود تھا حق بجانب کر دکھایا اور اسے تقویت پہنچائی۔^{۱۵} نئے خیالات نے روسی سوسائٹی کی کوئی ذہنی باریکائی حاجت نہیں پوری کی، ان سے لوگوں کو ایسی ہی دلچسپی تھی جیسی غیبت کرنے اور سننے، یا شہوت انگیز ناولوں کی تصویریں دیکھنے سے ہوتی،^{۱۶} فلسفیانہ تفحیک نے دل تیر کے روسی پیرد کو ہر سماجی اور اخلاقی پابندی سے آزاد کر دیا، پولیس دالے کے سوا اسے اور کسی کا خوف نہیں رہا، جمانی تکلیف کے سوا اس کے دل میں اور کسی قسم کا درد محسوس کرنے کی صلاحیت نہیں رہی۔^{۱۷} روسی ذہنیت جس میں یورپ کے بصیرت افروز اثرات نے یہ کیفیت پیدا کر دی تھی، حقیقت میں یورپ کی تہذیب نہیں حاصل کر رہی تھی بلکہ ایک مسالہ دار اور ثقیل غذا اختیار کرنے سے جس کی وہ عادی نہیں تھی اپنے آپ کو بیمار کر رہی تھی۔ اسی دوا نے جو کسی زمانے میں اس کی صحت کی اصلاح کے لیے تجویز کی گئی تھی روسی قوم کے پُرانے امراض اور ابھار دیے اور اب صرف اس کی بیماریوں کا علاج نہیں کرنا تھا، بلکہ خود دوا کا^{۱۸}

ملکہ کیتھرین دوم (۱۷۶۲-۱۷۹۶) روسی روشن خیالی کے اس پہلو سے آگاہ تھی۔ اس کا اپنا فلسفہ حیات بھی اسی تعلیم پر مبنی تھا جس کی شعاں مغرب سے ہر طرف پھیل رہی تھیں۔ اپنی ذہنی اور اخلاقی لباط کے مطابق اس نے ذاتی طور پر اصلاح کی کوشش کی، مگر اس کی زندگی کا طریقہ ایسا تھا کہ اس کی سہنائی

لہ کلیر جف سکی: ”مغایین اور تقریریں“

سے کسی کو فائدہ نہیں پہنچ سکتا تھا۔ اس کے عہد کے مدبروں میں بھی اس قدر حس تھا کہ قومی زندگی کے دھبوں کو مٹانے کی فکر کریں اور انھوں نے قوم کو تعلیم کی رغبت دلانے اور درسگاہیں قائم کرنے میں بہت سرگرمیاں دکھائیں۔ لیکن وہ دہم اور غلط فہمیوں میں مبتلا ہو گئے۔ انھوں نے درسگاہیں قائم کیں جن میں نہ استاد تھے نہ طالب علم اور نہ ان کے لیے درسی کتابیں فراہم کی جاسکتی تھیں مگر یہ سارا ہتیا بھی ہو گیا تو تعلیم یافتہ لوگوں کو پھر وہی ذہنیت جس سے انھیں آزاد کرنا مقصود تھا اختیار کر لینے سے روکنے کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ یوں ریاست کی ساری اصلاحی کوششیں ناکام رہیں، لیکن خود تعلیم یافتہ روسی طبقوں میں دو چار ایسے لوگ پیدا ہو گئے جنھیں ذہنیت کے عام رجحان میں سبک سری اور بد مذاقی نظر آتی تھی اور اس امید میں کہ تضحیک سے گمراہوں کی آنکھیں کھل جائیں گی اور وہ اپنی حاکمتوں سے باز آئیں گے انھوں نے طنز اور تضحیک کو اصلاح کا آلہ بنایا۔ پہلی ترکی جنگ کے زمانے میں (۱۶۶۹-۱۶۷۴) اس قسم کے انشا پردازوں نے بہت زور دکھایا۔ ان میں سب سے زیادہ جوشیلا ایک نوجوان سابق فوجی کپتان نووی کوف تھا، جس کے تین رسالے ”سحدی“ ”مصور“ اور ”تھیلی“ اس وقت

کی انشا پردازی کے کارنامے مانے جاتے ہیں۔

(نی کولائی اور نووچ نوویکوف (۱۶۴۴-۱۸۱۶) تبلیغ کے کام کے لیے فطرتاً نہایت موزوں تھا اور اس کے رسالوں میں جوش کے ساتھ حقیقت بینی اور حقیقت نگاری کا وہ مادہ پایا جاتا ہے جس سے روسی انشا پردازی اس وقت تک نا آشنا تھی اور جو بعد کو اس کا مایہ ناز بن گیا۔ نووی کوف کے تیروں کا ہدف فرانس کی

تقلید کا ضبط تھا اور قوم کی اس حماقت کو واضح کرنے اور اس پر لعنت ملامت کرنے میں اس نے کوئی دقیقہ باقی نہیں رکھا۔ لیکن وہ خرابی جسے نوویکوف دور کرنا چاہتا تھا اخلاقی کمزوری یا خالص بد اخلاقی نہیں تھی، بلکہ ایک طرح کی دل کی بیماری اور بیماریوں کا علاج ہوتا ہے، مذاق نہیں اڑایا جاتا۔ روسیوں نے یورپی تہذیب اس بے ڈھنگے پن سے اختیار کی تھی کہ ان کی ذہنیت کو فروغ دینے کی بجائے اس نے ان کی نگاہ دھندلی کر دی۔ اور چونکہ وہ اپنی اصلیت سے ناواقف تھے اور اپنے آپ سے بیگانہ، اس ناواقفیت اور بیگانگی نے انھیں اپنی اصلیت سے بے پروا کر دیا اور بتدریج یہ بے پروائی نفرت اور تحقیر میں منتقل ہو گئی۔

فون دیزن کے کیرکٹر اور انوشکا کی طرح روسی اس پرافس کرنے لگے کہ وہ روسی تھے اور انھیں صرف اس بات سے تسکین حاصل ہوتی تھی کہ ”گو ان کے جسم روس میں پیدا ہوئے ان کی روح شاہ فرانس کی تابعدار ہے“ ایسی ذہنیت کا علاج تفحیک سے نہیں ہو سکتا اور خود نوویکوف نے بھی اسے محسوس کیا۔

”مصور“ میں اس نے ایک مضمون شائع کیا جس میں ایک مصنف اور اس کے ناظرین میں گفتگو ہوتی ہے اور ایک ناظر مصنف سے کہتا ہے: ”آپ کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ جس وقت آپ سیرا مذاق اڑاتے ہیں میں خود بھی آپ کے ساتھ ہنسی میں شریک ہوتا ہوں“ یعنی مصنف کچھ بھی لکھے، پڑھنے والے پر اس کا اثر نہیں ہوتا، اگر ہوتا تو ہنسنے کے بجائے وہ خفا ہوتا یا اپنی غلطیوں پر نادم اور شرمندہ۔ کچھ اس ناکامی کے احساس، کچھ ریاست کی مخالفت نے

لے فون دیزن اور اس کی تصانیف کا ذکر روسی ڈراما کے تحت میں آئے گا۔

(نوڈیکوف) کو یقین دلادیا کہ اس کا طرز عمل صحیح نہیں اور اس نے اپنا طریقہ بدل دیا۔ رسالوں اور مضامین کے ذریعے سے اس نے تعلیم یافتہ لوگوں میں نام پیدا کر لیا تھا۔ ۱۷۹۹ء میں وہ ماسکو آیا اور وہاں کے دارالعلوم کا چھاپہ خانہ دس سال کے لیے ٹھیکے پر لے کر کتابوں کی ایک دکان کھولی اور کتابوں کی اشاعت شروع کر دی۔ ان ادنیٰ شہوت انگیز اور اخلاق کو برباد کرنے والے ناولوں کے مقابلے میں جو ڈھیروں فرانس اور انگلستان سے منگائے جاتے تھے اس نے انھیں ممالک کے ادب کے بہترین نمونے تعلیم یافتہ روسیوں کے مطالعے کے لیے ترجمہ کرائے اور اسی کے ساتھ درسی کتابوں کا ایک بہت بڑا ذخیرہ روسی درسگاہوں کے واسطے تیار کر دیا۔ چھاپے خانے کا ٹھیکہ لینے کے سات سال کے اندر اس نے تین سو چھیاسٹھ اخلاقی ادبی اور درسی کتابیں شایع کیں۔ کتب فروشی سے اسے اتنی ہی آمدنی ہوتی تھی جتنی ماسکو کے بڑے بڑے دکانداروں کو، اور ان لوگوں کا جو اس زمانے میں تھے اور خود نوڈیکوف سے واقف تھے یہ بیان ہو کہ اس نے علم کی محبت اور مطالعے کا شوق صرف پھیلا یا نہیں بلکہ اسے پیدا کیا: اس کا کاروبار اس قدر وسیع تھا اور کام اس سلیقے سے کیا جاتا تھا کہ اس کی کتابیں صرف یورپی روس کے دُور افتادہ گائوں میں ہی نہیں بلکہ سائبریا تک پہنچنے لگیں اور لوگوں نے انھیں پڑھنا شروع کر دیا۔۔۔ ٹھیکے کے دس سال میں نوڈیکوف کی اشاعت کتب اور کتب فروشی کی جدوجہد نے روسی سوسائٹی میں نئی معلومات، مذاق، نئے احساسات پیدا کر دیے، منتشر خیالات کو ہم آہنگ بنایا اور مختلف مذاق کے ناظرین کو ایک متعلیٰ مقام

سے شوق رکھنے والی جماعت کی شکل دے دی۔ اس شوق کو پورا کرنے کے لیے مترجموں، مؤلفوں، چھاپے خانوں اور کتب فروشوں نے جو سرگرمیاں دکھائیں، کتابوں، رسالوں اور اخباروں کے ذریعے سے روسیوں کے ذہن میں جو تحریک ہوئی ”ان سب کا نتیجہ ایک چیز ہوئی جو ابھی تک روس میں ناپید تھی: عام رائے“ اسنوس ہر ملکہ کیتھرین دوم ان خدمات کی قدر نہ کر سکی اور اس خوف سے کہ کہیں نووکیوف کے کاروبار کا انجام انقلابی خیالات کا پرچار نہ ہو، اس نے نووکیوف کو ۱۷۹۲ء میں قید کر کے اس کا سارا کام برباد کر دیا۔ لیکن نووکیوف اس وقت تک اپنا مطلب حاصل کر چکا تھا اور روس کی ذہنی اور ادبی خودداری کی بنیاد اس قدر مستحکم ہو گئی تھی کہ بیرونی اثرات کے مہلک ثابت ہونے کا بہت زیادہ خطرہ نہیں رہا تھا۔

(فون ویزن کے ڈراموں اور نووکیوف کی شخصیت کے علاوہ ایک سائزر نکولایوچ رادچیف (۱۷۴۹ء-۱۸۰۲ء) کا ناول ”پیتر برگ اور ماسکو کا سفر“ جو ۱۷۹۰ء میں لکھا گیا اس کی دلیل ہے کہ روس میں خودی کا احساس پیدا ہو رہا تھا اور ایک خاص رنگ بھی بکڑ رہا تھا۔ رادچیف نووکیوف کی طرح رئیس خاندان کا تھا اور اس نے بھی پیتر برگ کے کیڈٹ کالج میں تعلیم پائی تھی۔ یہاں سے فارغ ہو کر وہ جرمنی گیا اور وہاں جرمن اور فرانسیسی فلسفیوں کا مطالعہ کیا۔ اس مطالعے کا نتیجہ اس کا ناول تھا، جس میں اس نے بڑی بے ترتیبی سے اپنی معلومات، احساسات اور فلسفیانہ سماجی اور معاشی نظریوں کو یک جا کر کے انھیں ناول کی لہ کلیوچسکی، ”مضامین اور تقریریں“

پوشاک پہنا دی۔ اس ناول میں کوئی ادبی یا فنی صفت نہیں، اس کا فلسفہ بھی ادنیٰ اور اکثر اپنا نہیں پرایا ہے۔ لیکن رادشچف کی جڑائی کرنے والے بھی اس سے انکار نہیں کرتے کہ اس میں ایک درد، مظلوموں سے ہمدردی اور قوم کی محبت ظاہر ہوتی ہے جس کا اس سے پہلے روسی ادب میں نام و نشان تک نہیں ملتا اور جس کا مقابلہ بعد کے مصنف بھی مشکل سے کر سکیں گے۔

اس زمانے کی ذہنی بیداری کا دوسرا پہلو نیکولائی میخائلوویچ کا رامزن کی تصانیف ہیں۔ کارامزن صوبہ سارا کا ایک خوش حال زمیندار تھا جس نے اچھی تعلیم پائی تھی۔ ۱۸۵۰ء میں وہ اس حلقے میں شامل ہو گیا جسے نوویکوف نے ماسکو میں قائم کیا تھا۔ ان لوگوں کی صحبت نے اس کے دل کو بھی دلولوں اور حوصلوں سے بھر دیا۔ ۱۸۹۰ء میں اس نے یورپ کا سفر کیا اور وہاں سے اس نے روسی رسالوں میں خطوط بھیجے جن میں یورپ کے علمی اور ادبی مشاہیر کے حالات زندگی اور یورپ کی مشہور درسگاہوں اور دارالعلوم کا مفصل بیان تھا، ان خطوط کا اصل مقصد یورپ کی ذہنی اور علمی ترقی کی دلفریب تصویر دکھانے اور روسیوں کو عبرت دلانا تھا، مگر کارامزن کی شخصیت ابھی تک پختہ نہیں تھی اور اس کے خیالات نے کوئی معین شکل نہیں اختیار کی تھی، اس لیے وہ اکثر مغالطوں میں مبتلا ہو گیا اور یورپی تصویلات کی صحیح ترجمانی نہ کر سکا، لیکن خطوط کی اصل خوبی ان کی سادہ سلیجی ہوئی زبان ہے جس سے قدیم سلاف کے ثقیل الفاظ بالکل دور کر دیے گئے ہیں اور سینکڑوں نئے الفاظ اور محاورے اس صفائی سے کھپا دیے گئے ہیں کہ کسی جدت کا شبہ نہیں ہوتا اور جس میں ایک

ایسی ہم آہنگی اور ترنم ہے جو نثر میں نظم کی شان پیدا کر دیتا ہے۔ عمر کے ساتھ کارامزن کا ذہن بختہ ہو گیا، اس کے خیالات میں نہ پیچیدگی رہی نہ تلون اور وہ بلاغت اور فصاحت جس نے ”خطوط“ میں اپنی جھلک دکھائی تھی روسی نثر کی ایک گراں بہاد دولت بن گئی۔

یورپ سے واپس آ کر کارامزن نے دو تاریخی ناول لکھے ”غریب لی زا“ اور ”نتالیا، نواب زادہ“ جو روس میں روحانی اثرات کا پیش خیمہ تھے۔ ان ناولوں میں کارامزن نے گزشتہ روسی زندگی کا عکس اُتار دیا، مگر اپنے عقیدے اور خیال کے مطابق اس کے کیرکٹر دیہاتی زندگی اور روسی مناظر قدرت کے شیدائی ہیں، دولت اور عیش و آرام کو حقیر اور ذلیل سمجھتے ہیں اور ان کا سب سے عزیز جو صلہ کار خیر کے ذریعے سے دائمی شہرت حاصل کرنا ہے۔ واقعتاً دیکھے جائیں تو یہ تصویریں جھوٹی ہیں اور کیرکٹروں کی یہ ذہنیت اور آرزوئیں مصنف کی مریخی ایجادیں جن کا حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں۔ لیکن اس زمانے میں کسی نے ناولوں کے اس عیب پر غور نہیں کیا، سب ان کی زبان کی نفاست اور داستان کی دل آویزی پر آفریں کہتے تھے۔ کارامزن نے یہ ناول لکھ کر روسی قوم پر واقعی بہت بڑا احسان کیا، کیونکہ ان کی وجہ سے روسی اپنی زندگی کی طرف متوجہ ہوئے اور ان کی نظروں سے وہ پردہ اُٹھ گیا جو ادنیٰ پرپلا ناولوں نے ڈال دیا تھا۔ ”غریب لی زا“ کی ہیروئن ایسی فیسح زبان بولتی ہے جو اس وقت کارامزن کے سوا کوئی لکھ بھی نہیں سکتا تھا، مگر وہ ایک غریب کنہ کی لڑکی تھی جو کسی رئیس زمیندار پر عاشق ہو گئی تھی، زمیندار نے اس کے جذبے کا

احترام نہیں کیا اور اپنی بے غرتی کا داغ مٹانے کے لیے وہ ایک جھیل میں ڈوب کر مر گئی۔ اس کی داستان کا لوگوں کے دلوں پر بہت گہرا اثر ہوا اور غریب لی زاکہ کے طفیل میں وہ روس کے ان بکس اور مظلوم کسانوں سے ہمدردی کرنے لگے جنہیں وہ پہلے حیوانوں سے بھی بدتر سمجھتے تھے۔

ناول لکھنے کے بعد کارامزن نے عمر کا بقیہ حصہ روس کی تاریخ تصنیف کرنے کے لیے وقف کر دیا اور اس کی "تاریخ روس" کی بارہ جلدیں ہی اس کا کارنامہ ہیں۔ قومی زندگی کی تدریجی تعمیر میں اس نے ماسکو کے بادشاہوں کو سچا اہمیت دی ہے اور خود قوم کی کوششوں کو بہت نظر انداز کیا ہے، وہ بادشاہوں اور مدبروں کی تدبیروں میں الجھا رہتا ہے اور ان قومی اداروں کا ذکر بھی نہیں کرتا جو دراصل قدیم ملکی نظام کی جان تھے۔ بعد کے مورخوں نے اس کی تصنیف میں اسی قسم کی بہت سی غلطیاں اور خامیاں نکالی ہیں جن کی وجہ سے وہ اب مستند نہیں قرار دی جاسکتی، لیکن جو خدمات اس تصنیف نے انجام دیں وہ بے شمار ہیں۔ گزشتہ زندگی کی یادگار اس نے ایسی شکل میں پیش کی اور اسے اتنا شاندار اور بہت افزا بنا کر دکھایا کہ وہ قومی خودداری کا سنگ بنیاد بن گئی، اس نے روسیوں میں قومی نشوونما اور ریاست کو فروغ دینے کا حوصلہ پیدا کیا اور قومیت کے احساس کو اسی قدر تقویت پہنچائی جتنی اس خون نے جو روسی وطن پرستوں نے اپنے ملک کو نپولین کے پنجے سے بچانے کے لیے بہایا تھا۔

اس دور کی نثر سے جب ہم نظم کی طرف رخ کرتے ہیں تو کسی قدر مایوسی ہوتی ہے، جزاؤں میں ایچ ہر، مگر اس کے خیال میں شوخی اور بلند پروازی نہیں

ژوکوفسکی کا درجہ فن کے اعتبار سے بہت بلند ہو مگر اس میں بدیع انجیالی نہیں اور اس کی کوششیں زیادہ ترجموں پر صرف ہوتیں۔ یہ دونوں شاعر محض نخبہ ہیں ایک نئے دور کے جو شروع ہونے والا تھا۔

گٹ رٹنی رومانوفچ جرزاون (۱۷۴۳-۱۸۱۶) صوبہ کازان کے ایک مغلوک احوال رئیس زادے کا لڑکا تھا۔ اس کا شروع بچپن شہر اورن برگ میں گزرا، اس کے باپ کے انتقال پر اس کی ماں کازان آئی اور وہاں جرزاون ایک مدرسہ اعلیٰ میں جو اسی زمانے میں کھلا تھا داخل کر دیا گیا۔ سولہ برس کی عمر میں، قبل اس کے کہ وہ اپنی تعلیم ختم کر سکے جرزاون فوج میں بھرتی کر لیا گیا اور وہ دس سال جو اس نے فوجی ملازمت میں گزارے اس کی زندگی کا سب سے تاریک حصہ ہیں۔ اس کی صحبت نہایت ذلیل تھی اور جو کام اس کے سپرد تھا وہ صرف مشکل نہیں بلکہ غیر دلچسپ تھا۔ سب سے زیادہ تکلیف اسے اس کی تھی کہ وہ اپنا علمی اور ادبی شوق پورا نہ کر سکا، لیکن باوجود تمام دشواریوں کے جرزاون نے راتوں کو جاگ کر عرض پر کتابیں پڑھیں اور لومونوسوف کی نظموں کا بہت غور سے مطالعہ کیا، کیونکہ اس زمانے میں وہی استاد مانا جاتا تھا۔ مطالعے کے علاوہ وہ خود شعر کہنے کی بھی مشق کرتا رہا اور ۱۷۷۰ء میں جب اسے افسر کا عہدہ ملا اور پتیر برگ میں رہنے کی اجازت حاصل ہو گئی، تو وہ بہت جلد مشہور ہو گیا اور اس کا کلام اس قدر پسند کیا گیا کہ سب اسے صدی کا سب سے اعلیٰ شاعر ماننے لگے۔

”فے لیٹ سا“ جرزاون کی پہلی نظم تھی جس نے لوگوں کو اس کی طرف متوجہ کیا

اس نظم میں اس نے ملکہ کیتھرین دوم کی مسح کی ہر اور اس موقع کو اس کے درباریوں کی قلعی کھولنے کے لیے نہایت مناسب طور پر استعمال کیا ہے۔ چنانچہ ”نئے لیٹ سا“ کی تعریف کرنے کے بعد اس کا عاشق (جس سے ایک خاص رئیس مراد ہے جو ملکہ کیتھرین کی نظر التفات سے بہت بیجا فائدہ اٹھاتا تھا) اپنے بارے میں کہتا ہے:

”نئے لیٹ سا ایسی ہے، میں ایک عیاش ہوں،

لیکن ساری دنیا میری ہی حبیبی ہے،

علم و دانش نے اسے چاہے جتنا مشہور کر دیا ہو،

ہر انسان حقیقت میں محض دھوکا ہے۔

ہم دنیا میں راہِ راست پر چلنا نہیں جانتے،

بدستی میں ادھام کے پیچھے دوڑتے ہیں۔

خوشامد اور شکایت، غرور اور بدکاری۔

ان ویرانوں میں بھلا کسی کو

اتفاق سے بھی سیدھا راستہ مل جاتا ہے؟

صرف تجھے، اے ملکہ، یہ فخر حاصل ہے۔

کہ تاریکی میں روشنی پیدا کرے،

بدنظمی میں نظام قائم کرے،

اس نظام کو استحکام عطا کرے،

اور انسان کے حیوانی جذبات کو

اس کی مسرت کا سامان بنائے۔

اس نظم کا لوگوں پر بہت مختلف اثر ہوا جنہیں دربار سے کوئی واسطہ نہیں تھا انہوں نے اس کی بہت تعریف کی، جن درباریوں کو اندیشہ ہوا کہ ان کی پردہ دری کی گئی ہو بہت خفا ہوئے اور انہوں نے جرزاؤن پر یہ الزام لگایا کہ اس نے ایک انسان کو خدائی کامرتبہ دے کر خدا کے حق میں بے ادبی کی ہو۔ مگر ملکہ کیتھرین کو یہ نظم بہت پسند آئی، جرزاؤن کا دربار میں رسوخ ہو گیا اور وہ ملکہ کے خاص دوستوں میں شمار ہونے لگا۔

جرزاؤن کی نگلیں عموماً محاصرہ شخصیتوں اور کارناموں کے متعلق ہیں۔ اکثر شاعر جن کا دربار یا امیروں کی صحبتوں میں رسوخ ہوتا ہو مدح سرائی کو اپنا پیشہ بنالیتے ہیں اور سچ اور جھوٹ میں مطلق تمیز نہیں کرتے۔ جرزاؤن میں یہ کمزوری نہیں تھی۔ ملکہ کیتھرین کے سوا اس نے کسی کی ذات کی بجا یا مبالغہ آمیز مدح نہیں کی اور ملکہ کی تعریف کو بھی اس نے درباریوں کی جھوٹے بے ایک آڑ بنایا، جیسا کہ اس کی نظم ”فے لیٹ سا“ سے ظاہر ہوتا ہو۔ اور ملکہ یا کسی اور شخصیت کی اس نے اگر تعریف بھی کی تو کسی ذاتی غرض سے نہیں بلکہ اس امید میں کہ اس سے روس میں قومیت کا احساس بڑھے گا اور قوم کے خادموں کے حوصلے بلند ہوں گے۔ سو ووروف ایک ہنایت قابل اور کامیاب روسی جنرل تھا جس نے جنولین کے کئی افسروں کو شکست دی اور پولستان کے دارالسلطنت وارسا کو فرانسیسیوں کے قبضے سے چھینا۔ اس کی تعریف میں جرزاؤن لکھتا ہو:

”رات کے بھونچال کی طرح جواں مرد چلا جاتا ہو!

اس کا سایہ تاریکی پھیلاتا ہے، اس کی لٹکار سے آسمان پر غبار چھا جاتا ہے۔
اس کی نظر بجلی کی طرح سامنے چمک چمک کر اس کا راستہ روشن کرتی ہے،
اس کے پیچھے اونچے شاہ یلوط کے درخت زمین بوس ہوتے ہیں۔

وہ جہاز میں بیٹھا تو سمندر ابل پڑتا ہے،
پہاڑوں پر چڑھا تو وہ کانپ جاتے ہیں،
شہر بنا ہیں اس کے چھونے سے گر پڑتی ہیں،
قلعوں کو وہ اڑا کر بادلوں میں غائب کر دیتا ہے،
دنیا اس کی عظمت سے لرزتی ہے،

کمزور اور بے بس مخلوق کا اس سے بہتر کوئی محافظ نہیں۔“
سو دور و ف کی مدح میں جزاؤں نے مبالغہ تو بہت کیا ہے، لیکن اس
کا اصل مقصد اپنے ملک کا جاہ و جلال دکھانا، روسی دلوں میں ادب و الغری پیدا
کرنا ہے۔ سو دور و ف کی تعریف اس وجہ سے کی گئی کہ وہ وارسا کا فاتح تھا، نظم
کا عنوان بھی ”وارسا کی فتح“ ہے۔ اس کے مقابلے میں حیرانوں کی نظم ”بادشاہ“
کے چند شعر ملاحظہ ہوں۔ اس کی نیت پر اس کے بعد کوئی شک باقی نہ رہنا
چاہیے۔

”ایک بت، نام بُرائیوں سے لپا ہوا،
عوام کے حقیر تصور دں پر جادو کر دیتا ہے۔
لیکن اگر کوئی صاحب نظر اس کی طرف آنکھ اٹھائے،
تو اس کی ساری خوبیاں غائب ہو جاتی ہیں۔“

یہ نظر کو دھوکا دینے والی صورتیں ہیں،
 مٹی کی مورتیں جن پر سونا پھرا ہے!
 اے روح کے فیض سے نا آشنا بادشاہو،
 کیا تم ان مورتوں میں اپنی شکلیں نہیں پہچانتے ہو؟
 گدھا ہمیشہ گدھا رہتا ہے،
 چاہے اس کی پٹھ پر ستارے جڑ دیے جائیں،
 جہاں اسے اپنی عقل سے کام لینا چاہیے،
 وہ صرف اپنے کان ہلاتا ہی۔۔۔
 ہاں، قدرت کا ہاتھ معقداروں کا حق دینے میں
 ہمیشہ کوتاہی کرتا آیا ہے؛

جرثاؤں کی شاعری کے متعلق روسی نقادوں میں بہت اختلاف رہا
 ہے، بعض اے لومونوسوف سے کم، بعض اٹھارھویں صدی کا سب سے ممتاز
 شاعر مانتے ہیں لیکن کی رائے ہے کہ وہ شاعر ہی نہیں تھا۔ جرثاؤں کا انتہائی
 شوق اور بلند حوصلہ دیکھتے ہوئے لیکن کے اس خیال میں کچھ نا انصافی ضرور
 محسوس ہوتی ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ وہ نازک احساسات جو ہر شاعر میں ہونا
 چاہیے اور خصوصاً اس میں جو قوم کی رہنمائی کرنا چاہتا ہو، جرثاؤں کو نہیں
 عطا ہوئے تھے۔ اس کی حیثیت اس استاد کی سی ہے جو اپنے شاگردوں میں صحیح
 مذاق پیدا کرنے کے لیے طبع آزمائی کرتا ہے اور ان کی اخلاقی تربیت کی غرض سے
 بزرگوں کے کارناموں کو ایک دلچسپ داستان کے پیرائے میں پیش کرتا ہے، لیکن

رہبری کے لیے ناموزوں اور اس نظر سے محروم ہے جو دوسروں کی آنکھوں میں بھی روشنی پیدا کر دیتی ہے۔

روسی مذاق کی رہنمائی اور نوا موز شاعروں کو ان کے فن میں تربیت دینے کی اہم خدمت دیتی تھی آن درے یوچ زوکوف سکی (۱۸۵۲-۱۸۸۳) نے انجام دی۔ اس کا اپنا کلام بہت کم ہے، لیکن اس نے ترجمے بہت کیے اور یہی حقیقت میں اس کے کارنامے ہیں۔ ان کے ذریعے سے اس نے روس کے اہل ذوق کو جرمن، انگریزی اور فرانسیسی شاعری کے بہترین کلام سے آشنا کر دیا اور ان کے سامنے نونے پیش کر دیے جو ایک صحیح ادبی معیار کا کام دے سکتے تھے۔ اس نے یونانی شاعر ہومر کی اوڈیسی، سنکرت کی داستان مل دھنتی اور فردوسی کے شاہ نامے سے سہراب اور رستم کے قصے کے جو ترجمے کیے وہ اصل زبان سے نہیں تھے بلکہ جرمن شاعر روکرٹ کے ترجمے سے اور یہ ان کا بہت بڑا نقص ہے؛ یورپی زبانیں وہ بہت اچھی طرح جانتا تھا اور یورپی شاعری کے کل ترجمے اس نے اصل سے کیے۔ ردیوں کا دعوے ہے کہ دنیا کی کوئی زبان ترجموں کے لیے اس قدر موزوں نہیں جتنی کہ روسی زبان اور زوکوف سکی کے ترجمے دیکھ کر اس دعوے میں شک کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ زوکوف سکی نے صرف خیالات صحت اور بے تکلفی سے نہیں ادا کیے ہیں، اس نے اپنے ترجموں میں وہی بھری رکھی ہیں جو اصل میں تھیں اور اکثر اگر لفظ بلفظ دیکھا جائے تو ترجمے اور اصل کے الفاظ موزوں پائے جائیں گے۔ فن کے اعتبار سے اس کے ترجمے روسی شاعری میں سد مانے جاتے ہیں،

اور یہ ایک شانِ ہر جو بہت کم ترجموں کو نصیب ہوئی ہوگی۔ نزدیک سبکی مترجم ہونے کی وجہ سے روس کے بڑے پائے کے شاعروں میں شامل نہیں کیا جاسکتا، لیکن اس نے فنِ شاعری کو اس درجہ کمال تک پہنچا دیا کہ اس کے ترجموں کو ہم اصل روسی شاعری کے پہلے دور کا آغاز قرار دے سکتے ہیں۔

روسی شاعری

پہلا باب

نُشکین

ادبی دنیا میں روس کا پہلا نمائندہ الکساندر سرگئی یوچنُشکین ۱۷۹۹ء میں پیدا ہوا۔ اُس کا خاندان بہت پُرانا تھا اور روسی تاریخ میں اکثر اس کا ذکر آتا ہے۔ نُشکین کی ماں پتیر غلام کے ایک حبشی غلام کی پوتی تھی اور اسی وجہ سے نُشکین کے چلے میں کسی قدر حبشی اثر نظر آتا ہے۔ شاعر کا بچپن فرانسیسی استادوں کی نگرانی میں گزرا جنہوں نے اسے آخر عمر تک اس غلط فہمی مبتلا رکھا کہ وہ فرانسیسی اپنی مادری زبان سے بہتر جانتا ہے۔ اعلیٰ تعلیم نُشکین نے پتیر برگ کے ایک مشہور کالج میں حاصل کی، لیکن وہ بہت نجما طالب علم تھا اور اس کے استادوں میں سے اکثر کی یہ رائے تھی کہ وہ کبھی کسی مصروف کا نہ ہوگا۔ استادوں کی اس رائے اور نُشکین کے ”نکچے پن“ کا سبب اس کا ادبی ذوق اور ادبی مشاغل تھے۔ اس نے پندرہ برس کی عمر سے رسالوں میں مختلف کلاسیکی شعرا کے ترجمے بھیجا شروع کر دیے، کالج میں ایک ادبی ادارہ قائم کیا اور ادارے کی طرف سے ایک رسالہ بھی جاری کیا جس میں زیادہ تر طالب علموں کے مضامین چھپتے تھے۔ یوں کالج سے نکلے ہی

نٹشکن روس کی ادبی دنیا کے طوفانی سمندر میں کود پڑا اور اپنے کلام اور طبیعت کی شوخی سے بہت جلد شہرت حاصل کر لی۔ ۱۸۱۸ میں اس نے اپنی پہلی ہی نظم ”روسلاں اور لودملا“ لکھی، لیکن نظم شایع ہونے سے قبل ہی وہ ایک فاش قصیدہ لکھنے کی سزا میں روس کے جنوبی صوبوں میں جلا وطن کر دیا گیا۔ سزایابی نے اس کی شہرت اور بڑھادی۔ اس کا قصیدہ ایسا نوحہ تھا کہ صرف اخلاقی ہی نہیں بلکہ ادبی نقطہ نظر سے بھی وہ سزا کا مستحق تھا، لیکن سب جانتے تھے کہ ریاست نے قصیدے کو محض ایک بہانہ بنایا ہے اور نٹشکن کی جلا وطنی کی اصل وجہ چند نظمیں تھیں جو اس نے آزادی کی مدح میں اور آزادی کا دلولہ پیدا کرنے کے لیے لکھی تھیں۔ جلا وطنی کے چار سالوں میں نٹشکن نے جنوبی صوبوں کی سیر کی اور اگر وہ اپنی ہمت اور قابلیت کی فضول نمائش میں وقت ضائع نہ کرتا تو ممکن ہے اس کی اس زمانے کی نظمیں بہت بہتر ہوتیں۔ مگر افسوس ہے وہ متانت اور ضبط نفس کی خوبیوں سے نا آشنا تھا، اس کے حسن پرستی کے شوق اور من چلنے پن کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ اس کا وقت زیادہ تر زبان اور قلم سے حسین عورتوں کی تعریف کرنے میں گزرتا تھا اور اس سے جو ذرا فرصت ملتی وہ رقیبوں سے لڑنے جھگڑنے میں صرف ہوتی۔ سنجیدہ مشاغل کے لیے بہت کم وقت بچتا تھا اور اس مٹوڑی سی مہلت میں بھی، جیسا کہ اس کے کلام سے ظاہر ہوتا ہے، اس کو اکثر نازیبا جذبات کا خمار پریشان رکھتا تھا۔ جلا وطنی کی مدت ختم نہیں ہوئی تھی کہ نٹشکن اپنے باپ کے ایک گانو میں نظر بند کر دیا گیا۔ اس کی حرکتوں نے جنوبی صوبوں کی پولیس کو حیران کر دیا تھا اور پولیس والے اس فکر میں تھے کہ کسی طرح اس سے بچھا چھڑائیں۔ محض شرارتوں کی شکایت

کرنا بے فائدہ تھا، مگر جب اپشکن پر انگریزی شاعر شیلی کی ایک نظم پڑھنے سے اتحاد کا غلبہ ہوا اور اس کا ایک خط پکڑا گیا، جس میں اس نے کسی دوست کو اپنی روحانی کیفیت کی اطلاع دی تھی تو اس کے خلاف کارروائی کرنے کا بہت اچھا جملہ مل گیا۔ اپشکن اپنے آبائی کانوینٹون سکویے بھیج دیا گیا اور اُسے جو ذرا گھونے پھرنے کی آزادی تھی وہ بھی چھین لی گئی۔ وہ یہیں محتاج ۱۸۶۵ میں زار نکولائی اول کی تخت نشینی کے موقع پر دیکارست سے بغاوت ہوئی، باغیوں میں سے اکثر شاعر کے گہرے دوست تھے، لیکن اتفاق سے اسے وقت پر خبر ہو گئی اور جب پولیس اس کے مکان اور کاغذات کی تلاشی لینے آئی تو اپشکن وہ کاغذات جن سے اس کا باغیوں سے تعلق ظاہر ہوتا تھا جلچکا تھا، ورنہ اس کی باقی عمر سائی بیریا کے کسی قید خانے میں گزرتی۔ ایک مرتبہ پنج نکلنے کے باوجود بھی اپشکن کو معتوب ہونے کا خوف رہا اور زار کی بدگمانی رفع کرنے کی غرض سے اس نے کئی نظموں میں زار کی مدح سرائی کی اور اپنی وفات شعاری کا خیرہ اعلان کیا۔ ایک سال کے اندر زار کو اس کی خیر خواہی اور وفات شعاری پر اتنا اعتماد ہو گیا کہ وہ پتیر برگ بلایا گیا اور اُسے مزید عذر خواہی اور قدم بوسی کے لیے خلوت میں باریابی عطا ہوئی۔ مگر زار کی یہ مہربانیاں کیا تھیں گو یا شاعر کو اور زیادہ قابو میں رکھنے کی ترکیبیں تھیں۔ نکولائی اول نے اپنے آپ کو اپشکن کا محتسب قرار دیا اور اسے اپنے قریب رکھنے کی غرض سے دربار میں ایک عہدے پر مامور کر دیا جو شاعر کی

لے شیلی (۱۷۹۲-۱۸۶۲) آزاد خیالی کا بہت جوشیلا مبلغ تھا۔

لے اس تحریک کا ذکر ”سیاسی تحریکوں اور تصانیف“ کی تحت میں آئے گا۔

عمر اور اس کا مذاق دیکھتے ہوئے بہت نامناسب تھا۔ بادشاہ کے احتساب اور درباریوں کی نفرت اور عداوت نے لشکن کو اس قدر عاجز اور ہزار کر دیا کہ وہ اپنی عقل کی سلامتی کے لیے دعائیں مانگنے لگا۔ ۱۸۳۱ میں لشکن نے ایک نوجوان لڑکی سے شادی کر لی جو حسین تھقی مگر ساتھ ہی فضول خرچ، سردہر اور کسی قدر آوارہ بھی تھی اور بیچارے شاعر کے سر بیوی کی خاطر داری کی اور مصیبت آن پڑی۔ ان سب باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ لشکن پتیر برگ آکر بجائے ادبی و محبوسوں میں محو ہونے کے ریشہ زندگی کے لغو مشاغل میں گرفتار ہو گیا، سینما ٹکوف سکوپے کی نظر بندی کے مقابلے میں پتیر برگ کے قیام کے دس گیارہ برس بہت کم بار آور ثابت ہوئے۔ آخری سالوں میں لشکن نے شاعری ترک کر کے نثری اختیار کر لی، کچھ اس وجہ سے کہ بیوی کے اخراجات برداشت کرنے کے لیے اس نے سرکاری مورخ کا عہدہ حاصل کر لیا تھا اور اس سلسلے میں اس نے جو تھوڑا بہت مطالعہ کیا اس سے تاریخی مضامین لکھنے کا شوق پیدا ہو گیا، کچھ اس وجہ سے کہ اس کی پابندیاں ایسی ہو گئی تھیں کہ شاعری کا حوصلہ کرنا ہی بے کار سا ہو گیا تھا ۱۸۳۷ میں اسے اپنی بیوی کی آبرو بچانے کے لیے ایک ڈیوئل لڑنا پڑا۔ اور اسی میں وہ ایسا زخمی ہوا کہ چند روز بعد دنیا سے رخصت ہو گیا۔

لشکن نے شروع شروع میں جو ترجمے کیے اور نظمیں لکھیں وہ بھی اپنے

لے یورپ میں پچھلی صدی تک شرفا کی یہ رسم تھی کہ جس معاملے کا وہ قانوناً تصفیہ کرنا چاہیں اسے ایک دوسرے سے لڑکر طو کر لیں۔ ان لڑائیوں میں سے اکثر کا انجام ایک فریق کی موت ہوا کرتی تھی۔

زمانے کے معیار کے مطابق بہت اعلیٰ تھیں، لیکن اس کی پہلی تصنیف جو اس وقت بھی قابلِ قدر سمجھی جاسکتی ہے اس کی داستان ”روسلاں اور لودملا“ ہے۔ کرلیوف کی کہانیوں کے بعد یہ پہلی نظم تھی جس میں مروجہ طرز کے برخلاف انتہائی سادگی اختیار کی گئی تھی اور ہر قسم کے تصنع اور رسمی اصطلاحوں اور استعاروں سے قطعی پرہیز کیا گیا تھا۔ قدیم طرز کے پیروا سے پڑھ کر بہت برہم ہوئے، لیکن مخالفت اور اعتراضوں کے باوجود ”روسلاں اور لودملا“ نہایت مقبول ہوئی۔ اس کی اشاعت کے ساتھ روسی شاعری میں ایک نیا طرز جاری ہو گیا اور پُرانے کلاسیکی شاعروں کی نقل کرنے کا قاعدہ بالکل ترک کر دیا گیا۔ اس تاریخی اہمیت کے علاوہ ”روسلاں اور لودملا“ کی تعریف میں کچھ اور نہیں کہا جاسکتا۔ ۱۸۲۸ء میں لنکن نے اصل نظم میں ایک تہید کا اضافہ کر دیا جس کا مقصد داستان کی ظلمی فضا کی ایک جھلک دکھانا ہے اور اس وقت جو خاص خوبی نظم میں نظر آتی ہے وہ اسی مختصر سی تہید کی وجہ سے ہے۔ جلاوطنی کے زمانے میں لنکن انگریزی شاعر ہائرٹن کا گرویدہ رہا اور اسی کے انداز میں ایک مہی نظم ”قفقاز کا قیدی“ لکھی، جس میں ایک روسی قیدی کی سرد مہری اور ایک لڑکی کے اس پر عاشق ہوجانے اور اسے آزاد کر کے خود کشی کر لینے کا قصہ ہے۔ ”قفقاز کے قیدی“ کے علاوہ لنکن نے بہت سی مختصر نظموں میں بھی ہائرٹن کی نقل کی، لیکن دونوں شاعروں کی

لے جورج گورڈن نول، لارڈ ہائرٹن (۱۷۸۸-۱۸۲۴) بے باک سن چھپن کا ناخو
اور آزادی کا خدائی، انیسویں صدی کے شروع میں صرف انگلستان میں نہیں بلکہ یورپ
کے اکثر ملکوں میں اس کا بہت اثر تھا۔

سیرت اور ذہنی رجحان میں اتنا اختلاف تھا کہ لٹکن پر بائرن کا رنگ زیادہ عرصے تک قائم نہ رہ سکا یہ اس کی نظم ”نٹ“ میں صاف ظاہر ہوتا ہے، جہاں اس نے روسی نفسیات پر پہلی مرتبہ بحث کی۔

”نٹ“ کا ہیرو اے کو بائرن کے مشہور کیرکٹر چائلڈ ہیرو لڈ سے کچھ سطحی نہایت

رکھتا ہے، لیکن دراصل وہ روسی زندگی کا ایک منظر ہے جسے بائرن کی شاعری اور تخیل سے کوئی واسطہ نہیں۔ مشہور ناول نویس دستہ نٹ کی کا خیال ہے کہ اے کو اس سیرت اور مزاج کے لوگوں کا ایک مثالی نمونہ ہے جنہیں اس زمانے کی سوسائٹی کی ذہنی اور روحانی بیماری کی علامت سمجھنا چاہیے۔ تعلیم یافتہ روسیوں نے اس کے نزدیک یورپی طرز معاشرت اور فلسفہ حیات اختیار کرنے سے اپنے آپ کو قوم کے باقی طبقوں سے اور اپنی سرزمین سے بالکل بے تعلق اور بے گانہ کر لیا تھا۔ تاؤن فطرت کی اس خلافت ورزی نے ایک قسم کی لے ایک نیم وحشی خانہ بدوش قوم جسے انگریزی میں عومہنڈو کہتے ہیں۔ ابھی تک اس کا قطعی طور پر فیصلہ نہیں ہو سکا ہو کہ یہ کس نسل کے لوگ ہیں اور ان کا اصل وطن کہاں تھا۔

لڈ دستہ نٹ کی نے ۱۸۸۰ میں لٹکن پر ایک تقریر کی جو لٹکن کے خیالات کی بہترین تشریح ہے اور جس نے قوم کی نظروں میں شاعر کی عظمت بہت بڑھا دی۔ دستہ نٹ کی ”سلاف دوست“ تھا اور یورپ کی تقلید کا سخت مخالف، لیکن اس کی تشریح میں کوئی مبالغہ نہیں معلوم ہوتا اور اس کی رائے ان نقادوں سے یقیناً زیادہ مستند ہے جو لٹکن کو بائرن کا نفاق قرار دیتے ہیں۔

طبیعت رکھنے والے آدمی پیدا کیے جنہیں کسی طرح چین نصیب نہیں ہوتا، جو کسی چیز سے مطمئن نہیں ہو سکتے جنہیں اپنے وطن اور اس کی قوتوں پر بھروسہ نہیں... جو اپنے ہم وطنوں سے محبت اور ہمدردی نہیں کرنا چاہتے۔ زندگی کے بنیادی اصولوں سے انکار اور ہم جنوں سے بے تعلقی ایسی ہستیوں کو ہمیشہ مصیبت میں مبتلا رکھتی ہے، پٹنگن کی سب سے لمبی نظم اور اس کا ادبی کارنامہ، ”یغ گے نئی اون یے گن“ اسی سیرت کو دوسری شکل اور دوسرے ماحول میں دکھاتا ہے اور ان دونوں سیرتوں کی عمومیت کی سب سے قوی دلیل یہ ہے کہ پٹنگن کے بعد جس کسی انشا پرداز نے تعلیم یافتہ روسیوں کا مثالی نمونہ پیش کرنا چاہا اس نے الے کو اور یغ گے نئی اون یے گن کی بہت سی خصوصیات اپنے ہیرو کی سیرت میں شامل کیں۔

”نٹ“ کا قصہ یہ ہے کہ ایک روسی الے کو اپنے دیس اور دیسی زندگی سے بیزار ہو کر نٹوں کے ایک قبیلے کے ساتھ ہو لیتا ہے اور ایک نٹنی زیرِ مفیر سے اس کے عاشقانہ تعلقات ہو جاتے ہیں۔ دو ڈھائی سال بعد زیرِ مفیر کی طبیعت اس کی صحبت اور محبت سے سیر ہو جاتی ہے اور نٹوں کی آزاد رسم کے مطابق وہ کسی اور شخص سے آشنائی کر لیتی ہے۔ روسی اس کی سر دھری محسوس کرتا ہے اور ایک مرتبہ رات کو زیرِ مفیر اور اس کے آشنا کو یک جا پا کر دونوں کو مار ڈالتا ہے۔ اس جرم کی سزا میں نٹ اسے اپنے قبیلے سے نکال دیتے ہیں۔ نظم کی خوبی داستان میں نہیں، بلکہ من موچی روسی اور سادہ لوح نٹوں کی سیرت اور ذہنی خصوصیات کے موازنے میں ہے۔ روسی نے شہر اور شہری طرز معاشرت

سے بیزار ہو کر نٹوں کی سادہ زندگی میں پناہ لی ہو۔ اپنی معشوقہ کے سوال پر وہ شہری زندگی کی یوں شکایت کرتا ہو۔

”وہاں لوگ ذرا سی جگہ میں بھیج بھیج کر رہتے ہیں۔
صبح کی ٹھنڈی ہوا ان کے آنکھوں تک نہیں پہنچتی،
نہ ہمارے موسم میں سبزہ زار کی خوشبوئیں،
وہ محبت سے شرماتے ہیں، دل کی اُمنگوں کو اُبھرنے نہیں دیتے۔
اپنی آزادی دوسروں کے ہاتھ بھیجے ہیں،
مورتوں کے سامنے سجدہ کرتے ہیں۔
اور روپے کے لالچ میں غلامی کی زنجیریں پہنتے ہیں۔
شہر چھوڑ کر میں نے کیا کھویا؟ دغا بازی کی تکلیفیں،
تعصب کے فیصلے، عوام کی اینداز سانی،
اور بھڑکیلے عیب!“

اب وہ روسی نٹوں کی صحبت میں رہنے لگا، جہاں بظاہر اسے ہر طرح کا سکون تھا؛

وہ سویرے اُٹھ کر اپنا دن
خدا کی مرضی پر چھوڑ دیتا،
اور زندگی کے ہنگامے

اس کی آسودگی میں خلل انداز نہیں ہوتے تھے،
صرف کبھی کبھی شہرت کا افسوں گرستارہ

اسے دور سے لہجاتا تھا...
 مگر خدا کی پناہ! انسانی جذبات
 اس کے بے بس دل کے ساتھ کس طرح کھیلے تھے،
 اور اس کے مصیبت زدہ سینے میں
 کس زور شور سے ابل اٹھتے تھے!

اس حالت میں زمرغیرا کی محبت اس کے لیے ایک بہت بڑا سہارا تھی
 لیکن جب اسے معلوم ہوا کہ اس عورت کی طبیعت اس سے ہٹ گئی ہے اور وہ
 دوسرے آشنا کی تلاش میں ہے تو بجائے اور ننٹوں کی طرح مسکرا کر سر جھکا لینے
 کے وہ اپنے رقیب کو جان سے مارنے پر تل گیا۔ زمرغیرا کے بوڑھے باپ کی
 دلیلیں کہ:

جوان دل پرندوں سے بھی زیادہ خود سر ہوتے ہیں،
 ان کو قابو میں رکھنا کسی کے بس کی بات نہیں،
 مسرت باری باری سے ہر ایک کو ملتی ہے،
 مگر جو کچھ ہو چکا وہ پھر سے ہونے والا نہیں۔
 روسی کی سمجھ میں نہیں آتی ہیں۔ وہ جواب دیتا ہے:-
 نہیں، میں ایسا نہیں ہوں، میں بغیر لڑے ہوئے
 اپنے حق کو ہرگز نہ چھوڑوں گا،
 یا کم از کم بدلے کر اپنے جی کو خوش کر لوں گا۔
 نہیں، اگر میں سمندر کے کنارے، کسی اونچی چٹان پر

اپنے دشمن کو سوتا پاؤں ،
 تو قسم کھاتا ہوں ... بغیر کسی افسوس یا تامل کے اس ظالم کو
 لات مار کر سمندر کی موجوں میں بھینک دوں ۔
 اس کی اچانک بیداری اور خوف کے لرزے کا
 ایک خونخوارانہ فہم سے جواب دوں ،
 اور بہت دنوں تک اس کے گرنے کی آواز
 یاد کر کے ہنسوں اور خوش ہوں ۔

ایسی طبیعت ظاہر ہی کسی ماحول سے ہم آہنگ نہیں ہو سکتی ۔ شہروں سے
 وہ خود بھاگتی ہے ، سادہ لوح انسان اسے اپنی صحبت کے لیے موزوں نہیں
 پاتے ۔ زہمگیر اکا بوڑھا باپ آخر کار اے کو سے کہنے پر مجبور ہوتا ہے کہ :

ہمارا ساتھ چھوڑ دے ، اسی مغرور آدمی !
 ہم وحشی ہیں ، ہمارے لیے کوئی قانون نہیں ،
 ہم نہ جرم کرتے ہیں نہ سزا دیتے ہیں ،
 ہم کو خون اور آہ و زاری کی حاجت نہیں ،
 مگر ہم قاتل کے ساتھ رہنا نہیں پسند کرتے ،
 تو آنا دزدنگی کے لیے نہیں پیدا ہوا ،
 تو سرت اپنی مرضی پر چلنا چاہتا ہے ...
 ہمارے دل مضبوط نہیں ، مگر ہم دل کے اچھے ہیں ،
 تو بد طبیعت اور بے باک ہے ۔

ہمارا ساتھ چھوڑ دے۔

وحشیوں کی سماج سے روسی اس شان سے نکالا گیا۔ ہند ب شہری زندگی میں اس کی بے چین اور وحشت زدہ طبیعت جو رنگ لاتی ہر اسے پٹکن نے اپنے ناول "یف گئے نی آون یے گن" میں دکھایا ہو۔

یف گئے نی آون یے گن، داستان کا میر و پتیر برگ میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ ایک اعلیٰ عہدے پر نوکرتھا اور صاحب جائیداد بھی تھا، مگر ایسا فضول خرچ کہ اس کی سہراوقات قرضے پر ہوتی تھی اور آخر کار دعوتیں دیتے دیتے اس کا دیوالہ نکل گیا۔ لیکن تقدیر اون یے گن پر مہربان تھی۔ پہلے اس کے یے ایک فرانسیسی کھلائی رکھی گئی اور اس کے بعد ایک فرانسیسی استاد، جو

اس خیال سے کہ بچہ پریشان نہ ہو

ہر چیز اسے کھیل کھیل میں پڑھاتا تھا،

سخت اخلاقی تعلیم سے اسے آزرده نہ کرتا،

شرارت کی سڑ میں ذرا چھڑک دیتا

اور بڑے پارک میں ٹھلانے لے جاتا۔

آون یے گن جب سولہ سترہ برس کا ہوا تو فرانسیسی استاد نکال باہر کیا

گیا، اور

لیجے میرا اون یے گن آزاد ہو گیا۔

جدید ترین طرز پر بال کٹائے ہوئے،

لندن کے چھیلوں کی طرح بنا ٹھنا

وہ دنیا دیکھنے نکلا۔

اس کی تعلیم معمولی ہوئی تھی، علمی استعداد کم تھی، لیکن وہ بے تکلفی سے فرانسیسی

پولتا اور بکھتا تھا،

مردز کا بڑی نزاکت سے ناچتا،

اور خوش اخلاقی سے ملتا جلتا۔

اس سے زیادہ چاہیے کیا؟ سوسائٹی نے طے کیا

کہ وہ بڑا قابل ہو اور بہت ہی پیارا۔

سوسائٹی کی عام رائے کے باوجود لٹکن بتا دیتا ہے کہ اس کا ہیرو نظم کی بحروں میں فرق نہیں کر سکتا تھا اور روسی مصنفوں کو گالیاں دیتا تھا۔ معاشیات کا عالم سمجھ جانے کے سوا اسے اور کوئی علمی حوصلہ نہ تھا اور یہ بھی محض اس وجہ سے کہ ان دنوں روس میں ایڈم سمٹھ کے کا بہت چرچا تھا۔ اون یے گن کی اس بے پروائی کا اصل سبب یہ تھا کہ اس نے ایک فن میں کمال حاصل کیا تھا جس کے مقابلے میں اور سب کچھ رینج ہی۔

ہم کو جنسی جذبات شروع ہی سے پریشان کرتے ہیں۔

اور جیسا کہ شتوبریاں نے لکھا ہے،

۱۔ ایک خاص قسم کا اجتماعی دلچ جو اس زمانے میں بہت مرغوب تھا۔

۲۔ انگریز ماہر معاشیات (۱۷۲۳-۱۷۹۰)

۳۔ فرانسیسی انشا پرداز (۱۷۶۸-۱۸۴۸)

ہم کو عشق کا پہلا سبق فطرت نہیں پڑھاتی،
بلکہ پہلا گدانا اول۔

ہم زندگی کی اصلیت معلوم کرنے کے لیے بیتاب ہوتے ہیں
اور ناؤل ہمیں سب کچھ بتا دیتے ہیں۔

یوں عمر گزرتی جاتی ہے اور ہم
اس سے کوئی لطف نہیں اٹھانے پاتے۔

ایک دلفریب تجربے کو قبل از وقت حاصل کر کے
ہم اپنی زندگی بے مزہ کر دیتے ہیں،

مست ہماری نظروں سے چھپ جاتی ہے اور اسی کے ہمراہ
جوانی کا جوش بھی غائب ہو جاتا ہے۔

اون بے گن پر بھی یہی گزرا، لیکن اس کے عوض میں
اس نے نسوانی فطرت کو بھی کیا خوب سمجھ لیا!

اس نے مکر اور حسد اور دھوکا بازی، روتھنا، بگڑنا، افسردہ اور بیمار بننا
سیکھا، دلبری کی راہ و رسم میں انتہائی مہارت حاصل کی اور اپنا شکار پھانسنے
میں مشاق ہو گیا۔ او باشی نے اس کی ہر دلفریزی میں کوئی فرق نہیں ڈالا،
اس کے پاس ہر طرف سے دعوت نامے آتے تھے اور دوپہر سے کب وہ سو کر
اٹھتا، تین چار بجے صبح تک، جب وہ نبح سے تھک کر اپنے گھر واپس جاتا،
اس کا سارا وقت کپڑے بدلنے اور ایک میزبان کے یہاں سے دوسرے کے
یہاں جانے میں صرف ہوتا۔ درمیان میں، رات کے آٹھ بجے کے قریب، وہ

کبھی کبھی تھیسر چلا جاتا، لیکن شاعر افسوس کے ساتھ اعتراف کرتا ہے کہ فنونِ لطیفہ سے محفوظ ہونے کی اس میں مطلق صلاحیت نہ تھی۔

ایسی زندگی کی ظاہری چمک دمک سے اون یے گن کی طبیعت بہت جلد اُکتا گئی، حسن پرستی اور عیاشی اور معصوم دلوں کا وہ غلاما بھی ایک بے لذت شغل ہو گیا۔ اون یے گن کمرے میں بند ہو کر بیٹھنے لگا، کچھ دن کتابوں کے مطالعے میں گزارے اور پھر وہ بھی چھوڑ دیا۔ زندہ مردوں اور عورتوں سے بیزاری اور جدید اور قدیم خیالات سے بے تعلقی نے اس کی طبیعت افسردہ اور اس کی زبان زہر ٹپ کر دی اور یہی دو کیفیتیں اس کے احساسات کا کل سرمایہ رہ گئیں اور لوگوں کی حالت بھی کبھی کبھی ایسی ہی ہو جاتی ہے، مگر تمام عمر کی مایوسی کے بعد یا کسی سخت صدمے سے۔ اون یے گن کی عمر ابھی صرف بیس سال تھی اور قسمت نے اسے ہر صدمے سے محفوظ رکھا تھا۔ یہ کیفیتیں اس کی فطرت کا ایک پہلو تھیں اور اس کی تربیت اور طرزِ معاشرت کا ایک لازمی نتیجہ۔

اس دوران میں اس کے باپ کا انتقال ہو گیا اور قرضداروں کا اس کے گرد ہجوم ہونے لگا۔ اُن سے پیچھا چھڑانے کو اون یے گن نے اپنی آبائی جائداد ان کے نذر کر دی۔ خوش قسمتی سے انھیں دنوں اسے یہ خبر ملی کہ اس کا چچا البتر مرگ پر ہے اور بھتیجے سے ملنے کا بہت مشتاق، کیونکہ اس نے بھتیجے کو اپنا وارث بنایا ہے۔ اون یے گن شہری زندگی سے ویسے بھی اُکتا گیا تھا اور اس امید میں کہ شاید وہاں زیادہ دھپ ثابت ہو فوراً اپنے چچا کے گانو کو روانہ ہو گیا۔ وہاں پہنچا تو چچا کا دم نکل چکا تھا اور لوگ اسے دفن کرنے کا انتظام کر رہے

تھے تجھیز و تکفین میں جو لوگ شریک ہونے آئے تھے انھوں نے حسب قاعدہ
ہمدردی ظاہر کی، خوب پیٹ بھر کر کھانا کھایا اور اون یے گن کو اس کی ملکیت
سپرد کر کے چل دیے۔

دو تین دن اسے ہر چیز نئی معلوم ہوئی،
سنان بکھیت، اندھیرے کنبوں کی خنکی،
چشمے کے بہنے کی آواز،
تیسرے دن کبچ اور پہاڑی اور میدان سے
اسے کوئی دلچسپی نہیں رہی۔

پھر اس نے دن رات اونگھنا شروع کیا،
اور اس پر صاف صاف ظاہر ہو گیا۔
کہ شہر کی طرح گاؤں میں بھی جی گھبراتا ہے،
اگرچہ وہاں نہ ٹرکیں ہیں نہ عالی شان عمارتیں،
نہ ناچ، نہ تاش، نہ شعر و شاعری۔
افسردگی نے اسے آگھیرا،

ہر جگہ اس کے پیچھے پیچھے پھرنے لگی،
جیسے پرچھائیں یا کوئی وفادار بیوی،

پہلے پہل ہمائے اس سے ملنے آیا کرتے تھے، لیکن چونکہ ان کے
چھکڑوں کی کھڑکھڑاہٹ سنتے ہی اون یے گن پھوٹے سے گھوڑے پر ٹھہر کر
غائب ہو جاتا تھا، سب اس سے خفا ہو گئے اور آمد و رفت بند کر دی،

ہمارا ہمایہ جاہل ہے، خبیثی ہے،
 وہ فراموش ہے، ایک، گھوٹ میں
 لال شراب کا پورا گلاس پی جاتا ہے۔
 وہ عورتوں کا لحاظ نہیں کرتا،
 ہمیشہ ”ہاں“ کہتا ہے اور ”نہیں“ نہ ”جی ہاں“
 نہ ”جی نہیں“۔ یہ عام رائے تھی۔

انہیں ہمایوں میں ایک نوجوان لین سکی بھی تھا۔ طبیعت اور مزاج میں
 وہ اون یے گن سے اسی قدر مختلف تھا جیسے پانی سے آگ مگر چونکہ دونوں باقی
 تمام ہمایوں سے بہت گھبراتے تھے اور ایک دوسرے کے سوا کسی اور سے علمی
 اور ادبی مسائل پر گفتگو نہیں کر سکتے تھے، اس لیے دونوں میں خاصی دوستی
 ہو گئی۔ لین سکی شاعرانہ مزاج کا لڑکا تھا، جسے دنیا میں ابھی تک کوئی تلخ تجربہ
 نہیں ہوا تھا۔ اسے محبت اور عشق کے خواب نظر آتے تھے، زندگی کے مقصد کو
 ایک دلفریب معمہ سمجھ کر وہ اسے حل کرنے کی کوشش میں مصروف رہتا تھا،
 حالانکہ اس کے دوست اون یے گن نے بہت پہلے سے قطعی طور پر معلوم کر لیا
 تھا کہ زندگی میں کوفت اور بد مزگی کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔ لیکن اون یے گن
 کو اپنے نئے دوست کو قائل کرنے کی کبھی خواہش نہیں ہوئی اور نہ اس کے سامنے
 نہ ہرا گلنے کی، اس وجہ سے کچھ عرصے تک دونوں میں خوب بھی۔

لال شراب چونکہ میٹھی اور قیمتی ہوتی ہے اس لیے اس کو لوگ عموماً مزہ لے لے کر اور

آہستہ آہستہ پیتے ہیں۔

لین سکی نے اون یے گن کا لارن نامی ایک خاندان سے تعارف کرایا اس
خاندان میں ماں اور دو بیٹیاں تھیں، جن میں سے چھوٹی لڑکی اولگا کی لرن سکی سے
منگنی ہو چکی تھی۔ اولگا میں صورت اور سیرت کی تمام خوبیاں تھیں۔ ”لیکن“
شاعر کہتا ہے:

”کوئی نادل اٹھا کر دیکھ لیجیے،

اس میں آپ کو اولگا کی تصویر مل جائے گی۔

وہ بہت پیاری ہے، مجھے بھی کسی زمانے میں وہ پسند آتی تھی،

مگر اب میں اس سے بہت گھبر گیا ہوں۔

اولگا کی بڑی بہن تیتیانامیں نہ اس کا جیسا حسن تھا نہ اس کی سی شگفتگی،
نہ اور کوئی نمایاں اوصاف جو لوگوں کو متوجہ کر سکیں، وحشت زدہ، مغموم، خاموش
وہ اپنے گھر میں بیگانہ معلوم ہوتی تھی، نہ ماں باپ سے محبت کا اظہار کرتی، نہ
بچوں کے کھیل کود میں شریک ہوتی۔ اپنے تصورات میں محو رہتا اس کا سب
سے عزیز شغل تھا اور اکثر وہ پورے دن کھڑکی کے پاس بیٹھے بیٹھے گزار دیتی تھی۔
نادلوں کا اسے بہت شوق تھا، اور اس نے بچپن ہی میں ماں کے تمام نادل
چراچر کر پڑھ ڈالے تھے۔ دیہاتی زندگی اور فضا نے اس کی طبیعت میں ایک عجیب
بے چینی پیدا کر دی تھی، اسے ہر وقت ایک لطیفہ غیبی کا انتظار رہتا تھا۔ اون نے
سے ملاقات ہوئی تو تیتیانام کو یقین ہو گیا کہ اس کے سارے خوابوں کی تعبیر اس
کے تمام حوصلوں کی بار آور ہے، اسی شخص کا آنا ہے، کیونکہ اون یے گن اسے ان
تمام خوبیوں کا مجسمہ معلوم ہوا جن سے اس نے اپنے خیالی دوست کی ہستی کو

آراستہ کیا تھا۔ تیتا نا کے جذبات پاک اور معصوم تھے اور اسی سبب سے زیادہ قوی، محبت کے جوش نے اسے بالکل بے بس کر دیا، دو چار روز میں اس کا رنگ پیلا پڑ گیا، رات کو نیند آتی نہ دن کو چین ملتا۔

اس کا محبت کرنا کوئی مذاق نہ تھا،

اس نے ایک نا تجربہ کار بچے کی طرح

اپنے آپ کو بالکل جذبات کے حوالے کر دیا۔

اس نے یہ نہ سوچا کہ ابھی ضبط سے کام لوں۔

اس سے محبت کی قیمت بڑھ جائے گی،

اور شکار کا پھنسا یقینی ہو جائے گا۔

پہلے امید دلا کر نہال کر دوں،

پھر خفا ہو کر دکھ پہنچاؤں،

اور اس کے سینے میں رشک اور حسد کی آگ بھڑکاؤں۔

ورنہ مطلب حاصل کر کے اس کا جی بھر جائے گا،

اور چالاک فیدی ہر وقت زنجیریں تڑا کر

بھاگنے کو تیار بیٹھا رہے گا۔“

آخر کار تیتا نا سے صبر نہ ہو سکا اور اس نے اُدن یے گن کو خط لکھ کر

اپنی محبت کی داستان سنائی۔ اُدن یے گن نے اس خط کا کوئی جواب نہیں دیا۔

چند روز بعد جب تیتا نا چھپ کر اس سے ملنے جا رہی تھی اور اتفاق سے باغ

میں دونوں کی مڈ بھیر ہو گئی تو اُدن یے گن نے اسے ایک لمبا چوڑا لکچر سنایا،

اپنی مجبوری ظاہر کی اور تیتیاناکو اس کی حماقت سے آگاہ کیا۔ آخر میں اس نے تیتیاناکو یقین دلایا کہ اگر گھر پوز زندگی میری قسمت میں لکھی ہوتی تو آپ کے سوا کسی سے شادی نہ کرتا۔

مگر میں ان مسرتوں کے لیے نہیں پیدا کیا گیا ہوں،

ان سے میری روح بیگانہ ہے،

آپ کا میرے ساتھ رہنا گویا اپنے حسن و جمال کو ضائع کرنا ہے۔
کیوں کہ میں اس کی قدر نہیں کر سکتا۔

یقین جانئے (میرا ضمیر گواہ ہے)

ازدواجی زندگی ہمارے لیے عذابِ جان ہو جائے گی۔

مجھے آپ سے چاہے جتنی محبت ہو

آپ کی صحبت کا عادی ہوا تو یہ محبت جاتی رہے گی۔

آپ روئیں گی اور آپ کے آنسو

میرے دل پر کوئی اثر نہ کر سکیں گے۔

بلکہ اس کی وحشت کو اور بڑھا دیں گے۔

آپ خود فیصلہ کیجیے۔ شادی کر کے ہم کسی مصیبت میں پڑ جائیں گے،

اور ممکن ہے برسوں اس سے بچنا نہ چھٹے۔

ادنیٰ نے اس ملاقات کے بعد تیتیاناکے یہاں آمد و رفت بند کر دی

اور گرمی اور جاڑا گھر بیٹھے بیٹھے کاٹ دیا۔ لیکن تیتیاناکے سالگرہ کے دن لڑکی اسے

پھر تیتیاناکے گھر پکڑے گیا اور اتفاق سے کھانے کے وقت دونوں آنے سانسے

بٹھا دیے گئے۔ تتیانہ کی بے چینی اور اس کا مصیبت زدہ چہرہ دیکھ کر آدن نے گن کو دعوت میں شریک ہونے کا سخت افسوس ہوا۔ اسے تتیانہ کے گھر لے جانے کا ذرا لرین کی تھا اور اس نے لرین کی سے بدلے لینے کا پکا ارادہ کر لیا۔ چنانچہ کھانے کے بعد وہ ہر مرتبہ لرین کی کی سنگیتر اولگا کے ساتھ ناپتارہا اور لرین کی کو اس کے پاس بھی نہ بٹھکے دیا۔ لرین کی نے یہ شرارت دیکھ کر اپنے دل میں یہ طو کیا کہ ہسپتال کے سوا ان دونوں میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا اور ڈیوئل لڑنے کا ہتھیار کے اپنے گھر چلا گیا۔ دوسرے دن اس نے آدن نے گن کے پاس ڈیوئل لڑنے کا چیلنج بھیج دیا۔ آدن نے گن رات کی سرگزشت بھول گیا تھا، اور لرین کی سے اب اسے کوئی شکایت بھی نہیں تھی، لیکن اس نے چیلنج منظور کر لیا اور مغاہمت کی ذرا بھی خواہش ظاہر نہیں کی۔ ڈیوئل جس دن کے لیے مقرر ہوا تھا وہ معصوموں کی نیند سو کر بستر سے اٹھتے ہی عینہ مقام پر بھاگا ہوا گیا، جہاں لرین کی کچھ دیر سے اس کا انتظار کر رہا تھا۔ ڈیوئل میں لرین کی کے سینے پر گولی لگی اور وہ وہیں پر گر کر مر گیا۔ اسے مار کر آدن نے گن نہایت درجہ سکون قلب کے ساتھ مکان واپس آیا اور کچھ روز بعد یورپ کی سیر کے لیے روانہ ہو گیا۔

لرین کی کے قتل کی خبر سن کر تتیانہ کے گھر میں ماتم برپا ہو گیا۔ لیکن یہ غم صرف چند روزہ تھا، اولگا سے ایک فوجی افسر نے شادی کر لی اور اسے اپنے ساتھ لے کر چلا گیا۔ اگر یہ حادثہ کسی پر گراں گزرا تو تتیانہ پر جو اپنے رنج میں گھٹی رہی۔ اس کے جذبات کے خلوص اور شدت نے اس کی اجازت نہ دی کہ وہ اولگا کی طرح کسی اور سے شادی کرے اور جو کچھ ہوا تھا اسے بھول جائے۔ وہ شادی کرنے سے قطعی انکار کرتی رہی، یہاں تک کہ اس کی ماں بہت پریشان ہو گئی۔ کسی نے مشورہ دیا کہ اگر

تتیا ناما سکو جائے تو شاید اسے اپنی پسند کا شوہر مل جائے اور تتیانام کی ماں اس کو اسی غرض سے ماسکو لے گئی۔ ماسکو جا کر تتیانام نے اپنی رائے نہیں بدلی، نہ اُون یے گئے کی محبت کو اپنے دل سے نکالا۔ مگر ماں اور تمام عزیزوں کے اصرار پر اس نے ایک ایک امیر خیرل سے نکاح کر لیا۔ اس کی شادی کے دو سال بعد اُون یے گن یورپ سے واپس آیا اور پیٹر برگ کی کسی محفل میں تتیانام کو اس نئے رنگ میں دیکھا۔ صورت سے زیادہ اسے تتیانام کی سیرت کے تغیر پر حیرت ہوئی۔ وہی لڑکی جو جذبات کی شدت سے بے بس ہو جایا کرتی تھی اب ایک مغز خاتون تھی، جسے اپنی طبیعت اور زبان اور چہرے پر پورا قابو تھا، جس کا چھوٹے بڑے سب کا خاکہ کرتے تھے اور جسے اپنے وقار کو قائم رکھنے کا راز معلوم تھا۔ تتیانام سے جب اُون یے گن کا تعارف کرایا گیا تو اس نے اپنی محبت کو، جو ابھی تک اس کے دل میں تازہ تھی، کسی طرح ظاہر نہیں ہونے دیا، اور اُون یے گن سے یوں مخاطب ہوئی گو یاد دونوں کی پہلی مرتبہ ملاقات ہو رہی ہو۔ اُون یے گن اس کی شان و شوکت سے بہت مرعوب ہوا اور اسے اس شہرت پر بہت رشک آیا جو دراصل تتیانام کی سادگی اور خلوص کا ایک ادنیٰ معاوضہ تھی۔ اس نے تتیانام سے پرانے تعلقات دوبارہ قائم کرنا چاہے، کئی خط لکھے جن کا کوئی جواب نہیں ملا، ملاقات کی، مگر مطلب کی باتیں نہیں کر سکا۔ اسی اثنا میں وہ بیمار ہو گیا اور آخر کار ایک روز وہ بستر علالت سے اٹھ کر سویرے تتیانام کے محل پر اپنی قسمت کا قطعی فیصلہ کرانے کے ارادہ سے گیا۔ خادموں نے اسے سیدھا تتیانام کے کمرے میں پہنچا دیا اور اس نے دیکھا کہ تتیانام بیٹھی رو رہی ہو۔ اُون یے گن اس کے پیروں پر گر پڑا، لیکن تتیانام نے اسے صاف صاف سمجھا دیا کہ اسے یہ نیا انداز ناگوار

معلوم ہوتا ہوا دل پہنی بے رخی کی وجہ بھی بتا دی ۔
 کیا یہ غلط ہے کہ اُن دنوں اس دیرانے میں،
 جہاں ہماری محبت کا چرچا کرنے والے نہ تھے،
 میں تمہیں نہیں پسند آئی ؟ اب کیا ہوا
 جو تم میرا بچھیا کیے ہو ؟ اس کا سبب بس یہ ہے
 کہ میں رئیسانہ مجلسوں میں شریک ہوتی ہوں ،
 میں امیر اور مشہور ہوں ، اب میری بدنامی کی خبر
 ہر شخص کے کانوں تک پہنچ جائے گی ،
 اور ممکن ہے سوسائٹی میں تمہارے مذاق کے لوگ
 اس کا رنامے کی وجہ سے تم پر رشک کرنے لگیں ...
 لیکن میں اسی وقت بڑی خوشی سے
 اس مہل زندگی کی نمائش ، شور و غل اور دھوئیں کو
 کتابوں کی ایک الماری ، ایک خود رو باغ ،
 اپنے اجرے آبائی مکان
 یا اس مقام کے بدلے چھوڑنے پر تیار ہوں
 جہاں اُون یے گن ، تم سے پہلی ملاقات ہوئی تھی ،
 اس حقیر قبرستان کے بدلے
 جہاں میری بوڑھی کھلائی کی قبر پر
 ایک صلیب گڑی ہے اور درختوں کا سایہ ہے ...

اب میری قسمت کا فیصلہ ہو چکا۔۔
 میں نے شادی کر لی ہے۔ تم کو چاہیے۔
 کہ... مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔
 میں باتیں نہیں بناتی مجھے تم سے محبت ہے
 لیکن میں دوسرے کی بیوی ہوں،
 اور ہمیشہ وفادار رہوں گی۔

تتیا نایہ کہہ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی، اور اُدن بے گن کے ابھی تک
 حواس درست نہیں ہوئے تھے کہ اسے پائوں کی آہٹ سنائی دی اور تتیا ناکا
 شوہر کمرے میں داخل ہوا۔ لپٹکن نے اپنی داستان اسی نازک موقع پر ختم کر دی کہ
 خوش قسمت ہو وہ جو دنیا کے دسترخوان سے
 جلد اٹھ گیا؛ جس نے زندگی کے شراب سے لیریز پیالے کو
 بالکل خالی نہیں کر دیا؛
 جس نے زندگی کا فناء آخر تک نہیں سنا،
 بلکہ دفعتاً اٹھا اور خست ہو گیا۔
 جیسے میں اپنے اُدن بے گن سے “

لپٹکن کا ظرافت آمیز طرزِ بیان پڑھنے والے کو محسوس نہیں ہونے دیتا کہ
 ”لیف گے نئی اُدن بے گن“ کی داستان کس قدر دردناک ہے اور اس کا انجام کتنا
 عبرت انگیز۔ اس کی بھی شاعر خاص طور سے کوشش کرتا ہے کہ اس کا رنج یا غصہ یا
 تعصب کوئی مصنوعی فضا نہ پیدا کر دے جس میں نظم کے اشخاص اصل سے ذرا بھی

مختلف نظر آئیں اور وہ اپنے ذاتی احساسات کو اس طرح چھپاتا ہے کہ نکتہ بیخ قدر ونا ہی سمجھ سکتے ہیں کہ اسے اپنے ہیرو کی گمراہی پر کتنا افسوس ہو اور اپنی ہیروئن کی سرگزشت پر وہ کیسے گرم آنسو بہاتا ہے۔ لیکن اس ضبط کے باوجود بھی ”یف“ گئے نئی اداں نے گن کے داستانِ روسی قوم کا نوحہ کہلاتی ہے اور بصیرت افزوزہ حقیقت نگاری کا روسی ادب میں پہلا نمونہ اداں نے گن اور تیتاناکا قصہ کوئی اتفاقی منظر نہیں۔ یہ دونوں تعلیم یافتہ روسیوں کے مثالی نمونے ہیں اور ان پر جو کچھ گزرا وہ نوجوان روسیوں کے عام تجربے کی ایک شکل ہے۔ اداں نے گن نے جو تربیت پائی، اُس نے جو کمالات حاصل کیے اور اس کی سیرت نے جو رنگ اختیار کیا وہ کوئی ذاتی خصوصیت نہیں تھی بلکہ ایک و باکا اثر جس سے کوئی روسی نوجوان بالکل محفوظ نہ رہا ہو گا۔ اداں نے گن کی نسبت پتیر برگ کے شرفا کی عام رائے کہ ”وہ بڑا قابل ہے اور بہت ہی پیارا“ مردِ وجہ فلسفہ حیات پر مبنی تھی اور کوئی جانب دارانہ فیصلہ نہیں کہی جاسکتی، لیکن نے محسوس کیا کہ ماحول کے اثرات سے ایک خاص ذہنیت اور مزاج کے لوگ پیدا ہو رہے ہیں اور ایک ایسے شخص کی تصویر بنا کر جس میں یہ نیا رنگ بہت نمایاں تھا اس نے قوم کو اس منظر کی خطرناک سہولت سے آگاہ کر دیا۔ اداں نے گن کے مقابلے میں تیتاناکا کی سیرت دکھا کر اس نے اپنا مطلب اور بھی واضح اور عبرت آموز کر دیا۔ تیتاناکا نے ناول تو پڑھے ہیں اور ان کے پڑھنے سے کسی قدر جذبات پسند بھی ہو گئی ہے، لیکن اسے اپنے قومی آئیں اور طرز معاشرت سے بہت لگاؤ ہے، اپنی خود داری کا بہت پاس ہے اور جیسا کہ نظم کے انجام سے ظاہر ہوتا ہے وہ اپنے اصولوں پر ذاتی مسرت اور آرزوئیں

نثار کرنے کی ہمت رکھتی ہو۔ اون یے گن کی سیرت میں بہت سی خرابیاں، اس کی نیک نامی پر بہت سے داغ ہیں، لیکن تیتیاناجیبی لڑکی کے جو ہر نہ پہچان سکتا ایسی کم ظرفی اور بد شوقی کی دلیل ہو جو نہ شاعر معاف کر سکتا ہو نہ داستان کے ناظرین اور لٹیکن کا گلہ بھی ہو کہ روس میں اون یے گن جیسے ہزار ہا نوجوان ہیں اور تیتیاناجیبی ہزار ہا لڑکیاں جو اپنے اپنے طور پر نسوانی سیرت کی اعلیٰ مثالیں ہیں، مگر بے قدری ان کے حسن پر پردہ ڈالے ہوئے ہو۔

اون یے گن اور تیتیاناکا قصہ داستان کامرکز ہے، لیکن قصہ سنانے کی پابندی سے لٹیکن کا موضوع یا اس کی نظر محدود نہیں ہو جاتی۔ دارالسلطنت کی زندگی، اعلیٰ سوسائٹی کی شخصیتیں اور صورت مزاج اور مذاق کے وہ عجوبے جو اس طبقے میں کثرت سے پائے جاتے ہیں نہایت دلچسپ طریقے سے پیش کیے گئے ہیں۔ مگر لٹیکن کی مصوری کا کمال روس کی دیہاتی فضا اور مختلف موسموں کے مناظر اور کیفیتوں کے بیان میں نظر آتا ہے۔ روسی بچے اب تک لٹیکن ہی کے اشعار پڑھ کر دیہاتی زندگی کو شاعرانہ نظروں سے دیکھنا اور اس سے پورا لطف اٹھانا سیکھتے ہیں اور یہی ان کے واسطے وطن پرستی کا پہلا سبق ہوتا ہے۔ اون یے گن اور تیتیاناکا داستان کا دیہاتی پس منظر اس کی تاثیر کو اور بھی بڑھا دیتا ہے اور پڑھنے والے کے ذہن میں روسی معاشرت اور سرزمین کا ایک خاص تصور قائم کر دیتا ہے۔ لٹیکن کے زمانے تک ایسا کوئی تصور نہیں تھا اور لٹیکن نے اسے جس شکل میں اور جس انداز سے پیش کیا وہ آئندہ نسلوں کے لیے صرت بصیرت افزا نہیں بلکہ ہمت افزا اور تسلی بخش بھی ثابت ہوا۔

”یہ کے نئی اون یے گن“ کی تصنیف میں نو سال صرف ہوئے۔ اس عرصے میں لشکن نے اور لمبی نظیں اور ڈراما کے طرز پر داستانیں بھی لکھیں۔

”پنجی سرے کا فوارہ“ ایک تاتار سردار کے حرم کا قصہ ہے جہاں ایک بیوی دوسری کو مار ڈالتی ہے اور جرم کی سزا پاتی ہے۔ ”پولتاوا“ میں پیتر اعظم اور سوئیڈن کے بادشاہ چارلز دوازدہم کی مشہور جنگ کی داستان بیان کی گئی ہے اور اسی کی آڑ میں آزادی اور قوم پرستی کی مدح سرائی بھی کی گئی ہے، کیوں کہ چارلز دوازدہم کے ساتھیوں میں چند ایسے سردار بھی تھے جو اپنے وطن کو پیتر اعظم کے قبضے سے چھڑانے کے لیے لڑ رہے تھے۔ ”کنجوس امیر“۔ ”موٹسارٹ اور سالییری“ اور ”پتھر کی مورت“ طرز کے اعتبار سے تو ڈرامے ہیں، لیکن ان کی اصل خوبی مثنوی کی ہے اور لشکن کا مقصد بھی شاعری تھی، اس لیے انھیں نظیں ہی سمجھنا چاہیے۔ ”موٹسارٹ اور سالییری“ کا موضوع حسد ہے اور اس ڈراما میں سالییری، موسیقی کا ایک استاد جو ”زور بازو“ سے اپنے فن میں مہارت حاصل کرنا چاہتا ہے اور کامیاب نہیں ہوتا موٹسارٹ کو زہر دیدیتا ہے، کیونکہ موٹسارٹ کو اپنی حیرت انگیز خلقی استعداد کی وجہ سے مہارت اور شہرت دونوں بن مانگے مل گئی ہیں۔ ”پتھر کی مورت“ میں ہسپانیہ کے ایک نامی نوائی دلوں کے بہرن دون جوآن کی سرگزشت کا ایک واقعہ بیان کیا گیا ہے اور روسی نقادوں کا دعویٰ ہے کہ دون جوآن کی سیرت اسے دولت گانگ امامے کس موٹسارٹ (۱۷۵۶-۱۷۹۱) یورپ کے سب سے ممتاز موسیقی کے ماہروں میں سے تھا۔ اس کی موت طبعی تھی لیکن اسے خیال تھا کہ کسی نے اسے زہر دیدیا ہے۔

اس سے بہتر کہیں نہیں پیش کی گئی ہے۔ لیکن شاعرانہ خوبیوں کے لحاظ سے ”یف گئے نئی اون یے گن“ کے بعد ان کہانیوں کا درجہ آتا ہی چونکن نے نظر بندی کے رٹنے میں اپنی بوڑھی کھلائی کی زبانی سنیں اور عوام کے طرز پر نظم کہیں یکن کا گاؤ گاؤ“ چرچا ہوا تو اس کی اعلیٰ ادبی تصانیف سے کہیں زیادہ ان کہانیوں کی وجہ سے اور اس وقت تک ”زارسلتان“ ”دولھا“ ”پادری اور اس کا نوکر بلدا“۔ ”مچھلی اور ماہی گیر“ اور ”سنہرا مرغا“ اسی قدر مقبول ہیں جتنی وہ یکن کے زمانے میں تھیں۔

”یف گئے نئی اون یے گن“ کی تصنیف کے بعد بھی یکن نظم میں داستانیں لکھتا رہا۔ ان میں سے بہترین ”تانبے کا سوار“ پیتربرگ کے ایک باشندے کا قصہ ہے جس کی معشوقہ کا مکان دریائے نلے والے ایک سیلاب میں بہ گیا اور وہ خود ڈوب کر مر گئی۔ اس شخص کا صدمے سے دماغ پھر گیا اور اس کے مبنو نانہ نخل پر پیر اعظم کی صورت کے رعب اور پیتربرگ کی فضا کا جواثر ہوتا ہے وہ یکن نے اس طرح سے بیان کیا ہے کہ پیر اعظم ایک جا دو گر معلوم ہونے لگتا ہے اور پیتربرگ ایک طلسمی شہر۔ پیر اعظم کا بنایا ہوا شہر روس کے اور شہروں سے اتنا ہی مختلف اور ملک کے لحاظ سے اتنا ہی ناموزوں تھا جتنے کہ وہ روسی اپنی قوم سے جدا اور بیگانہ ہو گئے تھے جنہوں نے پیر اعظم کی پیروی میں اور اس کے حکم کے مطابق اپنی لے دون جوان کی شخصیت مختلف شکلوں میں یورپ کے ہر ملک کے ادب میں ملتی ہے۔ انگریزی شاعر بارن نے بھی ”دون جوان“ کے عنوان سے اس کے متعلق ایک نظم لکھی ہے۔

پُرانی وضع چھوڑی تھی۔ لپکن کی طرح بہت سے انشا پردازوں نے پتیر برگ کی خاص فضا اور وہ کیفیتیں جو وہ انسان میں خود بخود پیدا کرتی ہر بیان کی ہیں اور اس میں شک نہیں کہ اس فضا کا پتیر برگ کے باشندوں کی ہیرت پر بہت بُرا اثر ہوا ہے۔ یہ بھی لپکن کے وجدان اور ادراک کی خوبی تھی کہ اس نے وہ اثر محسوس کر لیا جس کی بعد کو سلاط دوست “مصنفوں نے شکایت کی اور اسے بیان بھی اس طرح کیا کہ ترمیم کی بہت کم گنجائش رہی۔

”تاجنہ کے سوار“ اور متعدد مختصر نظموں کے علاوہ لپکن نے ۱۸۳۳ء میں

ایک ڈراما “بورس گو دوزوف” بھی لکھا جس کا موضوع اوان چہارم کی موت کے بعد کی طوائف الملوک کی ہر اور دمیتری نامی ایک شخص کی بغاوت جس نے زار کے بڑے بیٹے ہونے کا دعویٰ کیا تھا۔ لپکن ڈراما نویس نہیں تھا، اور یہ مشق اسے فن میں ماہر بنانے کو بہت ناکافی تھی۔ روسی نقاد شکایت کرتے ہیں کہ لپکن نے اس ڈراما میں نہ کوئی کیرکٹرا جی طرح دکھایا ہے نہ کسی قسم کی جدت کی ہے، لیکن پھر بھی نظم کے لحاظ سے ڈراما میں دو تین سین اچھے ہیں، خصوصاً وہ جہاں ایک بڑھا راہب رات کو چراغ کے سامنے بیٹھا دکھایا گیا ہے۔ راہب مورخ ہے اور چونکہ وہ بہت بوڑھا ہو گیا ہے اس کی تاریخ، جس میں اس نے اپنے زمانے کے تمام واقعات درج کیے ہیں، ختم ہونے والی ہے۔

بس ایک آخری داستان اور ہے

اور پھر یہ تاریخ ختم ہو جائے گی۔

وہ فرض جو خدا کی طرف سے مجھ گنہگار کے لیے مقدر ہوا تھا
ادا ہو گیا۔ خدا نے مجھے اس طویل دور کا

عینی گواہ بلا وجہ نہیں بنایا ،
 نہ مجھے لکھنے پڑھنے کا سلیقہ بیکار عطا کیا ۔
 کبھی نہ کبھی کسی محنت کش راہب کو
 میری گناہ مگر شوق اور ایمان داری سے لکھی ہوئی داستان ملے گی ۔
 میری طرح وہ بھی اپنا چراغ جلانے لگا ۔
 اور اس کے صفحوں سے صدیوں کی گرد بھاڑ کر
 اس کے سچے واقعات کو نقل کرے گا ...
 میں بڑھاپے میں دوبارہ زندہ ہو رہا ہوں
 جو کچھ دیکھ چکا ہوں وہ پھر آنکھوں کے سامنے آ رہا ہے ۔
 کیا بہت عرصہ ہوا کہ زندگی کا طوفانی سمندر
 موجیں مارتا ہوا گزرا تھا ؟
 اب وہ خاموش اور پُر سکون ہے ؛
 مجھے بہت کم صورتیں یاد ہیں ،
 بہت کم باتیں ،
 اور جو کچھ بھولا ہوں وہ ہمیشہ کے لیے ۔
 لیکن چراغ بجھ رہا ہے ، دن قریب ہو گا ۔
 بس ایک آخری داستان اور ہے ۔
 پشکن کی مختصر نظمیں زیادہ تر عشقیہ ہیں ، لیکن اس کے میدان کی وسعت
 لے یعنی نوشتہ داستانیں پڑھ کر ۔

اور مذاق کی ہمہ گیری ثابت کرنے کو ”پیغمبر“ شاعر اور کتب فروش“ ”زندگی کی رتھ“ ”بھوت“ ”نوح“ ”ہم مشربوں سے خطاب“ بہت کافی ہیں۔ ان کے علاوہ ننگین نے مغربی سلاطینوں کے بہت سے گیتوں اور داستانوں کا ترجمہ کیا اور فارسی، عربی، قدیم یونانی اور روسی، اطالوی، ہسپانی، فرانسیسی، جرمن، پشتانی اور انگریزی شاعروں کے مخصوص قومی طرز میں بھی طبع آزمائی کی۔ اس کے کلام کے مجموعہ میں قرآن شریف کی چند آیتوں کا ترجمہ بھی موجود ہے۔ مگر ننگین کا علم اس کے مذاق کی طرح ہمہ گیر نہیں تھا، انگریزی اور فرانسیسی شاعروں کے سوا اس نے کوئی ترجمہ براہ راست اصل سے نہیں کیا، اور دوسروں کے طرز کی کامیاب نقل کرنے کے لیے اس کی معلومات کافی نہیں تھیں۔ اسے ایک خامی نہ سمجھنا چاہیے، بلکہ اس کے برعکس اس شوق کی تعریف کرنا چاہیے جو کسی کارنامے سے مطمئن نہ ہو سکا اور ہمیشہ وسعت اور بلندی کا آرزو مند رہا۔

ننگین کی ایک عشقیہ نظم ملاحظہ ہو :

مجھے زندگی کا وہ حیرت انگیز لمحہ یاد ہے،

جب تو میرے سامنے نمودار ہوئی

ایک دیدار کی طرح جو دم بھر کے لیے عطا ہوا،

ایک حسن کا مجسمہ جو اپنی جھلک دکھلا گیا،

بہت دنوں تک جب کوئی لاوا در مجھے ٹڑپاتا

یاس دنیا کے شور و غل اور لغویات سے پریشان ہو جاتا

تو تیری نرم آواز میرے کانوں میں گونجنے لگتی

اور تیرا پیارا چہرہ مجھے خواب میں نظر آیا کرتا =
 زمانہ گزرتا گیا، جذبات کی باغیانہ شورشوں نے
 پڑانے خواب منتشر کر دیے۔

میں تیری نرم آواز بھول گیا
 اور تیرا پیارا چہرہ۔

جلا وطنی کے گوشے، جلای کی تاریکی میں
 میری عمر اپنی سست رفتار سے گزرتی رہی۔
 نہ کوئی ایسا تھا جس کی ناز برداری کروں، یا جو میرے جسم
 میں جان پھونکے،
 نہ آنسو تھے، نہ زندگی، نہ محبت۔

میرے دن پھرے، میرا دل بیدار ہوا،
 تو پھر میرے سامنے نمودار ہوئی
 ایک دیدار کی طرح جو دم بھر کے لیے عطا ہوا،
 ایک حسن کا مجسمہ جو اپنی جھلک دکھلا گیا
 میرا دل خوشی سے دھڑک رہا ہے،
 اسے ناز برداری کا شرف حاصل ہوا ہے۔

اسے ایک ہستی ملی ہے جو اس میں دوبارہ جان پھونک سکتی ہے،
 اور اب اسے پھر جینا نصیب ہوا ہے اور آنسو بہانا اور محبت کرنا۔
 روسیوں کی طبیعت عام طور سے حقیقت بینی اور حقیقت نگاری کی طرف

اس قدر مائل ہوتی ہے کہ فلسفیانہ تصورات اس کے لیے کوئی کشش نہیں رکھتے
 اسی وجہ سے روسی شاعری میں فلسفیانہ رنگ کی نظمیں شاذ و نادر ملتی ہیں۔ لیکن
 کی نظم زندگی کی رتھ، تخیل، استعارے اور حقیقت نگاری کی اس خاص آئینہ
 کی بہت اچھی مثال ہے جو روس میں فلسفے کا کام دیتی ہے۔

رتھ پر اگرچہ بوجھ بہت ہے
 مگر وہ آسانی سے چل رہی ہے۔
 زمانہ، ایک سن رسیدہ مشاق رتھ بان کی طرح
 بغیر ستائے ہم کو بھگائے لیے چلا جاتا ہے۔
 ہم سویرے سے رتھ میں بیٹھتے ہیں،
 جب ہمیں ہڈی لپٹی ٹوٹنے کا اندیشہ نہیں ہوتا،
 آرام اور آسودگی کی فکر نہیں ہوتی،
 اور تب ہم چلاتے ہیں: چل، جلدی چل!
 لیکن آدھا دن گزرنے تک یہ جولانی نہیں رہتی،
 ہم بہت ہچکولے کھا چکے ہوتے ہیں،
 ڈھلواں زمین اور خندقوں کا ہمیں خوف ہوتا ہے،
 اور تب ہم چلاتے ہیں: سنبھل کر چل، بیوقوف!
 رتھ پہلے کی طرح چلتا رہتا ہے،
 شام تک ہم اس میں بیٹھنے کے عادی ہو جاتے ہیں۔
 زمانہ رتھ کو تیزی سے چلاتا رہتا ہے۔

اور ہم ادنگھتے ہوئے خواب گاہ تک پہنچ جاتے ہیں۔
 ”بھوت“ میں شاعر برف کے طوفان کو وہمی دیہاتیوں کی نگاہوں سے دیکھتا
 ہے۔ ترجمے میں الفاظ کی تاثیر جاتی رہتی ہے، اور اس قسم کی نظموں میں اثر زیادہ تر
 الفاظ کے وزن اور تال کا ہوتا ہے۔ یہ نظم اپنی اصل صورت میں پڑھی جائے تو طوفان
 اور برف باری کی فضا اور وہ مہیب شکلیں جو خوف زدہ تصور ایسے موقعوں پر گویا
 اپنے آپ کو ڈرانے کے لیے بنایا کرتا ہے سب نظر کے سامنے آ جاتی ہیں اور شاعر کی
 طرح پڑھنے والے کا دل بھی دہل جاتا ہے۔

بادلوں کے بھونچال ہیں، بادلوں کا طوفان ہے،

کہیں سے چھپ کر چاند

اڑتی ہوئی برف کو چمکا رہا ہے؛

آسمان مٹیالا ہو، رات مٹیالی۔

میں پاٹ میدان میں گاڑی پر چلا جا رہا ہوں، چلا جا رہا ہوں۔

گھوڑوں کی گھنٹی ٹن ٹن بول رہی ہے۔

انجان مقاموں سے گزرتے ہوئے۔

دل بے اختیار کانپ اٹھتا ہے۔

”ارے کو جوان، جلدی کر!“ ”حضور، مجھ میں سکت نہیں،

اور گھوڑوں کے پیر شکل سے اٹھتے ہیں۔

برف کا طوفان میری آنکھیں اندھی کیے دیتا ہے،

تمام رستے نظر سے چھپا دیے ہیں،

میں تو اب مارے بھی رستہ نہیں بتا سکتا۔
 ہم بھٹک گئے ہیں، کریں تو کیا کریں؟
 ہم کو بھوت میدان میں گھسیٹے لیے جاتا ہے،
 اور ادھر اُدھر چکر دے رہا ہے۔
 دیکھیے وہاں کھیل رہا ہے، وہاں،
 میرے منہ پر کچھ پھونکتا ہے اور حقوکتا ہے۔
 وہ دیکھیے اب چمکنے والے گھوڑے کو
 گڑھے میں ڈھکیل رہا ہے،
 وہ لیجیے اب بھوٹ موٹ میل کا پتھر بن کر
 میرے سامنے زمین میں گر گیا۔
 اب دیکھیے وہ جنگاری کی طرح چمکا
 اور اندھیرے میں غائب ہو گیا۔
 بادلوں کے بھونچال ہیں، بادلوں کا طوفان ہے،
 کہیں سے چھپ کر چاند
 اڑتی ہوئی برف کو چمکا رہا ہے
 آسمان مٹیالا ہے، رات مٹیالی۔
 ہم میں اب چکر لگانے کی طاقت نہیں،
 گھوڑوں کی گھنٹی خاموش ہے
 گھوڑے کھڑے ہو گئے ہیں۔ ”ارے وہ سامنے کیا ہے؟“

”میں کیا بتاؤں؟ کسی درخت کی جڑ ہوگی، یا بھیڑ یا“

طوفان جھلاتا ہی، طوفان روتا ہی؛

بھڑکنے والے گھوڑے پھنکارتے ہیں؛

لو اب بھوت دور بھاگا جاتا ہی،

بس دونو آنکھیں اندھیرے میں انگاروں کی طرح دھک رہی ہیں۔

گھوڑے پھر چلنے لگتے ہیں،

گھنٹی ٹن ٹن بولتی ہے۔

یرت سے سفید میدانوں پر

مجھے بھوت جمع ہوتے دکھائی دیتے ہیں،

بے شمار، بد صورت اور ڈراؤنے،

چاند کی مٹیالی روشنی میں،

ہر طرح کے بھوت چکر لگا رہے ہیں،

جیسے پت جھڑ میں پتیاں۔

کتنے ہیں، کدھر بھاگے ہوئے جا رہے ہیں،

کیوں سب ایسی دردناک آواز میں گارہے ہیں؟

کیا کوئی بھوت دفن کیا جا رہا ہے،

یا کسی چڑیل کی شادی ہے؟

بادلوں کے بھونچال ہیں، بادلوں کا طوفان ہے،

کہیں سے چھپ کر چاند

اڑتی ہوئی برف کو چکا رہا ہے؛
 آسمان مٹیالا ہے، رات مٹیالی۔
 گروہ درگروہ، بھوتوں کا بھونچال
 آسمان کی بلندی میں غائب ہو رہا ہے۔
 ان کی دردناک چنیں اور آپس
 میرے دل کو زخمی کر رہی ہیں۔

”بھوت“ کے مقابلے میں دیہاتی روس کا ایک اور منظر ملاحظہ ہو جو صرف
 شاعرانہ کیفیت سے خالی ہی نہیں بلکہ ایسا دیرانہ ہے جس میں زندہ دلی کا چہنہ
 ہی سوکھ جائے۔

میرے سرخ و سپید نقاد، میرے سوٹے تازے ہنسی اڑانے والے،
 تو ہمیشہ میرے افسردہ افکار کو اپنے مضحکے کا تختہ مشتق بناتا ہے؛
 ذرا ادھر آ، میرے پاس بیٹھ اور بھرہم دونوں دیکھیں گے
 کہ میری بد بخت افسردگی کا کوئی علاج ہی یا نہیں۔
 دیکھ یہاں کا منظر کیسا نفیس ہے: ٹوٹے پھوٹے جھوپڑوں کی
 ایک قطار

اور اس کے پیچھے سیاہ زمین؛ میدان کی ہلکی ہلکی ڈھال
 اور سب کے اوپر دھلے ہوئے گنجان بادلوں کی پٹی۔
 اہلہاتے کھیت کہاں ہیں، گھنے جنگل کہاں،
 اور دریا کدھر؟ صحن میں جنگلے کے پاس

آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچانے کو دو بچا رہے درخت کھڑے ہیں :
 صرف دو درخت اور ان میں سے بھی ایک کو
 خزاں کی بارش نے بالکل ننگا کر دیا ہے ؛
 دوسرے کی پتیاں زرد ہیں ، بھگتے بھگتے گل گئی ہیں
 اور اب ہوا کے کچھ تیز جھونکوں کی منتظر ہیں ، کہ تالاب میں
 گر کر اسے پاٹ دیں ۔

بس اور کچھ نہیں ۔ آس پاس کسی کتے کی آواز تک نہیں ۔
 ہاں ، وہ دیکھ ایک کسان ہے اور اس کے پیچھے دو عورتیں ؛
 کسان ننگے سر ہے ، بغل میں بچے کا تابوت دبا ہے ،
 اور دوسرے کا ہل چھوٹے پادری کو پکا رہا ہے
 کہ وہ بڑے پادری کو ہلاے اور گر جا گھر کھول دے ؛
 بہت جلد ، اب انتظار کی گنجائش نہیں ،
 بچے کو بہت پہلے ہی دفن کر دینا چاہیے تھا ۔

ایسے مناظر سے بہت زیادہ ہمت شکن دار اسطنت کی وہ رنگیلی زندگی
 تھی جس میں شکن نظر بندی کے بعد مبتلا ہو گیا ۔ زار کا احتساب ایک طرف اور
 دوسری جانب خود شکن کی طبیعت کی کمزوریاں دونوں نے مل کر اس کی شملہ کی
 کا کام تمام کر دیا ۔ ایک نظم میں اس نے خدا سے دعا مانگی ہے کہ اسے دیوانگی سے
 بچائے رکھے : یہ نوحہ ” بھی اسی رنگ میں ہے ۔
 دیوانگی کے زمانے کا بھٹتا ہوا سرور

میرے دل پر گراں ہے جیسے شراب کا خمار،
 اور شراب ہی کی طرح گزرے ہوئے دنوں کا غم
 میرے دل میں جتنا پڑا نا ہوتا جاتا ہے اتنا ہی تیز بھی۔
 میرا سنا سناتا ہے، میرے مستقبل کا موج زن سمندر
 مجھے رنج اور کلفت کے طوفانوں کا پیغام دے رہا ہے۔
 لیکن دوستو، مجھے ابھی مرنا منظور نہیں
 مجھے جینا ہے، کہ آرزوؤں کا بیج بوؤں اور مصیبت کا پھل چکوں !
 اور مجھے معلوم ہے کہ رنج اور فکر اور پریشانیوں میں بھی
 میرے عیش و عشرت کا سامان ہوگا۔
 کبھی کبھی نفس اور روح کی ہم آہنگی میرے گیت کا موضوع ہوگی،
 میں بھر اپنے خیال کی شوخی پر خوشی کے آنسو بہاؤں گا۔
 اور ممکن ہے کہ میری شام حرام
 عشق کے الوداعی تبسم سے روشن ہو جائے۔
 آخر میں ایک نظم درج کی جاتی ہے جس میں لپکن اپنے ہم مشربوں
 کو خطاب کرتا ہے۔
 شاعر، تو عوام کی محبت پر اعتبار نہ کر !
 تعریف کے نعروں کا شور دم بھر میں مٹ جائے گا۔
 تجھے بے وقوف کی رائے سنی ہوگی اور سنگ دلوں کی مہنی،
 مگر تو اپنا وقار اور سکون قائم رکھ اور غم سے ہم کنار رہ۔

تو بادشاہ ہی، تنہا رہ، اپنے سیدھے رستے پر چل،
 جہاں تجھے تیرا آزاد ذہن لے جائے وہاں جا،
 اپنے محبوب خیالات سے اپنی دنیا تعمیر کر
 اور اپنی بلند امنگوں کا صلہ کسی سے نہ مانگ...

شاعر کے رہنے کی نسبت ایسے بلند خیالات رکھتے ہوئے یہ ناممکن تھا کہ
 لشکن زیادہ دن تک ان پابندیوں کو برداشت کرے جن سے وہ پتھر برگ
 میں جکڑ دیا گیا تھا اور عمر کے آخری چار پانچ سالوں میں اس نے اتنی کم نظیں
 لکھیں کہ یہ سمجھ لینا چاہیے اس نے شعر کہنا بالکل ہی ترک کر دیا تھا۔ اس کی بجائے
 اس نے اخبار نویسی، ادبی تنقید اور افسانہ نویسی کا شغل اختیار کیا۔ اس کے
 سیاسی مضامین اس زمانے کے عام معیار سے بہتر نہیں، لیکن ادبی تنقید کے
 مسائل میں اس کی رائے مستند مانی جاتی ہے۔ اس کے رسالے کے ذریعہ سے
 کئی افشا پر دازوں اور شاعروں کا جو کہ بعد کو بہت مشہور ہوئے ادب کے
 سرپرستوں سے پہلے پہل تعارف ہوا، اور معاصر مصنفوں میں سے لشکن نے
 جس کسی کی نسبت جو رائے قائم کی اس کی بعد کو عام رائے نے عموماً تصدیق کی۔
 ناول نویس گوگول کی عظمت کا لشکن نے سب سے پہلے اعتراف کیا اور ناظرین
 سے اس کا حق دلوانے میں لشکن ہی کی کوشش زیادہ کامیاب ہوئی۔ شاعر
 چیوچف کے کلام کو بھی لشکن نے گناہی سے بچایا، اس کی پہلی نظیں لشکن نے
 لے گوگول کا ذکر روسی ناول نویوں کے سلسلے میں آگے آئے گا۔

یہ چیوچف کا ذکر اسی سلسلے میں ہوگا۔

اپنے رسالے میں شائع کیں اور وہ اصرار نہ کرتا تو ممکن ہی چھپنے کی نظمیں اشاعت سے بالکل محروم رہتیں۔ ان ادبی خدمات سے بہت زیادہ قابل قدر شپکن کی اپنی نثر کی تصانیف ہیں۔ اس کا تاریخی مضمون ”پوگاچیف کی بغاوت“ تاریخ اور ادب دونوں میں خاص اہمیت رکھتا ہے، اس کا ناول ”کپتان کی بیٹی“ جس کا قصہ پوگاچیف کی بغاوت پر مبنی ہے اب تک شوق اور دلچسپی سے پڑھا جاتا ہے اور روسی تاریخی ناولوں میں اس کا درجہ بہت بلند ہے۔ شپکن کے افسانے موضوع کے اعتبار سے خاص طور پر قابل ذکر نہیں، اگرچہ ان میں سے ایک ”حکم کی بیگم“ کا ایک روسی ماہر موسیقی نے لفظ ”آپے را“ بنا کر بہت چرچا کر دیا۔ شپکن کی نثر کی تصانیف کا جوہران کی زبان کی فصاحت اور لطافت ہے اور کارامزن اور توگرین کے سواروسی نثاروں میں کوئی بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

شپکن کے مذاق کی ہمہ گیری اور اس کی نظر کی وسعت کا ذکر آچکا ہے۔ یہ خصوصیت دستہ نف سکی کی رائے میں ذاتی نہیں بلکہ قومی ہے۔ یورپ پرستوں کی تعلیم اور سیاسی مصلحتوں کے باوجود دستہ نف سکی کے نزدیک روسی قوم میں انسانی ہمدردی کا وہ خاص جذبہ جو دوسری قوموں کی تہذیب اور تمدن سے دلچسپی، ان کی اعلیٰ سنگوں اور آرزوؤں سے گہرا روحانی تعلق پیدا کر دیتا ہے کمزور نہیں پڑا ہے اور ابھی تک روسی قوم کی رب سے نمایاں اور سبق آموز صفت ہے۔ روسی قوم تنہا اور سرد مہر نہیں رہ سکتی اور ہر بچے روسی کے دل میں یہ حوصلہ ہوتا ہے کہ وہ دوسری قوموں کے طرز معاشرت اور فلسفہ حیات سے واقفیت حاصل لے نامک اور گانے کے فنون کی آئینہ کش، جس میں ایک ٹرولنے کے بجائے ساز کے ساتھ گاتے ہیں

کرے اور اس کی حقیقت سمجھ لے، اپنے اور پرانے کے دکھ سکھ میں شریک ہو اور اس فساد کو جو جہالت، خود غرضی اور تنگ نظری کی وجہ سے قوموں کے درمیان قائم ہوا اور انھیں ایک دوسرے سے جدا رکھتا ہوا ہے اپنی ہمہ گیر محبت، رواداری، حقیقت بینی اور حق پرستی سے رفع کر دے۔ یہ قومی وصف دستہ لف سکی کے خیال میں لشکن کی شخصیت اور اس کے کلام کا خاص جوہر ہے اور اسی کی بنا پر لشکن کو صحیح معنوں میں قومی شاعر کہا جاسکتا ہے۔ لیکن لشکن میں صرف دوسروں کا مذاق اور خیالات سمجھنے کی صلاحیت نہیں تھی۔ اے کو، ادن لے گن اور تتیاناک سیرتین، روس کے دیہاتی مناظر اور گاؤں کی بود و باش کی دلکش تصویریں، اس کے ساتھ ہی عوام کے خیالات اور ان کی تہذیب سے گہرا لگاؤ اور وطن کی سچی محبت، یہ سب دلیلیں ہیں اس بیدار دلی اور مخلصانہ قوم پرستی کی جو لشکن کو روسی شاعروں اور انشا پردازوں کا سر تاج بنا دیتی ہے۔ دستہ لف سکی کا خیال صحیح ہو یا غلط، لشکن کی روس میں جو عظمت ہو اور اس کی ذات کا جو احترام کیا جاتا ہو اسے سمجھنے کے لیے ضروری ہو کہ اس قسم کے دعوے جیسے کہ دستہ لف سکی نے لشکن کے حق میں کیے ہیں نظر انداز نہ کیے جائیں لیکن فلسفی یا کسی بصیرت افروز فلسفے کے مبلغ کی حیثیت سے بہت زیادہ ممتاز نہیں، نظم کی خوبیاں بھی اس سے زیادہ اور بہت سے شاعروں کے کلام میں مل جائیں گی، مگر قومی ذہنیت پر جو اثر لشکن کا ہوا، قومی سیرت کا عکس جیسا اس کی نظموں میں ملتا ہے اور قوم کے عام مذاق سے جو مناسبت اس کے کلام کو ہو، اس کی مثال جرمن شاعر گوٹے کی شخصیت اور کلام کے سوا اور کہیں نہیں ملتی۔

یہی وجہ ہے کہ گولشکن بہت اور جوشِ ایثار سے محروم اور اخلاقی رہبری کے لیے ناموزوں تھا، اس کی نظموں نے قوم کو بیدار اور اپنی اصلیت سے آگاہ کرنے میں بہت مدد دی اور آئندہ نسلوں کی نگاہوں میں اسے روس کا صر پہلا نہیں بلکہ سب سے بڑا شاعر اور مدبر بنا دیا۔

دوسرا باب

لیرنٹوٹ (۱۸۱۱-۱۸۴۱)

جب پیتربگ میں یہ خبر مشہور ہوئی کہ پنٹن کے ایک ڈیوٹل میں کاری زخم لگا ہوا اور اس کے بچنے کی کوئی امید نہیں تو ایک ماتمی نظم بھی شہر کے گلی کوچے میں سنائی جانے لگی جو ایک نوجوان شاعر لیرنٹوٹ نے اس موقع پر لکھی تھی۔ نوجوان شاعر اس واقع سے بہت پہلے سے طبع آزمائی کر رہا تھا، مگر اس نظم کی بدولت ایک بارگی شخص کی نظر اس پر پڑنے لگی اور عام رائے نے اسے فوراً پنٹن کا جانشین تسلیم کر لیا۔

میخائل یوریے وچ لیرنٹوٹ ۱۸۱۱ء میں صوبہ تولامین پیدا ہوا۔ مورخوں کا بیان ہے کہ اس کا جد اعلیٰ سترھویں صدی میں اسکاٹستان سے ہجرت کر کے روس میں آ رہا تھا۔ یہ واقعہ صحیح ہو یا نہ ہو، لیرنٹوٹ مزاج، طبیعت اور خیالات کے لحاظ سے سچا روسی تھا، گو اس کی تعلیم اور تربیت میں کوئی ایسی خصوصیت نہیں تھی جو خود شناسی یا قومیت کے احساس کو بیدار کرتی۔ اس کے لیے پہلے ایک جرمن کھلائی رکھی گئی اور پھر ایک فرانسیسی استاد جس نے اسے نپولین اور

فرانسیسی ادب کی پرستش کرنا سکھایا۔ بعد کو لیرمنتوف ہمیشہ افسوس کرتا رہا کہ اسے
 لٹکن کی طرح ایسی کھلائی نہیں ملی جو اسے روسی عوام کے قصے کہانیاں سناتی
 ”جن میں تمام فرانسیسی ادب سے زیادہ شاعرانہ خوبیاں ہیں“ گھر پر تعلیم ختم
 کر کے لیرمنتوف ماسکو یونیورسٹی میں داخل ہوا، مگر سند لینے سے پہلے ہی یونیورسٹی
 چھوڑ کر پتیر برگ کے فوجی اسکول میں چلا گیا۔ اسکول میں اس کی زندگی معمولی
 کیڈٹوں کی سی تھی، سوا اس کے کہ وہ ”شراب میں شاعری بھی ملا کر پیتا تھا۔“
 یہاں اس کی تعلیم مکمل ہوئی تھی کہ لٹکن کے قتل کی خبر مشہور ہوئی اور لیرمنتوف
 نے وہ ماتمی نظم لکھی جس کا اوپر ذکر آچکا ہے۔ نظم نے پتیر برگ میں ہتھکڑیاں باندھ دیا۔ زار
 نکولائی اول نے اسے پڑھا اور بہت پسند کیا، مگر ساتھ ہی شاعر کو شورشا انگیزی
 کی قانونی سزا دینے کا حکم بھی جاری کر دیا۔ دوستوں اور سرپرستوں کی کوششوں نے
 لیرمنتوف کو بچا لیا اور اسے صرف پتیر برگ چھوڑ کر تفقاز کی فوج میں ملازم
 اختیار کرنا پڑی۔ تفقاز میں وہ ایک سال بھی نہیں رہا تھا کہ اس کی خطامعات
 ہو گئی اور پتیر برگ واپس آنے کی اجازت مل گئی۔ لیرمنتوف واپس آیا اور ایک
 اعلیٰ درجے کے ادیب کی شان سے آیا۔ شہر کی تمام محفلوں اور معزز خاندانوں
 میں اس کی بہت آؤ بھگت اور عزت کی گئی، لیکن تھوڑے ہی دنوں میں اس
 کی طبیعت شہری زندگی سے اکتا گئی۔ وہ تفقاز کی فوج میں منتقل کیے جانے
 کی درخواست دینے والا تھا کہ فرانسیسی سفیر کے لڑکے سے ڈیوئل لڑنے کی بنا پر
 حکومت نے خود ہی اسے دوبارہ تفقاز روانہ کر دیا۔ اس مرتبہ وہ کئی لڑائیوں میں
 لے فوجی اسکولوں کے طالب علم جنھیں تنخواہیں دی جاتی ہیں۔

شریک ہوا اور ایسی بے بالی اور جواں مردی دکھائی کہ فوج میں بھی اس کا سکے بیٹھ گیا۔ لیکن وہ دنیا میں اب صرف چند روز کا مہمان تھا۔ پتیر برگ سے رخصت ہوتے وقت اس نے اپنے تمام دوستوں سے کہہ دیا تھا کہ وہ زندہ واپس آنے والا نہیں اور یہی وہ تفرقہ کے رستے میں سب جان پہچان والوں سے کہتا ہوا گیا۔ تفرقاؤں سے تین سال نہیں گزرے تھے کہ ایک ڈیوئل میں مارا گیا (۱۵ جولائی ۱۸۴۱ء)۔

لیرنٹوف نے عجیب و غریب طبیعت پائی تھی۔ اس کی ماں ایک شاعرہ مزاج کی عورت تھی جس نے بد قسمتی سے ایسا شوہر منتخب کیا اور ایسی زندگی بسر کی جس سے اس کی ساری امیدیں اور جوصلے خاک میں مل گئے اور وہ بیچاری مایوسی اور حزن میں ایسی مبتلا ہوئی کہ آخر کار تپ دق کا شکار ہو گئی۔ لیرنٹوف کی ماں کے بعد خاندان میں غم اور افسردگی کی فضا اس کی نانی کی ذات سے قائم رہی اور لیرنٹوف، جس کے دل پر ماں کے حزن کا گہرا نقش موجود تھا، غمگین جذبات میں اور زیادہ ڈوب گیا۔ پتیر برگ کے فوجی اسکول میں داخل ہونے پر اسے ان جذبات کی قید سے رہائی ملی، لیکن یہ دوا مرض سے بھی بدتر ثابت ہوئی۔ لیرنٹوف نہ صرف ”شراب کے ساتھ شاعری ملا کر پیتا تھا“ بلکہ عیاشی اور اوباشی بھی۔ یہ علاج نہیں تھا، صرف ایک قسم کی مدہوشی تھی جس نے اسے اپنے جوہر سے بے خبر کر دیا، ایک نشہ جس سے نجات پانے کی وہ خود دو عائن مانگا کرتا تھا۔ یہ عرصہ جو اس نے فوجی اسکول میں گزارا ہر لحاظ سے اس کی عمر کا بدترین حصہ تھا۔

انہیں عادتوں کی وجہ سے جو اس نے یہاں سیکھیں اسے بعد کو ”زہریلے کپڑے“ کا ناقابل رشک خطاب ملا اور بہت سے شریف آدمیوں کو یقین ہو گیا کہ گو

اس کا کلام دوسروں کے لیے تریاق کا اثر ضرور رکھتا ہے، لیکن اس کی شخصیت
ہنایت نہ رہی ہے۔

بچپن کا ماحول اور فوجی اسکول کی زندگی کا طریقہ بیان کر دینے سے وصل
لیر منتوف کی سیرت کا معمہ حل نہیں ہوتا۔ اس کی شخصیت ایک منظر تھی جسے نفیست
میں ”دہری شخصیت“ کہتے ہیں۔ اس منظر کی خاص پہچان یہ ہے کہ ایک ہی شخصی کی
سیرت کے دو متضاد پہلو ہوتے ہیں جن کے متضاد ہونے کا اسے مطلق احساس
نہیں ہوتا، اس کی دونوں ”شخصیتوں“ میں سے ہر ایک کی الگ اور مخصوص
طبیعت، مزاج، عادتیں اور رجحانات ہوتے ہیں اور جب وہ ایک ”شخصیت“
سے دوسری میں منتقل ہوتا ہے تو پہلی کی ذہنی اور مزاجی خصوصیات صرف ترک
نہیں کر دیتا بلکہ ان سے بالکل بیگانہ ہو جاتا ہے اور انھیں اس طرح بھول جاتا
ہے کہ گویا وہ اس کی طبیعت میں کبھی پائی ہی نہیں جاتی تھیں لیر منتوف کی ظاہری
زندگی پر نظر ڈالی جائے تو یقین نہیں آتا کہ اس کا کلام پاکیزہ ہو سکتا ہے اور اس
کا کلام پڑھ کر سخت حیرت ہوتی ہے کہ اس نے اپنی عمر کی قلیل مدت زیادہ تر
کیمینی اور ظالمانہ حرکتوں میں کیونکر ضایع کی۔ لیکن ہم نہ اس کے کلام کی پاکیزگی
سے انکار کر سکتے ہیں اور نہ اس کا دامن ان الزاموں سے پاک کر سکتے ہیں جو
معاصرین اس پر لگاتے تھے۔ لیر منتوف کچھ دنوں بد معاشوں کی زندگی بسر
کر کے دفعتاً ایک معصوم شاعر بن جاتا تھا اور پھر اسی طرح دفعتاً ایک پختہ کار
بد معاش: اسی سے خیال ہوتا ہے کہ اس کی شخصیت دہری تھی، ایک تو بد معاش
کی اور دوسری شاعر کی اور دونوں ایک دوسرے سے بالکل جدا اور بیگانہ تھیں

لیرننتون نے اپنی ”بد معاش“ شخصیت کا خاکہ ایک ناول میں کھینچا ہے جس کا عنوان ”ہمارے زمانے کا ایک جواں مرد“ ہے۔ ناول کا ہیرو پچورن سیرت کے لحاظ سے لیکن کے اون یے گن سے بہت ملنا جلتا ہے۔ اس کا دل بھی محبت اور وفاداری کی لذتوں سے نا آشنا ہے اور اس کی سرگزشت کا جو حصہ ہائے سامنے پیش کیا جاتا ہے اس میں اول سے آخر تک عورتوں کے دل بھانے اور دکھانے کے قصے ہیں، گویا پچورن کو عورتوں سے کوئی عداوت ہے اور انھیں ستانے کا خاص شوق۔ ایک مرتبہ اسے ایک نواب کی لڑکی سے اسی قسم کی عداوت ہو جاتی ہے۔ ہر جگہ، خواہ مخمل ہو یا شہر کا باغ، پچورن جہاں اس لڑکی کو دیکھ لیتا ہے اسے طرح طرح سے گردیدہ کرنے کی کوشش کرتا ہے اور جب اس بیچاری کے دل میں محبت کی آگ بھڑک اٹھتی ہے تو پچورن اسے ایک لمبی چوڑی تقریر میں سمجھاتا ہے کہ وہ عورتوں کو اپنا گردیدہ کرنے پر فطرتاً مجبور ہے، مگر محبت کی راہ درسم برتنے کا حوصلہ نہیں کر سکتا کیونکہ اسے آزادی ہر نعمت سے زیادہ عزیز ہے اور اسے وہ محبت کے مول بھی دینے پر کبھی راضی نہیں ہو سکتا۔ اس کے دل میں وفاداری اور ایثار کا مادہ نہیں، لیکن اس کی فطرت کا تقاضا ہے کہ سب مرد اس سے مرعوب رہیں اور سب عورتیں اس پر فدا ہوں۔

لیرننتون نے خود بھی کئی شریف عورتوں کے ساتھ پچورن کا سا سلوک کیا اور مردوں عورتوں کے تعلقات اس کے نزدیک اور کچھ ہو بھی نہیں سکتے تھے۔ مگر پچورن اور لیرننتون کی مشابہت بس یہیں پر ختم ہو جاتی ہے لیرننتون کی طبیعت میں بہت سے جوہر تھے جن کا اسے اُس وقت مطلق احساس نہیں

ہوتا تھا جب اس کی عیاش اور بد معاش شخصیت حاوی ہوتی اور پچورن کی صورت میں اپنا عکس اُتارتے ہوئے اس نے اخیں کا خیال نہیں رکھا۔ اس کے اخلاق تو آخر عمر تک ایک تیرہ دل عیاش کے سے رہے، لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ اگر لیر منتوف کو موت نے نہ آگھیرا ہوتا تو اس کی شاعر شخصیت اپنے حریف پر رفتہ رفتہ غالب آجاتی۔ اب صرف چند بلند پایہ نظمیں ہیں جن سے ہم اس روحانی عظمت کا اندازہ لگا سکتے ہیں جو لیر منتوف کو حاصل ہوتی اگر اسے کچھ دن اور جینا نصیب ہوتا۔ قبل از وقت موت نے صرف اسے اس عظمت سے محروم نہیں رکھا بلکہ ان گناہوں کی تلافی کا بھی موقع نہیں دیا جو اس کی عیاش اور بد معاش ”شخصیت“ سے سرزد ہوئے اور جنہیں بہت سے قوم پرست روسی اس کا کلام پڑھ کر بھی معاف نہ کر سکے۔

لیر منتوف نے جب لکھنے کو قلم اٹھایا تو وہ اپنی خاندانی زندگی کی مایوسی بھری فضا سے گھرا ہوا تھا اور اس کی شرمع جوانی کی نظمیں اسی رنگ میں ڈولی ہیں۔ مایوسی نے تو آخر عمر تک اس کا دامن نہیں چھوڑا، مگر اس میں نئے جذبات کی آمیزش ہوتی رہی۔ سب سے پہلے لیر منتوف پر اس وحشت اور طوفانوں کی آرزو کا غلبہ ہوا جو بائرن کے کلام نے یورپ میں ایک وبا کی طرح پھیلانا کھی۔ لیر منتوف کی ابتدائی نظموں میں اس کا اثر بہت نمایاں ہے اور اس میں شک نہیں کہ وہ زیادہ تر بائرن کی نقل میں لکھی گئی تھیں۔ لیکن رفتہ رفتہ لیر منتوف کی طبیعت نے بائرن اور رومانی تحریک کے اثرات جذب کر کے اس طرح اپنا لیے کہ ان میں اُپج اور جدت کی شان پیدا ہو گئی۔ وحشت اور

”طوفان کی آرزو“ جس انداز سے ”باد بانی کشتی“ میں دکھائی گئی ہر بائرن کی نقل نہیں، لیبرمنٹون کے اپنے دل کی کیفیت ہے:

ایک تنہا باد بانی کشتی، گہرے میں لپٹی ہوئی
لاجوردی سمندر کی سطح پر چمک رہی ہے۔

وہ دور دراز ملکوں میں کیا تلاش کرنے نکلی ہے؟
اپنے وطن میں کیا چھوڑ چلی ہے؟

موجیں کھیلتی ہیں، ہوا کے جھونکے چل رہے ہیں،
مستول جھکتا ہے، چڑاتا ہے...

افسوس، اسے نہ خوشی کی تلاش ہے
اور نہ وہ خوشی سے بھاگتی ہے۔

نیچے موجیں بہ رہی ہیں۔

اد پر سنہری کرنیں بکھری ہیں

لیکن اس دیوانی کو آرزو ہے طوفانوں کی،

گویا سکون طوفانوں ہی میں ملتا ہے۔

لیبرمنٹون اور بائرن کی مشابہت دراصل محض سطحی ہے۔ دہشت، بے چینی

غور اور اہل دنیا سے بیزار سی نے لیبرمنٹون کی روزمرہ زندگی میں چاہے جتنی

ناگوار شکل اختیار کی ہو، شعر بے بنفہ ان خصوصیتوں میں مایوسی، درد اور کبھی

کبھی ایک لطیف مذہبیت کی ایسی آمیزش ہو جاتی ہے جو ان کی تاثیر بالکل بدل

دیتی ہے۔ وہ زندگی سے بیزار ہی ظاہر کرتا ہے نہ۔

طبیعت اکتا گئی، دل غمگین ہو اور ایسا کوئی بھی نہیں
 جس کا روحانی پریشانیوں میں سہارا لوں...
 خواہشیں کروں؟ کیا فائدہ خواہشیں کرنے سے جب وہ کبھی پوری نہ ہوں،
 اور زمانہ گزرتا جائے، عمر کا بہترین زمانہ؟
 محبت کروں؟... مگر کس سے؟... چند روز کے لیے؟ بیکار کی دروسری ہے؟
 اور عہدہ کے لیے کسی سے محبت کرنا ممکن نہیں۔
 اپنے دل پر نظر ڈالوں؟ وہاں گزشتہ زندگی کا نام و نشان بھی نہیں۔
 گزری ہوئی خوشیاں اور رنج سہی مٹ گئے ہیں۔
 جذبات کی ہستی کیا ہے؟ کبھی نہ کبھی عقل کے سمجھانے سے
 ان کا خوشگوار بخار جاتا رہتا ہے...
 زندگی، اگر کوئی ٹھنڈے دل سے غور کرے
 محض ایک بے معنی اور سبب وہ دل لگی ہے۔
 خدا کا طنزاً شکر یہ ادا کرتا ہے:

میں ہر چیز، ہر نعمت کے لیے تیرا شکر یہ ادا کرتا ہوں؛
 جذبات کی پہناں اذیتوں کا،
 آنسوؤں کی سوزش، بوسے کے زہر کا،
 دشمنوں کے کینے، دوستوں کی غیبت کا،
 اپنی روح کی بے تابی کا، جو ایک دیرانے میں مڑجھا رہی ہے،
 ان سب امیدوں کا جو مجھے دھوکا دے گئی ہیں۔

بس اب ایسا کر کہ مجھے تیرا شکریہ
بہت دنوں تک نہ ادا کرنا ہو،

اور ان دونوں حالتوں میں اس کا خلوص ایسا نمایاں، اس کا جذبہ آناشید
ہو کہ بائرن کا سارا جوش اس کے مقابلے میں سرد اور بناوٹی معلوم ہوتا ہے۔ لیکن
شکوہ سنجی، غرور، بنی نوع انسان کی تحقیر اور زندگی سے بیزاری کے موضوع پر
یہ منتوف نے جو نظمیں لکھیں وہ اسے اس کی اصلی صورت میں نہیں دکھاتی ہیں
ذیل کی نظم اس کی روحانی کیفیات کا اصل رنگ بہت بہتر ظاہر کرتی ہے اور اس
کی شخصیت کی گہرائیوں کا صحیح پتہ دیتی ہے:

آدھی رات کو آسمان پر ایک فرشتہ اڑتا ہوا
دھیمی اور سٹیپی آواز سے ایک گیت گارہا تھا،

اور چاند اور بادلوں اور ستاروں کا ہجوم
اس کا پاک گیت سننے کو ہمہ تن گوش تھا۔

اس کا گیت معصوم روحوں کی شادمانی پر تھا

جب وہ جنت کے باغوں میں آرام کرتی ہوں گی،

اور خدا کی نبرگی پر اور اس کی حمد میں کوئی ریاکاری نہ تھی۔

فرشتہ ایک ننھی روح اپنی گود میں

دنیا کے غم اور آنسوؤں کے لیے لارہا تھا۔

ننھی روح میں اس کے گیت کی صدا

زندہ رہی، اگرچہ گیت اسے یاد نہ رہا۔

دنیا میں بہت دنوں تک وہ بے چین
 اور ایک عجیب آرزو میں ڈوبی رہی،
 کیونکہ دنیا کے میٹھے گیت اس کے دل میں
 جنت کے نغموں کی کیفیت پیدا نہیں کر سکتے تھے۔

ایک روزی نقاد، مرثکوف سکی، کا خیال ہے کہ لیر منتوف خود بھی ایک
 ایسی ہی ننھی روح تھا جسے دنیا کی تمام نعمتیں نہایت درجہ حقیر معلوم ہوتی تھیں،
 اس لیے کہ پیدائش سے قبل کی ”جنتی“ زندگی کی یاد اس کے دل میں تازہ تھی،
 اور دونوں زندگیوں کا فرق محسوس کرنے سے اس کی طبیعت میں وہ دل گداز
 غم اور وحشت اور دیوانگی پیدا ہو گئی جو اس کے کلام میں اتنی نمایاں ہے۔ لیکن
 ”جنتی“ زندگی کا دروازہ پھر اس پر رفتہ رفتہ کھل رہا تھا۔ اپنی کینی حرکتوں
 کے باوجود وہ ایسی نظم بھی لکھ سکتا تھا:

دل پر جب کوئی لمحہ گراں گزرتا ہے
 اور نگلیں جذبات ہجوم کرتے ہیں،
 تو میں ایک اعجاز نما دعا
 دل ہی دل میں پڑھ لیتا ہوں۔

زندہ الفاظ کی ہم آہنگی میں
 ایک جاں فراتا شیر ہوتی ہے،
 اور ایک پاک قوت، جو فہم و ادراک سے بالاتر ہے،
 اس میں مضمر ہوتی ہے۔

دل پر سے ایک بوجھ سا اتر جاتا ہی،
 شک کا نام و نشان باقی نہیں رہتا،
 تب میں ایمان لاتا ہوں، روتا ہوں،
 اور پھر آہستہ، آہستہ

اس میں شک نہیں کہ یہ مفتوح کا دل کبھی کبھی اس قدر پاک ہو جاتا تھا
 کہ لطیف ترین مذہبیت کے جذبے کی جولان گاہ بن سکے، لیکن وہ خوب جانتا
 تھا کہ اس جنس کے خریدار بہت کم ہوتے ہیں۔ اپنی نظم ”سنگمیر“ میں اس نے
 اہل دنیا کی اس بے حسی، خود پسندی، اور سنگ دلی کی شکایت کی ہے جو انہیں
 حقیقت سے بے خبر رکھتی ہے:

جس وقت سے کہ منصف ازلی نے
 مجھے پیسری کا علم غیب عطا فرمایا،
 میں لوگوں کی پیشانیوں پر بدی اور گناہوں کی
 لمبی داستانیں پڑھنے لگا ہوں۔
 میں محبت اور راست بازی کے پاک اصول
 بے خطر بیان کرنے لگا،
 مگر وہی جو عزیز اور قریب تھے
 مجھ پر دیوانوں کی طرح پتھر پھینکے لگے۔
 میں نے سر پر راکھ ملی
 اور آبادیوں کو چھوڑ کر خالی ہاتھ چل بسا،

اب دیرانوں میں رہتا ہوں اور خدا مجھے بھی
رزق پہنچاتا ہے، جیسے چرند و پرند کو۔

میرے دل میں خدا کی دی ہوئی امانت ہے،
ساری مخلوق میری تابعدار ہے،
ستارے اپنی شعاعوں سے کھلتے ہوئے
مجھ سے ہم کلام ہوتے ہیں۔

لیکن جب کبھی میں پُرشور شہر سے
قدم بڑھاتا گزرتا ہوں
تو بوڑھے خود پسندی سے مسکرا کر
بچوں سے کہتے ہیں :

”دیکھو“ یہ تمہارے لیے ایک مثال ہے۔

یہ مغرور تھا، اسے ہمارے ساتھ بسر کرنا گوارا نہ ہوا۔

بے وقوف، ہمیں یقین دلانا چاہتا تھا

کہ اس کی زبان سے حق کے پیغام نازل ہوتے ہیں۔

”بچو اسے غور سے دیکھو!“

یہ کیسا اُداس ہے، ڈبلا اور پیلا،

دیکھو یہ کیسا محتاج ہے اور رنگا،

دیکھو سب اس کی کیسی تحقیر کرتے ہیں!“

لیر منتوت کے دل میں نہ بہیت کا جذبہ کبھی کبھی شدید ضرور ہو جاتا تھا اور اس کی تیز آگ ماسوا کے خس و خاشاک کو جلا کر خاک کر دیتی تھی، مگر شاعر کا ذہن عقیدے کی پابندیوں سے بہت گھبراتا تھا، اس لیے وہ نہ دنیا کو سدھار سکا اور نہ اس نے اپنی نجات کی کوئی صورت نکالی۔ ایک نظم میں اس نے خدا سے التجا کی ہے کہ اگر اسے گناہوں سے بچانا مقصود ہے تو اس کی شاعرانہ طبیعت اور شعر کہنے کی استعداد اس سے واپس لے لی جائے، ورنہ اسے رند خرابات کی زندگی بسر کرنے کے سوا اور کوئی چارہ نہ ہوگا۔ لیکن نہ خدا نے اپنی دین واپس لی، نہ لیر منتوت اپنی دامن کو دنیا کی آلائشوں سے پاک رکھ سکا۔ مایوسی نے آخر کار اسے دنیا اور ہستی سے ایسا بے تعلق کر دیا کہ اس کی صرف ایک تمنا رہ گئی اور وہ اس طرح سے فنا ہو جانا کہ ہستی کی مطلق خبر نہ رہے۔ اپنی ایک معشوقہ سے کہتا ہے:

تو دعا کی الفاظ دہراتی ہو

اور تیرا دل امیدوں سے لبریز ہے،

تو کہتی ہو اس کے بعد بھی ایک زندگی ہوگی

اور دلیرانہ اس پر ایمان لائی ہو۔۔۔۔۔ مگر میں؟

جس شخص کے لیے اس عمر کی قلیل مدت ایک مصیبت ہے

وہ حیاتِ جاوداں کی تمنا کیسے کرے؟

میں دائمی زندگی کا بار کیونکر سنبھال سکوں گا،

جب مجھے اس زندگی میں دم بھر فنا کا سکون نہ ملنے سے تکلیف ہوتی ہے،

فنا کی آرزو لیر منتوف کے دل میں اور بھی تیز اس وجہ سے ہو گئی کہ وہ اپنی ”شاعر“ شخصیت سے محبت کرنے لگا تھا، مگر اسے اپنی ”عیاش اور بد معاش“ شخصیت پر قابو پانے کی کوئی اُمید نہ تھی۔ اس احساس نے کہ وہ ان دونوں کی جنگ میں حصہ لینے سے محروم اور جنگ کا جو فیصلہ ہو اسے تسلیم کرنے پر مجبور ہو اس کے روحانی توازن کو قائم نہ رہنے دیا اور اس کے سکون کے لمحے بھی ”بد معاش“ شخصیت کی فتح کے خوف کے نذر ہونے لگے۔ جیسا کہ وہ اپنے ایک مرغوب استعارے میں کہتا ہے:

..... میرا یہ سکون

شیطانوں کے نندا سے گروہ کو خاموش رکھنے کے لیے
ایک اڑتے ہوئے فرشتے کی لوری ہے۔

فرشتہ اڑتا ہوا چلا جائے گا اور شیطان بیدار ہو کر پھر قیامت برپا کریں گے۔ لیر منتوف کے دل میں یہ اندیشہ وحشت پیدا کرتا ہے، لیکن مایوسی اسے یقین دلاتی ہے کہ اس آفت سے بچنے کو کوئی صورت نہیں۔ اسی کیفیت، یعنی حق اور باطل کی اس جنگ کو جو اس کی روح پر قبضہ کرنے کے لیے ہو رہی تھی لیر منتوف نے اپنی سب سے لمبی نظم ”شیطان“ میں بیان کیا ہے۔ یہ شیطان ایک راندہ درگاہ فرشتہ ہے جو بہشت سے نکلنے کے بعد دنیا میں مارا مارا پھرتا رہا ہے اس حقیر دنیا پر راج کرتے ہوئے

اس نے بغیر کسی خواہش یا خوشی کے بُرائی کے بیج بوئے۔

کہیں اسے اس فن کی مشق میں

کسی مخالفت سے سابقہ نہیں پڑا۔
اور بُرائی کرتے کرتے بھی اُس کی طبیعت اُکتا گئی۔

یوں ہی آوارہ گردی میں وہ ایک بار فقہ زہنچا اور گرجان کی کسی
دادی میں اسے ایک لڑکی جس کا نام تارا تھا، نظر آئی شیطان کے افسردہ دل
پر تارا کے حُسن نے بہت اثر کیا۔ وہ ایک رئیس کی بیٹی تھی، شیطان نے جب
اسے دیکھا تو اس کی شادی کی تیاریاں ہو رہی تھیں اور شام ہی کو اس کا
دولہا سے لینے کو آنے والا تھا۔ شیطان کی سازش سے کچھ ترک ڈاکوؤں
نے اس قافلے پر جودولہا اپنے ساتھ لارہا تھا، حملہ کیا، قافلے والے سب
بھاگ گئے اور ڈاکوؤں سے مقابلہ کرنے میں دولہا کے بہت کاری زخم لگے۔
اپنے وعدے کے مطابق وہ شام کو دلہن کے گھر تو پہنچ گیا، مگر پہنچنے سے پہلے
اس کا دم نکل چکا تھا اور وہ اپنے گھوڑے کی ایال پکڑے لٹکا تھا۔ تارا کو
جب اس کی خبر ہوئی تو وہ اپنی قسمت پر رونے لگی اور چاہتی تھی کہ روتے
روتے اپنی جان دے دے کہ اس کے کان میں ایک سُریلی پُور دُآواز آئی
جس نے دم بھر میں اس کے دل سے سارا غم دور کر دیا۔ یہ آواز شیطان کی تھی،
جو تارا کو تسلی دینے آیا تھا۔ تارا نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا، مگر اسے کوئی
نظر نہ آیا۔ وہ اس کشمکش میں تھی کہ اس سُریلی آواز کونستی رہے جس نے اس
پر جادو سا کر دیا تھا یا اپنے دولہا کا ماتم کرے کہ نیند نے اس کی آنکھیں بند
کر دیں۔ اس کے بعد شیطان کی آواز، غمگین مگر تسلی بخش، اسے اکثر سنائی دیتی
رہی اور اس اندیشے کے باوجود کہ وہ کسی باغی یا مجرم فرشتے کی آواز نہ ہو، تارا

اس پر ایسی فریفتہ ہو گئی کہ وہ باپ کے اصرار پر بھی شادی سے انکار کرتی رہی اور جب باپ کو بہت مصر پایا تو عورتوں کی ایک خانقاہ میں چلی گئی۔ باپ کی خفگی سے بچنے کے علاوہ تمارا کی ایک غرض یہ بھی تھی کہ شیطان سے بچھا چھڑلے کیونکہ اسے یقین تھا کہ خانقاہ کے آس پاس بھی شیطان کا گزرنا ناممکن ہوگا۔ لیکن وہ یہ بھول گئی تھی کہ اس کے دل میں شیطان کی طرف جو رغبت پیدا ہو گئی تھی اس سے شیطان کو خانقاہ میں بھی داخل ہونے کا حق حاصل ہو گیا تھا اور وہاں پہنچتے ہی تمارا کو اس کی افسوں گر آواز پھر سنائی دی۔ شیطان اب زیادہ شوخ ہو گیا تھا۔ اس نے اپنا تعارف کرایا:

میں وہ ہوں جس کی صدا تو نے

رات کی خاموشی میں سنی تھی....

میں وہ ہوں جس سے کوئی محبت نہیں کرتا،

وہ جس کے سامنے ساری مخلوق سر جھکا تی ہے....

میں اہل دنیا کا دیوتا ہوں،

علم اور آزادی کا بادشاہ ہوں،

آسان کا دشمن، فطرت کا باطل عنصر ہوں،

اور تو دیکھتی ہے، میں تیرے قدموں پر ہوں....

تمارا کے سوال پر اس نے اپنا سارا ماجرا سنایا اور ایسے پُر درد انداز

سے کہ بیچاری کا دل بھر آیا۔ اس نے شیطان سے محبت کرنے کا وعدہ کیا،

اس شرط پر کہ وہ توبہ کرے اور خدا کو سجدہ کرے۔ شیطان نے بہت سی قسمیں

کھائیں اور تمہارا کو یقین دلایا کہ
 ”میں چاہتا ہوں آسمان والوں سے صلح کرنا،
 محبت کرنا، سرسجدہ ہونا،
 حق پر ایمان لانا،

اور اس بھروسے پر کہ شیطان راہِ راست پر آجائے گا حینِ تمہارے
 دل و جان سے اپنے آپ کو شیطان کے حوالے کر دیا۔ شیطان کے پیار کا قاتل
 نہ ہر بجلی کی طرح اس کے سینے میں سرایت کر گیا، اس نے ایک چیخ ماری
 جس میں سب کچھ تھا: محبت، درد،
 مہمانہ شکایت اور التجا،
 جدائی کی جاں گداز مایوسی،
 بہارِ زندگی سے رخصت...

لیکن تمہارا کی جان لینے سے شیطان کی آرزو پوری نہ ہو سکی قبل اس
 کے کہ وہ تمہارا کی روح پر قبضہ کرے اس کا ایک اور دعوے دار پہنچ گیا، ایک
 فرشتہ جو بیچاری گمراہ تمہارا کی روح کو نجات کی خوش خبری سنا کر اپنی گود میں
 جنت کی طرف لے چلا۔ شیطان نے رستہ روکنا چاہا، مگر فرشتے نے ایک قہر
 آلود نظر سے اسے سامنے سے ہٹا دیا اور تمہارا کی تعریف میں یہ کہتا ہوا چلا گیا:

صناعِ قدرت نے ایسی روحوں کو

لطیف ترین جوہر سے بنایا ہے۔

یہ دنیا کے بے نہیں پیدا کی گئی ہیں

نہ دنیا ان کے لیے ۔

اس نے محبت کی ہو، مصیبتیں اُٹھائی ہیں
اور محبت کرنے والوں پر محبت کا دروازہ کھلا ہے۔

شکوہ سنجی، اطاعت اور سرکشی، نجات اور عذاب کے مسائل نے
لیرمنتوف کو بہت مصروف رکھا، پھر بھی اس کے کلام کا ایک خاصہ ایسا
ہی جس میں شاعری کے سوا اور کچھ مقصود نہیں۔ اس جتنے میں رومانیت کا کچھ
ہلکا سا رنگ نظر آتا ہے، مگر لیرمنتوف کی سادگی اور حقیقت نگاری نے اس میں
اور ہی کیفیت پیدا کر دی ہے، ”وصیت“ میں ایک سپاہی جو مرنے کے قریب
ہو اپنے ایک دوست سے کہتا ہے:

میرے دوست، میں تمہارے ساتھ
کچھ دیر تنہا رہنا چاہتا ہوں:
کہتے ہیں اس دنیا میں

مجھے صرف چند دن رہنا نصیب ہوگا۔

تم وطن جانے والے ہو،

دیکھو... مگر اس سے فائدہ کیا،

سچ پوچھو تو وہاں کسی کو

میرے انجام کی فکر ہی نہیں۔

خیر، اگر کوئی پوچھے۔

یا جو کوئی بھی پوچھے -
 اس سے کہ دینا کہ ایک لڑائی میں
 میرے سینے پر گولی لگی،
 اور میں نے عزت سے اپنے بادشاہ کے لیے جان دی۔
 کہ دینا کہ یہاں کے ڈاکٹر بالکل اناڑی ہیں،
 اور میں نے اپنے وطن کو
 سلام بھیجا ہی۔
 میرے ماں باپ تمھیں
 شاید ہی زندہ ملیں...
 مجھے افسوس ہی تو اس بات کا
 کہ ان کے دل پر چوٹ لگے گی۔
 لیکن اگر دونوں میں سے کوئی زندہ ہو
 تو کہ دنیا میں خط لکھنے میں بہت سستی کرتا ہوں،
 کہ دینا ہمارا دستہ لڑائی پر بھیجا گیا ہی
 اور میری واپسی کا ابھی انتظار نہ کریں۔
 انھیں کی ایک ہمسائی ہی...
 تمھیں یاد ہوگا، ہم کو جدا ہوئے
 ایک مدت گزر گئی... وہ تم سے میری نسبت
 کچھ نہ پوچھے گی... کوئی پروا نہیں،

تم اسے سارا حال ٹھیک ٹھیک سنا دینا،
 اس کے دروے نا آشنا دل پر رحم نہ کھانا -
 اچھا ہر اگر وہ چند آنسو بہا ڈالے ...
 اس کا کیا بگڑ جائے گا۔

اس قسم کی نظم میں یہ لکھنا کہ ”یہاں کے ڈاکٹر بالکل اناری میں“ کہہ دینا
 کہ میں خط لکھنے میں بہت سستی کرتا ہوں“ اور ”وہ تم سے میری نسبت کچھ نہ پوچھے گی“
 رومانی اصولوں کے خلاف ہے، مگر غور کیا جائے تو یہی تین مصرعے اس نظم کی جان
 ہیں اور اسے واقعی ایک زندہ، درد بھرے دل کا آخری پیغام بنا دیتے ہیں جو اپنی
 عاجزی اور مسکینی سے اور بھی پُر تاثیر ہو جاتا ہے۔ یہی عجز، یہی تسلیم، یہی بچا رگی اور
 زندگی کے انجام سے واقف ہونے کا میٹھا میٹھا غم اُس کزاک ماں کے گیت
 میں بھی ہے جو اپنے ننھے بچے کو سلا رہی ہے:

بڑا ہو کر تو صورت سے سوراہو گا،
 اور دل میں سچا کزاک،

میں تجھے رخصت کرنے کو باہر نکلوں گی
 اور تو دور سے ہاتھ ہلاتے گا۔

اس رات کو میں چھپ کر
 کتنے گرم آنسو بہاؤں گی۔

سو، میرے فرشتے، آرام سے نیند کا مزہ لے لے کر،
 سو، میرے بچے، سو۔

جدا ئی میں میرا دل پریشان ہوگا،
 تیرے انتظار میں تڑپتی رہوں گی،
 سارے دن دعائیں مانگوں گی،
 اور رات کو نال دیکھوں گی۔

میں سمجھنے لگوں گی کہ پردیس میں
 تیرا دل گھبراتا ہے،
 سو، جب تک تو ہر فکر سے آزاد ہے،
 سو، میرے بچے، سو۔

میں تجھے سفر کے لیے
 ایک مقدس شبیہ دوں گی،
 تو اسے دعا مانگتے وقت

اپنے سامنے رکھنا،
 خطرناک لڑائی کے لیے تیار ہوتے ہوئے
 اپنی ماں کو یاد کرنا...
 سو، میرے پیارے چاند کے ٹکڑے،
 سو، میرے بچے سو۔

یاد وطن کے موضوع پر لبرنتون کی ایک نہایت عمدہ اور دل گداز
 نظم ہے جس کا عنوان ”مبتدعی راہب“ ہے۔ یہ راہب ایک نوجوان ہے،
 جس کی بچپن سے ایک خانقاہ میں پرورش ہوئی ہے۔ اسے معلوم نہیں کہ اس کا

ماں باپ کون تھے اور کہاں ہیں۔ راہب اس پر بہت مہربان ہیں، لیکن یہ خیال کہ وہ اپنوں سے دور پردیس میں پڑا ہو اور ممکن ہو اس کی ساری عمر غریب الوطنی ہی میں گزر جائے اسے ہر وقت ستا رہتا ہے۔ آخر میں اس کی بے چینی اس قدر شدید ہو جاتی ہے کہ وہ اسے برداشت نہیں کر سکتا اور ایک رات کو خانقاہ سے بھاگ نکلتا ہے۔ اسے رستے کی مطلق خبر نہیں، ساری رات وہ جنگل میں بھٹکتا ہے، اس کی ایک درندے سے لڑائی ہوتی ہے جس میں وہ ہت زخمی ہو جاتا ہے اور سویرے جب راہب بہت تلاش کرنے کے بعد اسے پاتے ہیں تو وہ قریب مرگ ہوتا ہے، مگر وطن کی یاد میں اسی طرح بے چین۔ اس نظم کا جو ہر مناظر قدرت کی تصویریں ہیں جنہیں شاعر نے اس خوبی سے پس منظر کے طور پر استعمال کیا ہے کہ نوجوان راہب کی بے چینی اور ٹرپ صرف بہت زیادہ شدید اور دل سوز ہی نہیں بلکہ پُر مغنی بھی ہو جاتی ہے۔

لیر منتون کا قلم فقط مناظر قدرت اور انسانی جذبات ہی کے بیان کرنے میں مشاق نہیں۔ اس نے جنگ بورودمی نو کی اسی عنوان کی ایک نظم میں تصویر کھینچی ہے اور لڑائی کی ساری کیفیت ایک سپاہی کی زبانی سنائی ہے جو اس میں شریک تھا۔ یہ نظم ثابت کر دیتی ہے کہ لیر منتون لڑائی کے کشت و خون اور لڑنے والوں کے دل کی حالت دکھانے میں تالٹائی سے کچھ کم نہ تھا اور تالٹائی اس فن میں استاد مانا گیا ہے۔ بورودمی نو سے زیادہ دلچسپ ایک اور جنگ کا بیان ہے جو اس کی نظم ”وائے ریکٹ“ میں ملتا ہے لیر منتون

لے ایک دریا کا نام ہے۔

اپنی ذاتی زندگی میں من چلا، ظالم اور سنگ دل ہونے کے باوجود اس فلسفہ حیات کی طرف سے بے حس نہیں تھا جس کی تبلیغ نے نالستائی کو اتنا مشہور کر دیا۔ ”والے ریک“ کے آخر میں وہ کہتا ہے:

... حقیر انسان

آخر چاہتا کیا ہے؟ آسمان صاف ہے،
اور اس کے نیچے ہر ایک کے واسطے کافی زمین پڑی ہے،
مگر وہ لا حاصل جنگ و جدال سے ایک دم بھر باز نہیں رہ سکتا،
اور کیوں؟ ...

یہ مثنوی اپنے سوال کا جواب نہیں دیتا اور اس سوال کا جواب کوئی دے بھی نہیں سکتا۔ لیکن جس انداز سے اور جس حالت اور فضا میں یہ سوال کیا گیا ہے وہ یہ مثنوی کے درد اور انسانی ہمدردی کو خوب ظاہر کر دیتی ہے۔

انشاپردازی اور جدت اسلوب کے لحاظ سے یہ مثنوی کا ادبی کارنامہ ایک نظم ”گیت“ ہے۔ اس نظم میں یہ مثنوی نے وہ خاص بحر اور قصہ سنانے کا بھولاطر اختیار کیا ہے جو روسی عوام کے گیتوں اور رزمیہ شاعری میں اس قدر لطافت پیدا کر دیتا ہے۔ اور وہ نقل اتارنے میں ایسا کامیاب ہوا ہے کہ نظم پڑھتے ہوئے کبھی شبہ تک نہیں ہوتا کہ وہ ایک تربیت یافتہ مذاق کی تصنیف ہے۔ نظم کا موضوع زار اور ان چہارم کے عہد کا ایک دردناک واقعہ ہے، اور یہ مثنوی اسے بالکل اسی طرح شروع کرتا ہے جیسے روس کے

پیشہ ور رزمیہ داستانوں کے گانے والے اپنے قصے کو،

اسے ہاں ہاں زارِ اوان و سیلِ پوچ !

ہم نے تجھ پر اپنا گیت بنایا ہی،

تجھ پر اور تیرے چہیتے بوڑھی گارڈ کے سپاہی پر،

اور بہادر تاجر، کلاش فی کوف پر۔

ہم نے اسے پُرانے طرز پر بنایا ہی

اور اس کے ساتھ سرود کا سر ملاتے ہیں،

اور ہم اسے سناتے ہیں اور سنا کر روتے ہیں۔

پراود سلاٹ نسل کو اس سے تسلی ہوتی ہے،

اور نواب مات وے ہی رومو دانوف سکی،

ہمارے واسطے پھین دار شہد کا ایک پیالہ لائے

اور ان کی گورے مکھڑے کی بیگم

چاندی کے بٹشت میں ہمارے لیے

کارٹھا ہوا ریشم کا نیا رومال لائیں۔

ہم کو تین دن تین رات مہمان رکھا، ہماری خاطر کی

سارا قصہ سنا اور سننے سے ان کی طبیعت سیر نہ ہوئی۔

اس تمہید کے بعد اصل قصہ شروع ہوتا :

لہ ہندوستان میں انھیں بھاٹ کہتے ہیں۔

یہ یعنی میچ اور بیچے دین کو ماننے والی سلاٹ نسل -

آسمان پر آفتاب نہیں چمک رہا ہے،
 نیلے بادل اس سے آنکھیں نہیں لڑا رہے ہیں
 بلکہ زارادوان اپنے دربار میں رونق افزہ ہوا چاروں طرف اس کے
 درباری اور خاص مصاحب کھڑے ہیں۔ زارادوان اپنے بوڑھی گارڈ کے
 سپاہیوں کو خاص الفت کی نگاہوں سے دیکھتا ہے۔ ان میں سب خوش اور
 مطمئن معلوم ہوتے ہیں، سوا ایک کے یہ اس کا چہیتا کرب لے پوچھتا ہے زارادوان
 اس سے افسردگی کی وجہ دریافت کرتا ہے، اس خیال سے کہ شاید کسی چیز کی
 ضرورت ہو، لیکن پوچھنے سے پتہ چلتا ہے کہ دراصل وہ ایک عورت پر عاشق
 ہو گیا ہے۔

اس کی چال سبک، جیسے ہنس کا تیرنا،
 اس کی آنکھ رسیلی، جیسے فاختہ کی،
 بات کرے، جانو بلبل گارہی ہے،
 اس کے گالوں پر صبح کی سی سُرخی ہے،
 اس کے بھورے بال، جن میں سونے کی چمک ہے،
 رنگین فیتوں سے چوٹیوں میں بندھے ہیں،
 وہ اس کے کندھوں پر رنگتی ہیں، دوڑتی پھرتی ہیں،
 گورے سینے کو بوسے دیتی ہیں،
 وہ ایک تاجر کے گھرانے میں پیدا ہوئی ہے،
 نام اس کا ایونا دمیتروفا ہے۔

بادشاہ سے ایک معمولی دل کا ماجرا سمجھ کر کرب بے یو پج کو زیور اور جواہرات
دینے کا وعدہ کرتا ہے کہ وہ اپنی معشوقہ کو شادی کرنے پر راضی کرے۔ لیکن واقعہ
کچھ اور ہی تھا:

ارے ہاں ہاں زاراوان وسیل یو پج!
تیرے چالاک غلام نے تجھے دھوکا دیا،
تجھے سچی بات نہیں بتائی۔
تجھے یہ نہیں بتایا کہ حسینہ کا
خدا کے گرجا میں نکاح ہو چکا ہے،
اس کا ایک جوان تاجر سے نکاح ہو چکا ہے
ہمارے عیسائی مذہب کے مطابق۔

ہاں جوانو گاؤ،
مگر سرود کے سُر ملاؤ،
ہاں جوانو، گاؤ،
مگر بات سمجھ لو،
ایک خلیق نواب کو خوش کرنا ہے
اور ان کی گوری بیگم کو۔

ایک دن جب الیونا دمیر فنا گر جا سے شام کو گھر واپس آ رہی تھی

لے یہاں پر نظم کا پہلا حصہ ختم ہوتا ہے۔ اس کے بعد کے چھ مصرعوں سے گیتوں کے گیت
ختم کرنے کا طرز معلوم ہوتا ہے۔

تو کرب یے یوچ نے سر راہ اس کو زبردستی پیار کیا اور مہایوں کی نظروں میں اسے ذلیل کیا۔ اس حادثے کی وجہ سے اسے گھر پہنچنے میں دیر ہو گئی اور اس کا شوہر کلاش فی کوٹ جو انتظار کر رہا تھا، اس پر بہت خفا ہوا۔ اس بیچاری نے معافی مانگی اور کرب یے یوچ کی شرارت کا سارا قصہ سنایا۔ دوسرے دن بادشاہ کے سامنے گھونے بازی کا عام مقابلہ ہونے والا تھا اور کلاش فی کوٹ نے ہتھیہ کیا کہ اس بد معاشی کی سزا میں کرب یے یوچ سے مقابلہ کر کے اسے جان سے مار ڈالے گا۔ لڑائی میں اس کی آرزو پوری ہوئی۔ کرب یے یوچ، جس نے مقابلے کے لیے عام چیلنج دیا تھا، اس کا گھونسا کھا کر مر گیا، لیکن بادشاہ کو اپنے چہیتے کے مارے جانے پر سخت غصہ آیا اور اس نے کلاش فی کوٹ سے پوچھا کہ اس نے کرب یے یوچ کو قصداً جان سے مارا ہے یا محض اتفاق سے۔ کلاش فی کوٹ نے بے دھڑک جواب دیا کہ اس نے قصداً مارا ہے جس کی وجہ وہ سوا اپنے خدا کے اور کسی کو بتانے پر تیار نہیں۔ بادشاہ کا ارشاد ہوا:

اچھا ہوا، میرے بیٹے،
 دلیر جواں مرد، تاجر کے لڑکے،
 جو تو نے مجھے سچا جواب دیا۔
 تیری جوان بیوہ اور تیرے یتیموں کو
 میں خزانے سے گزرا دوں گا،
 تیرے بھائیوں کے لیے آج سے حکم جاری کرتا ہوں

کہ وہ تمام ملک روس میں
بے محصول دیے تجارت کر سکیں۔

لیکن تو میرے بیٹے، توجا،

اس اونچی قتل گاہ پر

اور جلاد کے سامنے اپنا شوریدہ سر جھکا دے۔

میں حکم دوں گا کہ تبر تیز کر لیا جائے،

جلاد سے کہوں گا کہ شاندار دردی پہن لے،

بڑے گھٹے گھر کا گھٹنا بجاؤں گا،

جس سے سب کو معلوم ہو جائے

کہ تو بھی میری عنایتوں سے محروم نہیں رہا۔

چنانچہ کلاش فی کوف معمولی مجرموں کی طرح قتل کر کے دریائے موسکوا

کے اس پار ایک مقام پر دفن کر دیا گیا جہاں تین سرکس آکر ملتی تھیں۔

اس کی قبر کے پاس سے خلق خدا گزرتی ہے۔

کوئی بوڑھا ہوا، تو سینے پر صلیب کا نشان بناتا ہے،

کوئی بانٹا ہوا تو اکڑ کر چلنے لگتا ہے،

کوئی لڑکی ہوئی تو اس کی آنکھیں نم ہو جاتی ہیں،

اور کوئی سرود بجانے والا، تو وہ گا اٹھتا ہے۔

ہاں، بہادر جوانو،

سرود بجانے والو،

پاٹ دار آواز والو،
 شان سے شروع کیا تھا، شان سے ختم کرو،
 خوش بخت نواب کی جڑ!
 ان کی گوری سگیم کی جڑ!
 عیسائی ملت کی جڑ!

تعریف سے ہر شخص خوش ہوتا ہی اور وہ شاعر جو ہر دل عزیز کی منزل تک سب سے چھوٹے اور آسان رستے سے پہنچنا چاہتے ہیں عموماً اپنے وطن اور ہم وطنوں کی مدح سرائی سے یہ آرزو پوری کرتے ہیں۔ لیکن اس موضوع پر جہاں کہیں نظمیں لکھی گئی ہیں وہ اس خاص ملک کے کٹر اور تنگ نظر وطن پرستوں کے سوا کبھی کسی کو پسند نہیں آ سکتی ہیں کیونکہ یہ موضوع کبھی کسی سچے شاعر کے شایان شان ہو نہیں سکتا۔ روسی ادب میں ایسی نظمیں بہت کم ملتی ہیں، کچھ اس وجہ سے کہ روسی ذہنیت کبھی یورپ کی مردجہ وطن پرستی کی تعلیم پورے طور پر قبول نہیں کر سکی، کچھ اس لیے کہ ریاست کے جبر نے وطن میں زندگی بسر کرنا ہی دو بھر کر دیا تھا۔ روس میں ضرورت دراصل ایسے شاعر کی تھی جو لوگوں کی پست ہمتوں کو بلند کرے، انھیں ریاست کے جبر اور تشدد کی مخالفت پر آمادہ کرے، اور ان میں آزادی کا حوصلہ بڑھا دے، مگر اس راہ پر پہلا قدم رکھنا گویا سامی بیڑا کے کسی قید خانے میں عمر کے چند سال گزارنے کا ارادہ کرنا تھا اور کوئی تعجب نہیں کہ اس مہیت ناک سزا کے خوف نے روسی شاعروں کو اس نوعیت کے قومی کلام سے باز

رکھا۔ ریل یہ یفت، لشکن کے دوست اور دکا برست بغاوت کے رہبر نے
 اس قسم کی شاعری شروع کی اور اس کی نثر بھگتی، لیکن اس کا نہ تو کوئی استاد
 تھا نہ اسے کوئی شاگرد ملا۔ اس کے بعد اگر کسی شاعر نے ریاست کے جبروت
 کا خاکہ اڑایا تو یرمنتوف نے۔ وہ اس قدر مغرور، بے باک اور سن چلا تھا کہ
 اسے نثر کی مطلق پروانہ تھی، مگر انہیں صفتوں نے اسے ہم وطنوں سے ایسا
 بیزار کر دیا کہ اسے ان میں آزادی کے ولولے پیدا کرنے کی خواہش ہی نہیں
 ہوئی۔ لشکن کے ماتم میں اس نے جو نظم لکھی وہ روسی دربار اور سوسائٹی کے
 اعلیٰ طبقے کی بہت سخت ہجو تھی، لیکن اس میں یرمنتوف نے اپنا غصہ اتارا
 تھا، قوم میں شورش پھیلانے کی کوشش نہیں کی تھی، اسی وجہ سے اسے نثر
 بھی معمولی ملی۔ اس نظم کے بعد یرمنتوف نے نہ لشکن کی طرح نثر کی مدح جرائی
 کر کے اپنی صفائی کی، نہ مہمل قوم پرستی کے جذبے سے دل کے داغ مٹانایا
 ضمیر کا بوجھ ہلکا کرنا چاہا۔ اس کی بے نیازی اور بے پروائی کا رنگ دہی رہا
 جو پہلے تھا اور افسوس ہو قوم کے مستقبل سے وہی بے تعلقی رہی جو پہلے تھی۔
 اس نے ایک دو نظموں میں سرزمین روس سے لگاؤ ظاہر کیا ہے، کہیں کہیں،
 مثلاً ذیل کے اقتباس میں روسیوں پر اعتراض کیے ہیں جن کا کوئی سننے اور
 اوتسلیم کرنے والا ہوتا تو بہت فائدہ حاصل کر سکتا تھا:

شاعرانہ خواب تارٹ کے کارنامے،

ہمارے ذہن کو کسی شیریں نشے سے مست نہیں کرتے

لے نظم کا عنوان "ایک خیال" ہے۔

جو ذرا سادہ ہم میں باقی ہو اُسے کجوسی سے جمع کیے ہوئے بیکار
خزانے کی طرح۔

ہم بڑے دلچ سے سینے میں محفوظ رکھتے ہیں۔

ہماری محبت اور نفرت دونوں اتفاقی ہوتی ہیں،

ہم نہ محبت کا کچھ صدقہ دیتے ہیں اور نہ نفرت کا

اور اس وقت جب خون اُبل اُٹھتا ہے،

ہماری روح عجیب سردی سے ٹھٹھری رہتی ہے۔

ہمارے آبا و اجداد نے دل بہلانے کے جو پُر تکلف طریقے سوچے تھے،

اور ان کی سیدھی سادی بچوں کی سی شہوت پرستی ہمیں سیٹھی لگتی ہے،

ہم بغیر کوئی یادگار چھوڑے، بغیر کوئی لطف حاصل کیے

اپنے آپ پر ہنستے ہوئے قبر کا راستہ لیتے ہیں۔

لیر منتوف یقیناً اس کی قابلیت رکھتا تھا کہ روسی قومیت میں روح

پھونک دے اور روسی وطن پرستوں کے ایسے خیالات اور جذبات کا وہ

سرمایہ فراہم کر دے جو ان کے عقاید کی تبلیغ کے واسطے بہت ضروری تھا،

اور جس کے نہ ہونے سے روس کی ہر قومی تحریک کو صدمہ پہنچا۔ تقدیر کو مگر

کچھ اور منظور تھا۔ آخری مرتبہ تفتاز جاتے ہوئے لیر منتوف اپنے وطن سے

یوں رخصت ہوا:

الوداع، گندے روس،

غلاموں اور آقاؤں کے ملک!

الوداع، آسمانی دردِ دیو،
 الوداع، دردیوں کی تابعدار قوم!

ملہ روس کے فوجی افسروں کی دریاں آسانی ہو کر تہیٰ تھیں۔

تیسرا باب

فیوڈراؤ نو وچ چوچف

”اس بے مثل شاعر سے، جو دنیا کے ہر ادب کے لیے باعثِ فخر ہو سکتا تھا، ہمارے ملک میں صرف نظم کے چند شائقین واقف ہیں، ورنہ ”تعلیم یافتہ“ لوگوں کے بہت بڑے حصے نے صرف اس کا نام سنا ہیوا کہیں... دو تین نظمیں دیکھی ہیں جو اس کے کلام کا صحیح نمونہ نہیں کہی جاسکتی ہیں“ روسی نقاد ولادیمیر سولوفیوٹ نے ۱۸۹۵ء میں اپنی قوم سے یہ شکایت کی تھی اور چوچف کے کلام کے شائقین آج بھی یہی شکایت کر سکتے ہیں۔ ناقدر دانی کی تلافی کسی قدر اس صورت سے ہوئی ہو کہ چوچف کا کلام جسے پسند آیا وہ بالکل اس کا فدائی ہو گیا۔ دس کے تقریباً تمام سربراہ اور وہ انشا پرداز اس زمرے میں شامل تھے اور ان میں سے کچھ ایسے بھی تھے جن کے لیے بغیر چوچف کے دیوان کے زندگی بسر کرنا ناممکن تھا۔

لے ٹاٹائی نے اپنے ایک خط میں کسی دوست سے چوچف کا دیوان مانگا ہے اور اسے جلد بھیجے کی تاکید کی ہے اس لیے کہ وہ اس دیوان کے نہ ہونے سے بہت بے چین تھا۔

تعلیم یافتہ لوگوں میں چیوچف کا چرچا اُس کی اپنی زندگی میں اس وجہ سے نہیں ہوا کہ اُس نے اپنے آپ کو بہت سختی سے قوم اور قومی دلچسپیوں سے الگ اور بے تعلق رکھا اور اپنے کلام کی اشاعت سے بھی حتی الامکان پرہیز کیا۔ اُسے گمنامی سے بچانے کی جو کوشش بعد کو کی گئیں وہ اس سبب سے ناکامیاب رہیں کہ اس کا مذاق اور اس کے کلام کا رنگ کچھ ایسا تھا کہ وہ ہر دلغزیز ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ چیوچف نے انسانی زندگی سے منہ موڑ کر فطرت کی طرف رخ کیا اور اسے فطرت کی کیفیتوں میں وہ حسن نظر آیا جو عام طور سے لوگ معشوقوں کے خال و خط و انداز و انداز میں تلاش کرتے ہیں۔ اُس نے اُن جذبات کی نیزنگیوں کو جو شاعر کا میدان سمجھی جاتی ہیں اور جن میں شاعر اپنا کمال دکھاتے ہیں یا تو ایسی فلسفیانہ پوشاک پہنا دی کہ وہ عوام کی نگاہوں میں چب نہ سکیں، یا اپنے تصور کی شونہی سے ایسا بے حجاب کر دیا کہ اُن کا حسن اہل نظر کے سوا کسی پر ظاہر نہ ہو سکے۔ بد مذاقوں سے ہر شاعر کو شکایت رہی ہے، چیوچف کو محض بد مذاقوں نہیں بلکہ عام لوگوں سے بھی گہری نفرت تھی، جیسا کہ اُن نظمیں سے ظاہر ہوتا ہے جو اس نے اپنی معشوقہ کے ماتم میں لکھی ہیں۔ ۱۔ ایسے شخص کے کلام سے ہر دلغزیز کی توقع کرنا فضول ہے۔

چیوچف کی زندگی کے حالات بہت کم معلوم ہیں۔ وہ ۱۸۰۳ء میں پیدا ہوا اور جب وہ اُنیس سال کا ہوا تو سفارت خارجہ میں کسی معمولی عہدے پر مقرر ہو کر روس کے باہر چلا گیا اور بیس سال یورپ میں سلسلہ ملازمت رہا۔ وہاں سے واپسی پر وہ محکمہ احتساب خارجہ کا ناظم بنا دیا گیا۔ ۱۸۴۱ء تک اس نے

رومن شاعر ہو رس کے کلام کے ترجمے اور گاہے ماہے رسالوں میں نظمیں شایع کیں، اس سال اُسے ایک دوست نے اپنے کلام کا مجموعہ شایع کرنے پر مجبوظ کیا اور کچھ دنوں کے لیے عام تعلیم یافتہ طبقوں میں چیوچف مشہور ہو گیا۔ لیکن لوگ اسے بہت جلد بھول گئے اور اس نے اپنی یاد تازہ کرانے کی مطلق فکر نہ کی۔ اس نے تمام عمر انھیں اصولوں پر عمل کیا جو اُس کے نزدیک ہر سمجھ دار آدمی کو اختیار کرنے چاہئیں اور جو اس نے ذیل کی نظم میں بیان کیے ہیں:-

عیب جوئی نہ کر، سوچ بچار نہ کر...
 جستجو دیوانگی ہو، عیب نکالنا حماقت،
 آج کے زخموں کا نیند سے علاج کر
 اور کل جو ہو ہو مہونے دے۔
 زندگی میں ہر حالت برداشت کر لے جا۔
 غم اور راحت اور پریشانیوں،
 کاہے کی ہوس کرنا، کاہے کا افسوس،
 دن بیت گیا، اور شکر ہو خدا کا۔

چیوچف کا موضوع زیادہ تر قدرت کے مناظر ہیں اور کائنات میں انسانی ہستی کی تصویریں چھنڈنظمیں ایک عشق کی داستان ساتی ہیں جس کا شاعر کے دل پر بہت گہرا اثر ہوا تھا۔ قوم کی لبر اوقات سے اسے مطلق سروکار نہ تھا، لیکن جو تین چار نظمیں اس نے قوم کو اپنے دل کی بات سانے کے لیے لکھی ہیں وہ بے مثل ہیں اور اس کی نظر نے حقیقت کو اس صفائی سے دکھایا ہے کہ دوست

اور دشمن دونوں اس کی نکتہ بینی کی داد دیتے ہیں۔

مناظر قدرت سے مشرقی شاعری تقریباً بیگانہ ہے، مغربی شاعری میں مناظر بہت دکھائے گئے ہیں، لیکن صرف چند شاعروں نے جن میں گوئٹے، وڈس ورتھ اور چیوچف سب سے زیادہ کامیاب رہے ہیں، اس کا حوصلہ کیا ہے کہ ان مناظر کی مختلف کیفیتوں کو انسانی احساسات کا پس منظر بنائیں اور انسان اور فطرت کی ہم آہنگی سے ایک فلسفہ اخذ کریں۔ چیوچف کی فلسفیانہ نظران مناظر کو بھی جو بظاہر کوئی خصوصیت نہیں رکھتے ایک معنی پہنچا دیتی ہے جس کی وجہ سے انسان کو ان سے محبت ہو جاتی ہے، اسے بجلی کی چمک میں معشوق کا غصہ بید محبوبوں کی سرنگونی میں عاشق کی نیاز مندی نظر آتی ہے، وہ رات کے طوفانوں سے التجا کرتا ہے کہ فساد کا منظر دکھا کر کائنات کی بنیادیں نہ اکھاڑ دیں، اس کی آرزو ہے کہ فطرت میں فنا ہو کر ہستی کی قید سے آزاد ہو جائے اور وہ لطف حاصل کرے جو قطرے کو دریا میں گم ہو جانے سے نصیب ہوتا ہے۔

پہلے مناظر قدرت کی مثالیں دی جاتی ہیں۔ چیوچف کے طرز بیان سے یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ اس کے تصور میں کس قدر مشرقی رنگ تھا۔

گرمی میں کمی نہیں ہوئی،

جولائی کی رات روشن تھی۔

پست اور بے حس زمین پر

سارا آسمان، طوفان کا بوجھ سنبھالے ہوئے،

بجلیوں سے لرز رہا تھا۔

کسی کی آنکھ کے بھاری پوٹے۔

کبھی کبھی اُٹھ جاتے تھے،

اور تیرو بجلیاں کیا تھیں،

کسی کے غضب ناک دیدے

زمین پر چمک جاتے تھے۔

یہ منظر خفگی کا تھا۔ ایک اور کیفیت ملاحظہ ہو؛

غم میں ڈوبے ہوئے نیم برہنہ جنگل پر

ایک پُر معنی غنودگی چھائی ہوئی۔

بہار کی پتیوں میں سے جا بجا ایک دو

خزاں کے سنہرے رنگ میں چمکتی ہوئی

اب تک ننھی شاخوں پر لٹک رہی ہیں۔

میری آنکھیں ایک دل گداز ہمدردی سے بھر آتی ہیں

جب بادلوں سے گزرتی ہوئی

سوسج کی کرن، بجلی کی طرح چمک کر،

رنگ برنگی درختوں پر بکھر جاتی ہو۔

پتھر مردگی بھی ہم کو کیسی بھلی لگتی ہو!

وہ منظر کیسا دل فریب ہوتا ہو

جب ایک چیز جو کبھی پھیل پھولی تھی

بے بس اور بیمار ہو کر

آخری بار مسکراتی ہے۔

مناظر قدرت میں شاعر کو انسانی جذبات، انسانی نیاز اور بے نیازی کی
جھلک بھی دکھائی دیتی ہے:

ایسے مجنوں، تو پانی کے اوپر
اپنا سر کیوں جھکاتے ہے،
اور کانپتی ہوئی پتیوں،
گویا لالچی لبوں، سے
بہتے ہوئے چٹنے کو کیوں پکڑنا چاہتا ہے؟
چٹنے کے دھارے پر تیری ہر پتی
چاہے غم میں گھلے، چاہے تڑپے...
چشمہ یوں ہی بہے گا، شور کرے گا،
دھوپ کا مزہ لے کر چمکے گا
اور تجھ پر ہنسا رہے گا۔

پتیوں کا فلسفہ سنبھلے :-

چاہے شمشاد اور صنوبر
جاڑوں بھر کھڑے رہیں،
اور برف اور برف کے طوفانوں میں
اوڑھ لپیٹ کر سو جائیں،
ان کی بے رس سبزی

چاہے کبھی پیلی نہ پڑے ،
 لیکن کبھی تازی بھی نہیں ہوتی ۔
 ہم ، رندان سبک سز ،
 جو پتیاں کہلاتے ہیں ،
 رنگ پر آتے ہیں ، چمکتے ہیں ،
 اور تھوڑے دنوں تک
 شاخوں کے مہمان ہوتے ہیں ۔

بہار کے حسن میں
 ہم بھی حسین تھے ،
 کرنوں سے کھیلنے
 شبنم میں نہاتے تھے ۔
 اب چڑیاں سب گاکا چکیں
 پھول مڑھیا چکے ،
 سبزہ زار نہ رہا ،
 خوش گوار ہوائیں بدل گئیں ۔
 اب ہم کیوں بیکار
 ٹٹکے ٹٹکے مڑھائیں ؟
 انہیں سب ساتھیوں کے پیچھے
 ہم بھی کیوں نہ اڑ جائیں ؟

اُتند و تیز ہواؤ،
جلدی چلو، جلدی !
ہم شاخوں سے اکتا گئے
ہم کو جلد چھڑالے جاؤ !
جلدی کرو، ہم کو چھڑاؤ
ہم اور نہ ٹھیریں گے !
اُڑو، اُڑو !

ہم بھی تمہارے ساتھ اڑیں گے !

کائنات میں انسانی ہستی کی حقیقت بتانا پینیر اور شاعر کا خاص کام ہے، مذہب اس حقیقت کے بیان پر اپنی تعلیم منحصر کرتا ہے، شاعری کو عموماً عقیدے اور اخلاق کے مسائل سے کوئی سروکار نہیں ہوتا، لیکن سچے شاعر اپنی سبکدوشی کے باوجود انسان کو وہ تعلق جو اس کی ہستی اور کائنات میں ہے اس طرح سمجھا دیتے ہیں کہ ہر صاحب ادراک اپنے دل سے خوف اور وحشت دور کر سکتا ہے اور وہ روحانی تسلی حاصل کر سکتا ہے جس سے رسمی دینیات کی بے لوج منطق اسے اکثر محروم رکھتی ہے۔ چیوچف کے کلام میں انسانی ہستی کے یہ مسائل بہت نمایاں ہیں، لیکن اُس نے اپنے روحانی ”تجربوں“ کو تعلیم کی شکل نہیں دی ہے۔ وہ محض تجربے ہیں اور تجربے ہر قسم کے ہوا کرتے ہیں۔

شام کے وقت شاعر کی کیفیت دیکھیے :-

سُرمئی رنگ کے سائے ایک دوسرے سے مل گئے،

روشنی دھیمی پڑی، غائب ہو گئی، آوازیں سو گئیں،
 حرکت اور زندگی گھٹتے بڑھتے اندھیرے
 اور دور کے شور و غل میں گھل مل گئی ہیں۔
 ایک تلی جو نظر نہیں آتی رات کی ہوا میں
 اڑتی سنائی دیتی ہے۔۔۔

یہ اُن تناؤں کا وقت ہے جو زبان پر نہیں آتیں۔
 ساری ہنسی مجھ میں ہے، میں ساری ہنسی میں ہوں۔۔۔۔
 خاموش اندھیرے، خواب آور اندھیرے،
 میری روح کی تہ تک سما جا،
 خاموش، تاریک، عطر بنیر،
 سارا میری روح میں سما جا،
 احساسات کو خود فراموشی کی تاریکی سے
 لبالب بھر دے۔۔۔
 مجھے نیستی کا مزہ چکھا دے۔
 نیند کے متوالے جہاں میں فنا کر دے!

رات کی آمد کا یہ تصور ہے:
 آسمان پر معصوم رات بھاگ گئی،
 اداس نے فرحت بخش اور پیارے دن کو
 لپیٹ کر الگ رکھ دیا، ایک سنہری چادر کی طرح،

ایک چادر جو رات کے انتہاء غار پر تنی ہوئی تھی -
 ظاہری دنیا، ایک ہی تصویر کے مانند، نظر سے غائب ہو گئی ہے،
 اور انسان مثل ایک یتیم بچے کے جسے سر رکھنے کو ٹھکانا نہیں
 اب بے بس اور بربہنہ
 اس انتہاء غار کے کنارے کھڑا ہے۔

وہ اب بالکل تنہا ہے،
 اس کا دماغ ساکت ہے، خیالات کا کوئی خبر گیر نہیں،
 وہ اپنی روح میں ڈوبا ہوا، اس کی روح بھی ایک انتہاء دریا ہے۔
 اسے کوئی سہارا نہیں ملتا اور دریا بے کراں ہے۔
 اب وہ ایک پُرانا خواب سمجھ کر، حیرت سے،
 ہر روشن اور زندہ چیز کو یاد کرتا ہے،
 اور اسے آخر کار یقین ہو جاتا ہے کہ یہ بیگانہ وحش اور پُر اسرار رات
 اس کا آبائی ورثہ ہے۔

رات کی آندھی، تاریکی اور طوفان کی فضا بھی شاعر کے دل کو تڑپا دیتی ہے
 اور رات کی آندھی، تو کیا چیخ رہی ہے؟
 کس فکر میں یوں دیوانہ وار تیزی سے بھاگ رہی ہے؟
 تیری یہ آواز کیا سنا نا چاہتی ہے،
 جو کبھی نحیف دزار، کبھی تند و پُرسور ہو جاتی ہے؟
 تو ایک لہجے میں جسے میرا دل سمجھتا ہے

ایک پُروردہ شکوہ سُناتی ہے جسے وہ نہیں سمجھ سکتا۔
 تو میرے دل کو دکھاتی ہے اور تیرے جواب میں
 وہ کبھی کبھی دیوانوں کی طرح چیخ اُٹھتا ہے۔
 ارے، یہ دشتِ ناک گیت نہ گا،

اس عالمِ فساد کا گیت جو قدیم ہے، عزیز ہے!
 رات کی روح کے اس محبوب گیت کو
 سارا عالم کس ذوق و شوق سے سُن رہا ہے!
 سارا عالم اس تمنا میں بیتاب ہے
 کہ جسمِ فانی کی قید سے رہا ہو کر
 ابدیت کے بے پایاں سمندر میں بہ جائے ...
 ارے، سوتے طوفانوں کو نہ جگا!

اُن کے نیچے فساد کا دریا اُبلنے کو تیار ہے۔
 استعارے اور حقیقت، مناظرِ قدرت اور عالمِ خیال کی ایک عجیب گنیزش ملاحظہ ہو
 جیسے سمندرِ زمین کے کُرے کو گھیرے ہو،
 دنیاوی زندگی خوابوں سے گھری ہو۔
 رات ہوئی اور سمندر کی موجیں
 ساحل سے ٹکراتی ہیں اور ٹکرانے سے ایک صدا نکلتی ہے۔
 یہ اس کی آواز ہے۔ یہ دل کو بھاتی ہے، اپنی طرف بلاتی ہے،
 کہتی ہے کہ کشتی بندرگاہ میں پہنچ گئی ہے ...

سمندر کا بہاؤ بہت جلد ہمیں ساحل سے بہا لیجاتا ہے
 اور تاریک، بے پایاں موجوں کی گود میں ڈال دیتا ہے،
 آسمان کا گنبد ستاروں کے نور سے چمکتا ہوا
 اپنی گہرائی سے ہمیں پُر اسرار نظروں سے دیکھتا ہے۔
 ہم تیرتے رہتے ہیں اور اٹھا ہوا سمندر کی ابلتی ہوئی موجیں
 ہمیں ہر طرف سے گھیرے رہتی ہیں۔
 شاعر کی نظر سے وہ اختلاف بھی مخفی نہیں رہا ہے جو اکثر انسان کے
 فلسفہ زندگی کو فطرت کی تعلیم سے جدا رکھتا ہے۔ وہ حیرت سے پوچھتا ہے:-
 سمندر کی موجوں کا اپنا ترانہ ہے،
 عناصر کی ان بن میں ایک ہم آہنگی ہے،
 اور پچکٹے ہوئے بید کے درختوں کی لرزش سے
 ایک خوشگوار سر ملایا راگ نکلتا ہے۔
 ہر نشو و نما حرکت میں مناسب ہے،
 فطرت کی ہم آہنگی میں خلل نہیں،
 صرف ہم، اپنی آزادی کے دہم باطل میں مبتلا ہو کر
 فطرت سے ناسازی محسوس کرتے ہیں۔
 یہ ناسازی کہاں سے آئی، کیسے پیدا ہوئی؟
 ہماری روح اس سنگت میں کیوں شریک نہیں ہوتی،
 کیوں وہی گیت نہیں گاتی جو سمندر گاتا ہے

اور فکر میں ڈوبا ہوا بید گنگنا تا ہو؟

اس اختلاف کا ایک اور پہلو ہے۔ فطرت کو بھی انسانی زندگی کے کاروبار سے کوئی تعلق نہیں۔ ذیل کی نظم، جو روس کے ایک مشہور میدان جنگ سے گزرتے وقت لکھی گئی تھی، فطرت کی اس سردہری کو بیان کرتی ہے۔

اس زندگی کا، جس کا یہاں شور و غوغا تھا،

اس خون کا، جس کے یہاں دریا بہ گئے،

کتنا حصہ محفوظ رہا، ہم تک کتنا پہنچا؟

آج ہمیں صرف دو تین ٹیلے نظر آتے ہیں،

ان پر دو تین شاہ بلوط کے درخت اُگے ہیں

جن کی شاخیں بیباکی سے دور تک پھیلی ہیں،

درخت سر سبز ہوتے ہیں، خوشی کے گیت گاتے ہیں اور انھیں اس کی فکر نہیں

کہ ان کی جڑیں کس کی لاش، کس کی یادگار چھپائے ہیں۔

یعنی فطرت کو گزرے ہوئے زمانہ کا کوئی احساس نہیں،

وہ ہمارے ماہ و سال کے پیلنے سے نا آشنا ہے

اور اس کے رد و برد ہمیں اپنی ہستی کی تصویر دُھندلی سی نظر آتی ہے۔

ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ہم محض صورتیں ہیں جو اسے خواب میں دکھائی دیتی ہیں۔

باری باری سے فطرت اپنے تمام بچوں کو

جو اپنی سعی لا محمل انتہا تک پہنچ چکے ہیں،

یلا تفریق اس انتہاء غار میں بلا لیتی ہے،

جس میں ہر شے فنا ہوتی ہے، جس سے ہر شے پیدا ہوتی ہے۔
 فطرت اور انسان کے تعلق کا یہ پہلو شاعر کو پسند نہیں اور اس نظم کے سوا اس کے
 کلام میں ہم کہیں فطرت کو موت اور حیات کے کارخانے کی شکل میں نہیں
 دیکھتے۔ لیکن فطرت کی طرح خود شاعر کو بھی انسانی کوشش اور کامیابی
 سے اتنی دلچسپی نہیں تھی کہ وہ فطرت کے آئین اور انسان کی آرزوؤں
 کو ہم آہنگ بنانے کی تدبیریں سوچے۔

عشق کا مضمون نظم میں بہت پڑانا ہے اور اس لحاظ سے کہ ہر شاعر اپنے
 تجربے اور احساسات نرے سمجھ کر انھیں ایک نئی شکل میں پیش کرتا ہے، عشق
 کا مضمون ہمیشہ نیا بھی ہوتا ہے۔ چوچیف کے لیے عشق کا جذبہ وہی کیفیت
 رکھتا تھا جو ہر شاعر اور ہر انسان محسوس کرتا ہے، لیکن اس کے عشق کی خصوصیت
 یہ ہے کہ وہ مناظر قدرت کی خوبیوں کو زیادہ روشن اور پُر معنی، اس اثر کو جو
 یہ دل پر ڈالتے ہیں زیادہ گہرا اور پُر کیف کر دیتا ہے۔ عشق اسے انسان اور کائنات
 کے رازوں سے آشنا کرتا ہے اور چوچیف عشق کے تصور میں اسی طرح کم ہوجاتا
 ہے جیسے مناظر قدرت کے مشاہدے ہیں۔

دن ڈھل رہا ہے، رات قریب ہے،
 پہاڑ کا سایہ لمبا ہوتا جاتا ہے،
 آسمان پر بادلوں کی چمک ملند پڑ گئی...
 اندھیرا جھاگیا، شام ہو گئی۔

مگر مجھے رات کے اندھیرے کا کوئی خوف نہیں۔

نہ گئے ہوئے دن کے گزرنے کا افسوس -

صرف تو، میری مسحور کن خیالی مورت،

صرف تو میرا ساتھ نہ چھوڑنا! ...

مجھے اپنے پروں کے سائے میں لے لے،

میرے دل کی بتیابی دودھ کر دے،

تب میری مسحور روح کے لیے

تاریکی بھی فرحت بخش ہو جائے گی۔

تو کون ہے؟ کہاں سے آئی؟ کیسے جانوں

کہ تو زمین کی ہے یا آسمان کی؟

ممکن ہے تو آسمان کی رہنے والی ہو

مگر تیری روح ایک آرزو بھری عورت کی ہے۔

چیو چٹ نے کہیں اپنی معشوقہ کا سراپا نہیں بیان کیا ہے، صرف ایک نظم میں

اس کی آنکھوں کی تاثیر بتائی ہے۔

مجھے آنکھیں یاد ہیں۔ آہ، وہ آنکھیں!

مجھے ان سے جو محبت تھی وہ خدا ہی جانتا ہے!

ان کی طلسمی آرزو بھری رات

میری روح کا قید خانہ بن گئی تھی۔

اُن آنکھوں میں، جن کی کیفیت میری عقل سمجھ نہ سکی،

جن کی نظر ہستی کے تمام راز روشن کر دیتی تھی،

ان آنکھوں میں کیا غم موجیں مار رہا تھا،
 جذبات کی کیا گہرائی تھی !
 ان کی نظر، پلکوں کے سائے میں بسیرا لیے ہوئے
 کبھی رنج و الم کی آہیں بھرتی،
 کبھی لذت سے سیر ہو کر نڈھال ہو جاتی،
 کبھی بلائے آسمانی بن کر گرتی۔
 ان پر کیف لمحوں میں
 کبھی مجھ سے یہ نہ ہو سکا
 کہ ان آنکھوں کو دیکھوں اور دل بیتاب نہ ہو جائے،
 اداسی کا حق ادا کروں اور آنسو نہ بہیں،
 معشوقہ کے انتقال کے بعد وہ گزرے ہوئے دن یاد کر کے کہتا ہی:
 میں اس سے ان دنوں بھی آشنا تھا،
 اس زمانے میں جواب ایک پُرانی کہانی معلوم ہوتا ہی،
 وہ زمانہ جو یاد سے محو ہو گیا ہی،
 جیسے صبح کا ستارہ، سورج کی کرنوں میں چھپ کر
 آسمان میں غائب ہو جاتا ہی۔
 ان دنوں وہ
 شادابِ حسن سے مالا مال تھی،
 اس میں وہ تازگی تھی جو سورج نکلنے سے پہلے فطرت میں ہوتی ہی

جب شبنم کی بوند پھول پر ٹپک جاتی ہے
اس طرح کہ کوئی نہ دیکھ سکتا ہے نہ سن سکتا ہے۔

اس وقت اس کی زندگی
ایسی مکمل تھی، ایسی پاک،
دنیا کی عام روش سے اتنی بیگانہ،

کہ معلوم ہوتا ہے وہ مری نہیں

بلکہ غروب ہو گئی، جیسے ستارہ غروب ہوتا ہے۔

اسی عشق کا ایک اور پہلو ہے۔ مشرق کے لوگوں کو وہ بہت انوکھا معلوم ہوگا۔

یہاں عاشق اپنے جذبے کی سنگدلی اور بے رحمی کی شکایت کرتا ہے، اس لیے
کہ وہ معشوق کے لیے مہلک ثابت ہوا۔

آہ، ہماری محبت بھی کیسی قاتل ہوتی ہے،

جب پُر ہوس جذبات کے بے لگام جوش میں

ہم ادب اور اسی چیز کو تباہ کر دیتے ہیں

جو ہمارے دل کو سب سے زیادہ عزیز ہوتی ہے۔

کیا بہت دن ہوئے جب اپنی فتح پر فخر کرتے ہوئے

تو نے کہا تھا: وہ میری ہے...

ایک برس بھی نہیں بتیا، اب خود ہی دیکھ

اس کی کون سی خوبی باقی رہی؟

اس کے گالوں کی گلاب جیسی سُرخ کیا ہوئی،

لبوں کا تبسم، آنکھوں کی چمک اب کہاں ہے؟
 جلتے ہوئے آنسو ایسے بہے
 کہ سب کچھ جلا کر خاک کر گئے!
 تجھے یاد ہے ملاقات کے وقت،
 اس پہلی کبخت ملاقات کے وقت،
 وہ اس کی جادو بھری نظر اور گفتگو،
 وہ اس کی چونچال منہسی؟
 اب کیا رہا؟ یہ سب شوخیاں کدھر گئیں؟
 اور تیرا خواب کتنے دن رہا؟
 افسوس، شمالی ملکوں کی گرمیوں کی طرح
 وہ چند لمحوں کا مہمان تھا!
 تیری محبت اس کے لیے تقدیر کی
 ایک بیبت ناک سنزاتی،
 ایک رسوائی تھی جس کی وہ سنزوار نہ تھی،
 جس نے اس کی ساری زندگی برباد کر دی!
 عمر بھر اس نے ہر نعمت سے پرہیز کیا،
 دل ہی دل میں صد ہا تکلیفیں اٹھائیں ...
 عہدِ شباب کی یاد گاریں باقی تھیں
 لیکن وہ بھی اسے دھوکا دے گئیں،

دنیا کی ہر بات سے اسے وحشت ہونے لگی ،
 فریب زندگی کا سرور جاتا رہا ...
 اس کی روح بھل بھول رہی تھی
 سوائے بھی لوگوں کے حلوں نے پامال کر دیا ۔
 مصیبتوں کی آگ نے سب کچھ جلا کر راکھ کر دیا ،
 اور یہ راکھ جو محفوظ رہی کیا تھی ؟
 درد ، روحانی تلخی کا بے رحم درد ،
 درد ، جسے نہ دوا نصیب ہوئی نہ آنسو ۔
 آہ ، ہماری محبت بھی کیسی قاتل ہوتی ہے ،
 جب پُرہوس جذبات کے بے لگام جوش میں
 ہم ابدِ اکراسی چیز کو تباہ کر دیتے ہیں
 جو ہمارے دل کو سب سے زیادہ عزیز ہوتی ہے ۔
 چھوچھ جب اپنی معشوقہ سے پہلی بار ملا تو اس کی عمر ۴۴ سال کی تھی ۔ اپنے جذبے
 کی اس خصوصیت کو بھی وہ محسوس کرتا ہے ۔
 آہ ، عمر کے ڈھیلے وقت ہماری محبت میں
 کیا دلسوزی ہوتی ہے ، کیسی دھم پرستی ...
 کچھ دیر اور چمک دکھلا ، کچھ دیر اور
 آخری عشق ، ڈویتے ہوئے سورج ، کی روشنی ،
 آدھے آسمان پر اندھیرا چھا گیا ہے ،

صرف ادھر مغرب میں کچھ رونق باقی ہے۔
 ذرا ٹھہر، ذرا اور ٹھہر، ای روز روشن کی یادگار،
 ای ذوقِ نظر، اپنے جادو کا اثر ذرا اور رہنے دے!
 رگوں میں خون ٹھنڈا پڑ گیا تو کیا ہوا،
 دل تو شوق سے گرم ہے...
 ای آخری عشق!

تو روحانی لذت بھی ہو اور نا اُمیدی کا پیغام بھی۔
 یہ عمر، یہ جذبہ اور یہ انجام، کیا تعجب اگر شاعر کے دل میں صرف یہ حوصلہ باقی
 رہ گیا۔۔

جیسے جلتی راگھ پر پڑا ہوا کاغذ
 دُھواں دیتا ہے اور سلگتا ہے
 اندھپی ہوئی آگ چپکے چپکے
 اس کے الفاظ اور سطروں کو چاٹ جاتی ہے،
 یوں ہی میری زندگی برباد ہو رہی ہے،
 روز تھوڑی تھوڑی دُھواں بن کر اڑ جاتی ہے،
 اور میں، ایسی یکسانی سے جو برداشت نہیں ہوتی
 رفتہ رفتہ جل کر بھسم ہو رہا ہوں....
 ای آسمان، کیا ہوتا اگر یہ آگ،
 ایک بار دل کو ل کر بھڑک اُٹھتی،

اور رنج اور ست قدم موت کی تکلیفوں سے رہا ہو کر
میں ایک بارگی جل اٹھتا اور جل جاتا!

چیوچپ کی نظمیں پڑھ کر ہم اس کا اندازہ لگا سکتے ہیں کہ قومی اور ملکی مسائل کو وہ
کن نگاہوں سے دیکھتا ہو گا۔ سوا ایک نظم کے جو اس نے ایک دوست کے
اصرار پر لکھی تھی اور جس میں روسیوں کو قسطنطنیہ کی فتح کا مژدہ سنایا گیا ہے اس
نے کبھی کسی قسم کے سیاسی جوش کا اظہار نہیں کیا۔ اسے اپنے ملک سے محبت بہت
کم تھی، لیکن بالکل بیگانگی برتنا ناممکن تھا۔ دونظمیں جو روس میں خاص طور
پر مشہور ہوئیں درج کی جاتی ہیں:-

یہ مفلس بستیاں،

یہ اجڑی سرزمین، یہ بے لطف آب دہوا -

یہی تیری کائنات ہے، امی مظلومیت کے گھر،

ای روسی قوم کے وطن!

غیروں کی مغزور نظران احساسات کو

نہ دیکھ سکتی ہے، نہ سمجھ سکتی ہے،

جن کی روشنی تیری عاجزی اور بے کسی کے پردے سے گزر کر

تیری روح کو چمکاتی ہو۔

صلیب کے بوجھ سے زیر بار کر کے

تھے، ای میرے وطن،

آسمان کے بادشاہ نے غلامی کے خمیر سے

بنایا اور بنا کر برکت دی۔

دوسری نظم اس سے کچھ کم ہمت شکن ہو اور اس کے آخری مصرع میں ایک بات کہی گئی ہے جو ان تمام خیالات کا جو روس کی نسبت ظاہر کیے گئے ہیں، لبّ لباب ہے:

روس کو عقل نہیں سمجھ سکتی،

عام پیانہ نہیں ناپ سکتا،

اُس کا ایک اپنا الگ معیار ہے۔

روس سے صرف عقیدت ہو سکتی ہے۔

چوتھا باب

کوندرا تائی ٹی فیوڈ وروپچ ریل یے لیف (۱۸۶۶-۱۷۹۵)
 وہ ذہنی بیداری جس کی کرلیوٹ، لینکن اور لیبر منتوف کی شاعری شہادت
 دیتی ہو سیاسی دنیا میں بھی ظہور میں آئی اور آزادی کی تناخوانی کا جو دعویٰ لینکن
 نے کیا تھا وہ دراصل چند معمولی ہم عصر شاعروں نے پورا کیا جن میں شاعری کی
 قابلیت لینکن سے بہت کم تھی مگر حب وطن کا دلولہ بہت زیادہ تھا۔ ان
 شاعروں میں ریل یے لیف کا درجہ سب سے بلند ہے۔ وہ ایک خوش حال
 زمیندار اور ہونہار فوجواں تھا۔ اُس نے اُس آخری جنگ میں جو نپولین سے
 ہوئی شرکت کی اور اُس کے بعد پیربرگ میں میجسٹریٹ مقرر ہوا۔ جنگ نے
 اُس کے وطن پرستی کے جوش کو بہت اُبھار دیا، اور جب لڑائی ختم ہونے کے
 بعد ریاست کے رویتے سے یہ ظاہر ہو گیا کہ وہ قوم کی دلی آرزوؤں سے صرف
 بیگانہ نہیں بلکہ اُن کی دشمن ہے تو ریل یے لیف بھی ان مخفی سیاسی جماعتوں کا
 رکن بن گیا جو روس کے مختلف شہروں میں آزادی حاصل کرنے کی غرض

سے ۱۸۱۵ء کے بعد قائم ہوئیں۔ چند سال میں ریل یے لیف ان جماعتوں کی شمالی شاخوں کا سردار مقرر ہو گیا اور دسمبر ۱۸۲۵ء میں زار نکولائی (۱۸۲۵ء-۱۸۵۵ء) کی تخت نشینی پر ان جماعتوں نے زیادہ تر اس کے اُکسانے سے بغاوت کا جھنڈا بلند کیا۔ سرکشی کی سڑ میں جون ۱۸۲۶ء میں ریل یے لیف کو پھانسی ہو گئی۔

ریل یے لیف کے کلام میں پہلے صرف وطن پرستی کا جذبہ موجزن رہا لیکن رفتہ رفتہ اس نے اس تنگ حلقے سے نکل کر آزادی اور سرفروشی کو اپنا موضوع بنایا۔ محکمہ احتساب نے اس کی نظموں کی باقاعدہ اشاعت نہیں ہونے دی، مگر اس کا کلام قلمی لقلوں کی صورت میں ہاتھوں ہاتھ تمام روس کی گشت لگاتا تھا۔ اس کی سب سے مشہور نظم ”دوئی نروف سکی“ جس میں اُس نے روس کو چک کے ایک آزادی کے متوالے کا قصہ سنایا ہے جسے پیٹر اعظم نے قید کر کے سائی بیریا بھیج دیا تھا۔ سائی بیریا میں دوئی نروف سکی کی نوجوان بیوی اُس کے پاس پہنچ گئی، لیکن بیچاری آب و ہوا کی سختیاں برداشت نہ کر سکی۔ وہ بہت جلد مر گئی اور دوئی نروف سکی کو جس کی اُمیدیں پہلے ہی خاک میں مل چکی تھیں، بالکل تنہا اور بے بس کر دیا۔ قصہ بہت دردناک تھا، ریل یے لیف نے اُس کے بیان کرنے میں معمول سے زیادہ شاعرانہ خوبیاں دکھا کر بیوی کی محبت اور آزادی کی پرستاری کا حق ادا کیا اور یہ نظم ساہا سال تک روسی وطن پرستوں کے دلوں میں بہت لہ دیکھے ”سیاسی تحریکیں“۔

اور درد اور آزادی کے فدا یوں سے محبت اور ہمدردی پیدا کرتی رہی۔
 ”وہی نردن سکی“ کے سواریلے یف نے کوئی لمبی نظم نہیں لکھی
 اور اس کے بقیہ کلام میں اس نظم کا جواب نہیں ملتا، لیکن پھر بھی اس کی مختصر
 نظمیں ایک شدید اور پاک جوش سے لبریز ہیں جو ان کی ادبی خامیوں پر
 پر وہ ڈال دیتا ہے۔ ایک نظم کا ترجمہ ملاحظہ ہو۔

ای پُر شکوہ آزادی کے جذبے!
 میری قوم کا دل تجھ سے نا آشنا ہے...
 اسی انتقام آسمانی! میری قوم خاموش ہے،
 زار کے خلاف سر نہیں اٹھاتی۔
 خود مختار ظالم آقا کی غلامی میں
 وہ دائمی اطاعت سے اخراج نہیں کرتی
 اس کا دل اپنا دکھ محسوس نہیں کرتا،
 اس کا ذہن یہ نہیں مانتا کہ وہ دکھی ہے۔
 میں نے غلام روس کو خانہ خدا میں
 مقدس شبیہ کے سامنے دیکھا؛
 اپنی زنجیریں کھڑکاتا ہوا، سر جھکائے،
 وہ زار کے لیے دعائیں مانگ رہا تھا۔

لیف گے فی جی ابراہیم پوچ بار اتین سکی (۱۸۴۴-۱۸۰۰)

بار اتین سکی زبان دانی اور سخن سنجی میں استاد مانا جاتا ہے شروع جوانی میں وہ فنستان میں جلا وطن کر دیا گیا تھا، وہاں کے برف پوش مناظر قدرت نے اس کے دل پر بہت اثر کیا، اور اس کی شاعری میں ضبط اور پاکیزگی کا ایک عجیب انداز پیدا کر دیا۔ اپنے زمانے میں وہ اپنے گہرے خیالات اور فلسفیانہ مضامین کی بنا پر بھی مشہور تھا۔ لشکن کو اس کا کلام خاص طور سے پسند تھا اور اس معاملے میں تعلیم یافتہ روسی عموماً اُس کے ہم خیال تھے۔

شہسار کے بعد کی سیاسی شورشوں میں اس کی یاد بالکل بھلا دی گئی اور اس دور میں آرٹ کی نسبت جو خیالات تھے ان کے مطابق بار اتین سکی میں کوئی ایسی خوبیاں بھی نہیں تھیں کہ اُس کی یاد زندہ رکھی جائے لیکن صدی کے آخر میں پھر اُس کے کلام کی طرف توجہ کی جانے لگی اور مجلس شعرا میں اُسے پھر وہ رتبہ مل گیا جس کا وہ مستحق تھا۔ ”ایڈا“ میں بار اتین سکی نے فنستان کے ایک قصے کو نظم کیا ہے۔ ”یگینڈ“ ایک نیم فلسفیانہ نظم اور ”جھٹ پٹا“ اس کے کلام کے بہترین نمونے مانے گئے ہیں۔ اس کا خاص طرز ذیل کی نظم سے بھی واضح ہو جائے گا جو اس نے جرمن شاعر گوٹے کی دفا پر لکھی تھی۔ افسوس ہے ترجمے میں زبان کی فصاحت اور الفاظ کا وہ ترنم نہیں پیدا کیا جاسکتا جو نظم کی جان ہے۔

وہ آن کھڑی ہوئی اور اس با عظمت بزرگ نے اپنی عقاب کی سئی نکھیں

آرام کرنے کے لیے بند کر لیں،
اس کے چین اور سکون میں کوئی چیز خلل انداز نہیں، کیوں کہ
وہ اس دنیا میں

اپنا کام سارا ختم کر کے گیا ہے؛
اس معجز نگار کی قبر پر آہ و زاری نہ کر، افسوس نہ کر
کہ اس کا جسم کیڑوں کی نذر ہو گا،
اس کا سورج غروب ہو گیا، لیکن دنیا میں کوئی جان دار شے نہیں
جس سے اس نے آشنائی کی رسم نہ پیدا کی ہو،
اس کا دل ایسا تھا جس نے ہر اس صدا کا جواب دیا
جو ہمارے دل سے جواب کی امیدوار ہوتی ہے،
اس کے بلند پرواز خیال نے کل کائنات کی سیر کی،
اور لامکان کی حد تک پہنچ گیا۔ *

اس کی روح کی پرورش تمام نعمتوں سے ہوئی تھی؛ حکیموں کے
محنت سے جاہل کیے ہوئے علم سے
فنونِ لطیفہ کے الہامی کرشموں سے
بزرگوں کی روایات، گزشتہ زمانے کی آرزوؤں،
انسانیت کے عہد شباب کی امیدوں سے۔
اس کا تصور ایک اشارے پر اُسے ہر جگہ پہنچا دیتا
چاہے غریب کی جھوپڑی ہو یا بادشاہ کا محل۔

وہ فطرت کا ہمدرد اور دمساز تھا،
 ننھے چشموں کا تلا کر بولنا،
 پتیوں کی بات حیرت سمجھتا تھا۔
 گھاس کا بڑھنا محسوس کرتا تھا،
 ستاروں کے راز اس کے لیے ایک کھلی کتاب تھے،
 سمندر کی موج اس سے ہم کلام ہوتی تھی۔
 انسان کی ہستی اس نے پرکھ لی تھی، انسان کا وہ استھان لے چکا تھا!
 اگر جہانی زندگی پر۔
 خدا نے ہماری ہستی کے صبارِ فتارِ دور کو ختم کر دیا ہے
 اور قبر کے خندق کے اس پار
 مادی دنیا کے دوسرے کنارے پر کوئی نئی زندگی ہماری منتظر نہیں
 تو خدا اس کی قبر کو عزت بخشے گا۔
 اور اگر مرنے کے بعد پھر جینا ہی،
 تو وہ اس دنیا سے بالکل دست بردار ہو کر،
 اور پھر یہاں کی صداؤں کا ایک خوش آہنگ، پر معنی جواب دے کر
 زمین کا پورا حق ادا کر دے گا۔
 اس کی روح پرواز کر کے اپنے خالق کے پاس پہنچ جائے گی،
 اور اس زندگی کی یاد اسے جنت میں نہ ستائے گی۔

نکولائی میخائلووچ یزی کوف (۱۸۳۶-۱۸۰۳)

باراتین سکی کی طرح یزی کوف فصاحت بیان اور قادر الکلامی میں مشہور ہے۔ بد قسمتی سے اس کی ساری عمر بیماری میں گزری اور عین اس وقت جب اس کی طبیعت کے جوہر کھل رہے تھے اُسے موت نے آگھیرا لیکن گو اس کا ذہن پوری نشو و نما نہ پاسکا اس کے کلام میں بہت سی خوبیاں ہیں جن میں سب سے نمایاں اس کا مستانہ ترنم ہے جو بقول روسی نقادوں کے ایک نہایت لطیف نشہ پیدا کرتا ہے۔ ایک نظم کا ترجمہ ملاحظہ ہو:-

”بحری سیاح“

ہمارا سمندر مردم بیزار ہے،

دن رات شورش میں رہتا ہے۔

اس کی ہلاکت خیز وسعت میں

بہت سے مصیبت زدہ دفن ہیں۔

بھائیو! ہمت باندھے رہو! میرے بادبانوں میں ہوا بھری ہے،

میں نے کشتی کا رخ ٹھیک کر لیا ہے

اور موجوں کی چوٹیوں پر

وہ ہوا کی طرح اڑ رہی ہے۔

سمندر پر بادل منڈلا رہے ہیں

ہوا اتند ہو گئی، موجوں کا رنگ گہرا ہو گیا ہے۔

طوفان آ رہا ہے! ہم اس کا مقابلہ کریں گے،

اس سے نبرد آزمائی کریں گے !
 بھائیو! ہمت باندھے رہو! بادل اُٹ رہا ہے،
 سمندر اُبل رہا ہے،
 موجیں اور اونچی اُچھل رہی ہیں۔
 سمندر کی کھقاہ اور نیچے چلی گئی ہے،
 وہاں طوفان کے اُس پار
 ایک دل آویز زہت کدہ ہے؛
 وہاں آسمان کو کالے بادل نہیں ڈھک دیتے،
 خاموشی نہیں چھا جاتی۔
 مگر وہاں موجیں اسی کو پہنچاتی ہیں
 جس کے سینے میں جواں مردوں کا دل ہو...
 بھائیو! ہمت باندھے رہو، طوفان کے جھونکوں سے گھری ہوئی،
 میری کشتی سینہ سپر ہو رہی ہے۔

الکے فی تے پانورچ خوم یا کوف (۱۸۶۰-۱۸۰۴)
 خوم یا کوف "سلاف و دوست" جماعت کے بانیوں میں تھا اور اپنی عمر
 اس نے زیادہ تر اسی فرقے کے سیاسی اور مذہبی فلسفے کے پرچار میں صرف کی۔
 اس کی شاعری پر بھی اسی فلسفے کا رنگ غالب ہے، اور وطن پرستی کے سوا او
 مضمون اس میں بہت کم ہیں۔ لطف جذبات نہ ہونے سے اس کا کلام کچھ

روکھا سا معلوم ہوتا ہے، مگر اپنے رنگ میں خوم یا کوف اچھا شاعر مانا گیا ہے۔
آخر عمر میں اس نے جنگ کر میا کے وقت جو نظمیں لکھیں وہ اس کے کلام کا بہترین
حصہ ہیں۔ اور "سلاف دوستوں" کی طرح خوم یا کوف کو بھی روس سے بہت سی دینا
تھیں، اس سے یقین تھا کہ روسی قوم برگزیدہ قوم ہے، لیکن اس عقیدے نے صلیت
کو اس کی نظر سے نہیں چھپایا اور وہ کسی بجا مغالطے میں مبتلا نہیں ہوا۔ ذیل کی نظم
وطن پرستی کے جذبے کے تمام پہلوؤں کو بخوبی ظاہر کرتی ہے،

روس

خدا نے تجھے حق کی حمایت کے لیے تلوار اٹھانے کا حکم دیا ہے،
تجھ پر خدا کی نظرِ التفات ہے،
تجھے ایک جلالی قوت ملی ہے،
تو ان اندھی، دیوانی، وحشی قوموں کو نیست و نابود کر دے گا
جو دنیا میں بدی کے بیج بوتی ہیں۔
اٹھ کھڑا ہو میرے عزیز وطن!
بھائیوں کی حمایت کر! خدا تجھے
ذینوب کے اس پار بلا رہا ہے۔
وہاں جہاں سمندر کی موجیں
اپنے مکروں سے ساحل کو جگا دیتی ہیں۔

لے بلغاریہ اور سر دیا کے باشندے بھی سلاف نسل کے ہیں۔ انھیں ترکوں کی حکومت
سے آزاد کرنا روسی مددروں اور وطن پرستوں کی دلی آرزو رہی ہے۔

مگر یاد رکھ : نیابتِ الہی
 مخلوق کے لیے دشوار ہی؛
 اپنے خاص بندوں سے خدا سختی سے باز پرس کرتا ہی،
 اور افسوس تیرے کندھوں پر
 ہیبت ناک گناہوں کا یوجھ ہے۔۔۔
 خدا کے سامنے اپنی روح کو سجدہ کرا۔
 اپنے سر کو خاک پر رکھ کر
 عاجزی اور پامالی کو اپنی عبادت بنا،
 اور اپنے گمراہ ضمیر کے زخموں کا
 آنسوؤں کے پاک مرہم سے علاج کر۔
 پھر اٹھ، اپنے پاک مقصد پر ایمان لا،
 میدانِ جنگ کی خون آلود خاک میں اپنا زور بازو دکھا
 اپنے بھائیوں کے لیے خون کے دریا بہا دے،
 حق کا جھنڈا مضبوطی سے پکڑ لے،
 پھر تلوار چلا۔ یہ تلوار خدا کی تلوار ہوگی۔

عوام سے بھائی چارہ کرنے کی اُمنگ روس میں ستارے کے بعد پیدا ہوئی،
 مگر عوام کے ادب اور تہذیب سے دلچسپی روس کی ذہنی بیداری کے ساتھ نہیں
 صدی کے شروع میں ظاہر ہونے لگی۔ لیرمنتوف کی مشہور نظم کا ترجمہ اوپر دیا جا چکا

جو اس نے عوام کے طرز پر لکھی اور لٹکین نے کئی عوام کی کہانیاں نظم کیں جو اس نے اپنی کھلائی کی زبانی سُنی تھیں۔ گوان لٹوں کو ادبی اہمیت بہت ہو لیکن پھر بھی یہ محض طبع آزمائیاں ہیں۔ لٹکین اور زیر منتوت کا ہم عصر کولٹ سوف ایک شاعر تھا جس نے عوام کا طرز بالکل اختیار کر لیا اور عوام کی زندگی اور جذبات کو اپنا خاص موضوع بنایا۔ کولٹ سوف کے گیتوں کی آواز ابھی گونج ہی رہی تھی کہ الگ سے نئی ٹالسٹائی اور نی کی تن نے اپنے ترانے چھیڑے اور عوام کے شاعرانہ مذاق کی لطافت اور اس کے حسن کو روس کیا ساری یورپی دنیا کے اہل ذوق پر روشن کر دیا۔

الک سے نئی ویسل یوج کولٹ سوف (۱۸۰۹-۱۸۴۲) کولٹ سوف صوبہ ورونیزر کے ایک مونیخوں کے تاجر کا بڑا کا تھا۔ شروع میں اسے اسکول میں کچھ تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملا مگر چونکہ اس کے باپ کا ارادہ اسے اپنے پیٹے میں لگانے کا تھا، کولٹ سوف بہت جلد اسکول کے بجائے مونیخی چرانے کے لیے بھیجا جانے لگا۔ اتفاق سے اسکول کے ایک استاد اور شہر کے ایک تاجر کتب اس پر مہربان ہو گئے اور ان کے ذریعے سے کولٹ سوف نے صرف اپنی علمی استعداد نہیں بڑھائی بلکہ شعر لکھنے کی مشق بھی شروع کر دی۔ یہی زمانے میں وہ ایک لڑکی پر عاشق ہو گیا اور اس جذبے کے دردناک انجام نے اس کی طبیعت میں دل کی کیفیتیں ظاہر کرنے کی اور بھی شدید آرزو پیدا کر دی۔ اتفاق سے اس کے

کلام کے نمونے ماسکو کے ایک مشہور رئیس اور ادب کے سچے دوست ستان
کیے وچ کی نظر سے گزرے اور ستان کیے وچ نے صرف اس کی ہمت افزائی
نہیں کی بلکہ اسے اپنے ساتھ ماسکو گئے کیا، اسے روس کے ادبی مشاہیر کی صحبت
سے فائدہ اٹھانے کا موقع دیا اور ۱۸۳۳ء میں اس کی نظموں کا پہلا مجموعہ اپنے
خرچ سے شایع کرایا۔ اس کے بعد کوٹ سوف کو سرپرستی کی حاجت نہیں تھی۔
اس کی نظموں کا وہ شہرہ ہوا جو بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے مگر افسوس موت
نے اس پھول کو کھلنے سے پہلے ہی توڑ لیا۔

کوٹ سوف کی پرورش گائوں میں ہوئی تھی، اس کے جذبات نے دیہات
کی فضا میں تربیت پائی تھی، اس کا فلسفہ زندگی وہی تھا جو روسی کسانوں
کا ہوا کرتا ہے۔ لیکن اور لیبر منتوف کی طرح اس نے اپنے آپ کو تصور کے زو
سے ایک دنیا سے دوسری دنیا میں نہیں پہنچایا، اس کی شاعری ایک
سچے دیہاتی کی نغمہ سرائی ہے جو شہری مذاق کی لطافتوں سے بالکل نادققت،
پرندوں کی طرح لہرا کر گاتا ہے۔ اس کے بے ساختہ پن ہی میں اس کے فن
کا کمال ہے، اور جن چند نظموں میں اس نے وہ مضمون باندھے ہیں جو دیہاتی
فلسفہ زندگی میں شامل نہیں وہ اُس کے دوسرے کلام کے مقابلے میں
بہت گری ہوئی ہیں۔ کوٹ سوف کی طبیعت اپنی رنگینی اسی وقت دکھائی
ہو جب وہ دیہاتی موسم کی کیفیتیں اور جذبات پر اس کی فضا کا اثر بیان
کرتا ہے، دیہاتی عشق اور درد کی داستانیں سناتا ہے، یا اس تقدیر کی شکایت
کرتا ہے جس نے انسانوں کو بے لیں کر دیا ہے اور اس پر بھی ایک سوتیلی ماں کی

طرح دیکھ پہنچانے سے باز نہیں رہتی۔ کولٹ سوف کی نظم میں کھیتوں کا لہرنا، کھیتی کا کٹنا، دیہاتیوں کی معمولی سے معمولی خواہشیں اور ضروریات، ان کا رنج اور ان کی خوشیاں، ان کی آرزوئیں اور نا کامیاں سب ایک نہایت لطیف شاعرانہ انداز میں نظر آتی ہیں اور ہم کو کبھی خیال نہیں ہوتا کہ یہ روز مرہ کی باتیں ہیں، ہرگز یقین نہیں آتا کہ یہ داستان افسانہ نہیں، زندگی کی سچی تصویر ہے۔

رولیف اور قافیہ ترقی یافتہ مذاق کی ایجادیں ہیں، ان کا جذبات سے کوئی تعلق نہیں اور وہ عموماً عوام کی شاعری میں نہیں پائے جاتے ہیں اس لیے کہ عوام کی شاعری پڑھی نہیں جاتی، صرف گائی جاتی ہے اور دراصل جب تک وہ گائی نہ جائے اس کی صورت ایک اچھے مگر ناموزوں شعر کی سی ہوتی ہے۔ کولٹ سوف کی نظموں کو بھی اسی نقطہ نظر سے دیکھنا چاہیے۔ ان میں نفاست اور طرز بیان کی باریکیاں تلاش کرنا فضول ہے، پڑھنے میں ان کے مصرعے اکثر ناموزوں معلوم ہوتے ہیں۔ وہ اسی وقت مزہ دیتی ہیں جب کوئی خوش آواز روسی بالائی کا ہاتھ میں لے اور انھیں روسیوں کے خاص بھاری پردہ لہجے میں گاکر سنائے۔ لیکن پڑھنے میں بھی خیالات کی سادگی اور طرز بیان کا بھولا پن خاصا لطف پیدا کر دیتا ہے۔ مثال کے طور پر تین نظموں کا ترجمہ کیا جاتا ہے۔

لے تین تاروں کے سرود کی قسم کا ساز جو روسیوں کا قومی باجا ہے۔

گیت

مت کا بلبل
 میری کھڑکی کے سامنے،
 جا، میرے دیس کے
 جنگلوں میں اُڑ کر جا!
 جا، میری پیاری کی
 کھڑکی پر فریاد کر!
 اپنی سُرِ ملی لگی میں
 میرے اشتیاق کا حال سنا...
 اُسے سنا دے کہ اُس بن
 میں کمھلا رہا ہوں، مڑھجارہا ہوں،
 جیسے میدانوں کی گھاس
 خزاں کے آنے پر۔
 اُس بن چاندنی راتیں
 مجھے اندھیری لگتی ہیں،
 دن کی دھوپ میں
 چمک نہیں، گرمی نہیں،
 وہ تہ ہو تو مجھ سے
 دروازے پر کون پیار سے ملے؟

اپنے تھکے ماندے سر کو
 کس کے سینے پر ٹسکھ نیند سلاؤں؟
 کس کی میٹھی میٹھی باتیں
 سُن کر مسکراؤں؟
 کس کا گیت، کس کا پیار سے ملنا
 میرے دل کو بھائے؟
 تو کیا گارہی ہے
 میری کھڑکی کے سامنے، ببل
 جا، جا، اُڑ کر جا
 میری پیاری کے پاس۔

شور نہ مچا
 شور نہ بچا، امی گہیوں کے کھیت
 اپنی بچی بالیوں کی زبان سے،
 ستپ لے کی یاد میں گیت نہ گا۔

لے ”ستپ“ ان وسیع ہوا ر میداؤں کو کہتے ہیں جو دس کے جنوبی، جنوب مشرقی اور
 مشرقی حصے میں پائے جاتے ہیں۔ ان میں گھاس کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا اور ان کے
 باشندے مویشی پال کر گزار کرتے ہیں۔ ”ستپ“ کی اپنی الگ فضا ہوتی ہے اس کے
 باشندے اپنی جولا نگاہ کی وسعت دیکھ کر آزادی اور خود مختاری کے شیدائی بن جاتے
 ہیں، اکائیات سے ان کا ایک خاص تعلق ہو جاتا ہے جس میں انھیں اپنی شخصیت ایسی طرح
 بقیرہ سفر آتا

امی کھیت کاٹنے والے،
 اب کیا ہو جو میں
 گھر گریستی کا سامان کروں۔
 اب کیا ہو جو میں
 دولت اکٹھا کروں !
 جو ان نے روپیہ جوڑ جوڑ کر رکھا تھا،
 دولت جمع کی تھی،
 کچھ اپنے لیے نہیں
 اپنی پیاری کے لیے۔
 اس کی آنکھ سے آنکھ لڑتی
 تو میرا دل کیسا خوش ہوتا،
 اس کی آنکھیں بھری تھیں،
 رس سے، محبت سے !
 اب ان آنکھوں کا چراغ
 گل ہو گیا ہی،

(بقیہ صفحہ گزشتہ) غیر محمد و نظر آنے لگتی ہے جیسے خود سستپ اور انھیں ایسی جگہ اور ایسے
 ماحول میں رہنا بہت دودبھرتا ہے جہاں ان کی نظر دور دور کی سیر نہ کر سکے، اور
 ان کے رہنے پہنے میں کسی قسم کی پابندیاں ہوں۔ ”سستپ“ کی یاد میں گیت گانا گویا
 کھوئی ہوئی آزادی کا ماتم کرنا ہے۔ لہٰذا داستان سننے والے کی مراد اپنے آپ سے،

میری پیاری
 مردوں کی نیند سو رہی ہے۔
 پہاڑ سے بھاری،
 بیچ رات کے اندھیرے سے بھی کالا،
 میرے دل پر بوجھ ہو
 جدائی کے دکھ کا۔

جدائی

جب جوانی کا سورج نکل رہا تھا
 مجھے دل و جان سے ایک پیاری لڑکی سے محبت تھی،
 اس کی آنکھوں میں سورج کی چمک تھی،
 اس کے چہرے پر محبت کی آگ جل رہی تھی،
 اس کے سامنے تیری کیا مہستی تھی، بہار کی صبح،
 یا تیری، ہرے بھرے شاہ یلوط کے درخت،
 یا تیری، ستپ کی گھاس، سبز مغل کی چادر،
 یا تیری، اسی جھٹ پٹے، یا تیری، اسی جاو و بھیری رات !
 تم پر تو نظر تب ہی پڑتی ہے جب وہ نہ ہو،
 جب تم کو کوئی اپنے درد اور اشتیاق کا حال سنائے !
 وہ سامنے ہو تو تم دکھائی بھی نہیں دیتے...
 وہ ساتھ ہو تو جاڑا بہار ہو جاتا ہے، اندھیری رات اُجالا دن !

وہ گھڑی کیسے بھول جاؤں جب میں نے آخری بار
 اس سے کہا ”خدا حافظ“ میری پیاری!
 شاید خدا کی یہی مرضی ہو کہ ہم جدا ہو جائیں،
 مگر پھر کبھی ملیں گے...“
 اک دم اس کے چہرے پر آگ سی پھٹک اٹھی،
 پھر وہ برف کی طرح سفید پڑ گیا۔
 تڑپ کر دیوانوں کی طرح
 وہ میرے سینے سے لپٹ گئی۔
 ”ابھی تہ جا، ذرا ٹھیک مہلت دے
 کہ دل کو سنبھال لوں، سو رما کے کندھے پر
 رو کر اپنے رنج کو بہا دوں...“
 وہ سسکیاں لینے لگی، بات زبان پر آ کر رہ گئی...

اوان ساموئیل کی تن (۱۸۲۴-۱۸۹۱)

نی کی تن کو لٹ سوت کے وطن شہر وورونٹیر میں پیدا ہوا۔ فلسفے کے
 علاوہ ایک اور مصیبت یہ تھی کہ اس کا باپ شرابی تھا اور نی کی تن کا بچپن
 اور اس کی جوانی نہایت درجہ تنگ دستی اور افلاس میں گزری۔ مگر تمام دشواریوں
 کے باوجود نی کی تن نے اچھی خاصی تعلیم حاصل کر لی اور ۱۸۵۳ء میں جب کریمیا
 کی جنگ شروع ہوئی تو اس نے چند وطن پرستانہ تنظیمیں تیار کر کے ادبی

دنیا میں کچھ نام پیدا کر لیا۔ لیکن یہ اس کا اصلی رنگ نہیں تھا اور اسے مشہور اس کی لمبی نظم ”کولاک“ نے کیا، جو دیہاتی زندگی کی ایک سچی اور دل سوز تصویر تھی۔ کولاک سوف کی طرح نی کی تن کا موضوع بھی عوام کی زندگی اور دیہاتی فضا تھی، لیکن زبان اور اسلوب میں اس نے عوام کا طرز نہیں اختیار کیا۔ اس کی نظم میں کوئی نرالی صفت نہیں ہے، پھر بھی دیہاتی فضا کی کیفیات بیان کرنے میں بہت کم شاعر اس کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ غربت کی تکلیفوں نے اس کے کلام میں ایک درد بھی پیدا کر دیا جو کبھی کبھی مایوسی اور خزن کی انتہا تک پہنچ جاتا ہے۔ موت کا ایک خیالی منظر دیکھیے:-

پھوڑے نے ایک گہری خندق کھود دی ہے،

یے لطف زندگی، تنہائی کی زندگی،

بے آرام زندگی، بوجھل زندگی،

خزاں کی رات جیسی خاموش زندگی،

گزر گئی میری غریب زندگی، خونِ جگر پینے پیتے،

بچھ گئی، جیسے نقِ دوق میدان میں کوئی جھوٹی سی چنگاری۔

کیا ہوا؟ سو جا، میرے سنگدل نصیب!

لکڑی کے تختے میں مضبوطی سے کیلیں جڑی جا رہی ہیں،

اوپر سے گیلی سٹی پاٹی جا رہی ہے

”کولاک“ دیہاتی سا ہونکار کو کہتے ہیں۔

سکے یورپ میں جنازے دفن ہونے سے پہلے کڑی کے صندوق میں بند کر دیے جاتے ہیں۔

دنیا میں بس ایک آدمی کم ہوا ہے...
 اس کے اٹھ جانے کا کسی کو افسوس نہیں،
 اور کسی کو کیا غرض کہ اس کی یاد زندہ رکھے!
 قبرستان کی ایک مہمان، ایک موسمی چڑیا
 بے فکری سے گارہی ہے،
 آزاد می سے صاف شفاف ہوا میں تیر رہی ہے،
 چاندی کے ریزوں کی طرح اس کے گیت کے سر بکھر رہے ہیں۔
 خاموش!... زلیست کا معنہ اب حل ہو گیا ہے۔
 اب نہ آنسو درکار ہیں نہ گیت

الک سے ٹی کونس تان تی نو پچ تالستائی (۱۸۱۴-۱۸۷۵)
 پیشہ ور نواب (کاؤنٹ) تالستائی کا ایک عزیز دار، روس کے دولت مند
 زمینداروں میں سے تھا۔ زار الکساندر دوم سے اس کی گہری دوستی تھی اور
 اس کی ساری عمر دربار میں گزری، مگر اس نے کبھی کوئی عہدہ یا منصب قبول
 نہیں کیا۔

شپکن کی طرح الک سے ٹی تالستائی نے بھی ایسا ذہن پایا تھا جس کی
 وسعت اور ہمہ گیری حیرت انگیز تھی۔ ادب کے تقریباً ہر میدان میں اس
 کی تصانیف نے شہرت حاصل کی، خصوصاً تاریخی ڈراما اور شاعری میں۔ اس کی
 لہ اس کے ڈراموں کا ذکر ”روسی ڈراما“ کے سلسلے میں آئے گا۔

نظموں میں بھی بہت رنگارنگی ہو، کچھ اس نے کولٹ سوف کی طرح عوام کے طرز پر لکھی ہیں، کچھ دیہاتی فضا پر، کچھ روس کے مناظر پر۔ اس کے اس کلام میں وہ دروہنیں جو کولٹ سوف کی خاص خوبی ہو اور عوام کے طرز کے ساتھ وہ ان کی ذہنیت نہیں اختیار کر سکا، اس کے جذبات وہ نہیں ہیں جو روسی کسان یا دیہاتی کے عموماً ہوا کرتے ہیں، لیکن دیہاتی فضا کی کیفیات اس نے بہت دل آویزی اور نفاست سے بیان کی ہیں، خصوصاً جہاں عشق کا مضمون آگیا ہو۔ اس کے علاوہ اس نے بہت سی چھوٹی بڑی طنزیہ نظمیں لکھی ہیں، جو اپنی طرز میں بے نظیر ہیں۔ اس کی ظرافت آمیز شاعری کا بھی روسی ادب میں جواب نہیں۔ ”یوحنا مشقی“ اس کی ایک لمبی نظم، جس کے ایک حصے کا یہاں ترجمہ کیا گیا ہو، مذہبی جذبے کی ایک جلالی کیفیت دکھاتی ہو، تالستانی کی ذہنیت کا ایک دوسرا اور گہرا پہلو، مختلف قسم کی نظموں کے چند ترجمے دیے جاتے ہیں۔

تجھے یاد ہو، مریم؟
ایک پرانی وضع کا مکان،
اودا اونگھتے ہوئے تالاب کے گرد
لیمو کے سال خوردہ درخت؟
خاموش روشیں۔
اُجڑا ہوا باغ
اونچے برآمدے میں۔

تصویروں کی لمبی قطار؟
 تجھے یاد ہے، مریم،
 شام کو آسمان کی رونق،
 کھیتوں کے زراخ میدان،
 دور کے کانوں کا غل؟
 باغ کے پیچھے دریا کے صاف ستمے کنارے،
 اطمینان سے بہتی ہوئی ندی،
 سنہرے کھیتوں میں،
 سدپ کے نیلے پیلے پھول؟
 وہ کنج جہاں پہلے پہل ہم دونو
 اکیلے پھرتے تھے؟
 تجھے یاد ہیں، مریم،
 وہ کھوئے ہوئے دن؟

”یہ خدا و شفی“ کیتھولک کلیسا کی سناجات ”*Dies irae*“ کے
 طرز پر لکھی گئی ہے اور اس میں رہبانِ فلسفہ زندگی بیان کیا گیا ہے۔ چنانچہ اقتباس
 ملاحظہ ہوں :-

اس دنیاوی زندگی میں کون سی راحت
 رنج کی آمیزش سے بالکل پاک ہے؟
 کونسی تمنا ہے جو بے سود نہیں؟

کون ہے وہ جسے مسرت کی دولت نصیب ہوئی ہے؟
 وہ سب کچھ بے بنیاد ہے، سب بے حقیقت ہے
 جو ہم نے محنت اور مشقت سے حاصل کیا ہے۔
 دنیا میں وہ شہرت کسے ملی ہے،
 جو قائم رہے اور جھوٹی نہ ہو؟
 سب خاک ہے، سب دھوکا، ایک پرچھائیں سی، یاد صواں،
 بھونچال کی طرح ایک آن میں سب نظر سے غایب ہو جاتا ہے،
 اور موت آتی ہے تو ہم کو
 برہنہ اور بے بس پاتی ہے۔
 زور آور کا باقہ کمزور ہو جاتا ہے،
 بادشاہوں کا بھی کوئی پوچھنے والا نہیں ہوتا۔
 امی خلاء، اپنے بنکے پر جو یہاں سے رخصت ہوا ہے
 جنت کے دروازے کھول دے !

گلتی ہوئی ہڈیوں کے ڈھیر میں
 کون بادشاہ ہے، کون غلام، منصف کون اور مجرم کون؟
 کون ہے مستحق فلاح کا، فردوس کا،
 کون ہے ملعون گناہگار؟
 ارے بھائیو! کہاں ہے چاندی (اور سونا)،

کہاں ہیں لونڈی غلاموں کے لشکر؟
 گنہگار قبروں میں
 کون سی امیر کی ہر کون سی غریب کی؟
 سب راکھ ہی سب دھواں، سب خاک اور خاکستر،
 سب دھوکا ہی یا پرچھائیں سی، یا نظر کا فریب۔
 صرف تیرے یہاں، آسمان پر، ای خدا،
 قرار بھی ہے اور نجات بھی!
 جو گوشت ہے وہ سڑ گل جائے گا،
 جو وہم ہیں وہ دغا دے جائیں گے۔
 ای خدا، اپنے بندے پر جو یہاں سے رخصت ہوا ہے،
 جنت کے دروازے کھول دے!

.....

میں ایک بے جانے بوجھے راستے پر جا رہا ہوں،
 اُمید اور خوف کے پیچ و تاب میں ہوں،
 میری آنکھوں میں روشنی نہیں، سینے میں گرمی نہیں،
 کان کچھ سنتے نہیں، حواس کا پتہ نہیں،
 میں بے زبان ہوں، بے حرکت پڑا ہوں،
 بھائیوں کے رونے کی آواز مجھ تک نہیں پہنچتی،
 اور لوہان کے نیلے خوشبودار دھویں سے

مجھے کوئی فرحت نہیں ہوتی،
 لیکن بھائیو! گو میں نے ہمیشہ کے لیے آنکھیں بند کر لی ہیں،
 میری محبت جاگتی رہے گی،
 اور اسی کی خاطر، تم سے التجا کرتا ہوں، بھائیو،
 کہ سب کے سب خدا سے یہ دعا مانگو:
 اے خالق! اس روز جب صورِ اسرافیل،
 کائنات کو فنا کا پیغام سنائے،
 تو اپنے بندے پر جو اس جہان سے رخصت ہوا ہے،
 جنت کے دروازے کھول دینا!
 ایک سے فی تاستائی کی ظرافت کا ایک منہ بھی پیش کیا جاتا ہے،
 جہاں اس نے پرانی وضع کے حکام کا مضحکہ اڑایا ہے،
 کچھ رشتی کے سامنے بہت سے کسان اور مزدور
 جمع ہوئے:
 سادہ لوحی سے سب کہنے لگے کہ ہمارے پیٹ
 خالی ہیں۔
 ”بیوقوفو! منشی نے کہا“ ”تم میں سے ہر ایک کو
 سیر ہونا چاہیے

۱۷ ستمبر تک روس میں ہندوستان کی طرح انتظامی اور عدالتی محکمے یک جا تھے جس
 منشی کا یہاں ذکر آتا ہے اسے کلکٹر صاحب کا کلرک سمجھنا چاہیے۔

اس لیے کہ کل ہی انتظامی مجلس کے اراکین نے مچھلی خوب پیٹ بھر کر
کھائی تھی۔“

کسان بہت سی سن سے لدی ہوئی گاڑیاں بازار کو
لیے جا رہا تھا۔

کسان تو سیدھا سادہ ہوتا ہی ہے، وہ ان سب کو مل پر سے
لے گیا۔

”ارے بیوقوف“ منشی نے کہا، ”تو کیا سمجھتا ہے یہ پُل
بیکار ہے؟“

پُل کو گھس کر خراب نہ کر، دریا پار تیر کے جا،
جیسے بطخ۔“

واسکا دو بچک کے یہاں چور نے ایک بطخ
پکڑ لی،

تو لیے میں اسپٹ کر لے بھاگا، اور پولیس والے اس کو
پکڑ نہ پائے۔

”بیوقوف!“ منشی بولا، ”یہ تو لیا آخر کس کا تھا؟
واسکا کا؟“

۱۔ دس میں کسان ایسے غریب اور محتاج تھے کہ کسی کے پاس تو لیا ہونا تعجب کی بات تھی
اور جس کسی کے پاس ہوتا تو اس پر چوری کا گمان ہوتا تھا۔

بھر تو واسکا بھی چور ہے، بھر تو واسکا کو بھی جرم نہ
دینا پڑے گا۔“

منشی کے پاس ایک بیمار آیا کہنے لگا: ”ہائے، ہائے، ہائے،!
دُہائی سرکار کی!“

دن بھر پیٹ میں درد ہوتا ہے اور سویرے کے وقت
اور بھی -

نہ لیٹا جائے، نہ بیٹھا جائے نہ کھایا جائے
کچھ بھی۔“

”اُسی جو قوت!“ منشی بولا، ”جا کبھی خالی پیٹ پر کھانا
مت کھا۔“

منشی کے پاس ایک آدمی عرضی لے کر آیا کہنے لگا: ”غریبوں کے
مائی باپ ہو،

میرا کام کرا دو، دیکھو میرے پاس روپے پیسوں کی
تھیلی ہے،

میرے لیے تمہاری ٹوپی میں دس روپے ڈال دینا
کوئی بڑی بات نہیں۔“

منشی نے ٹوپی بڑھائی، ڈانٹ کر بولا ”اس میں روپے
فورا ڈال دو۔“

۱۔ یعنی تقریباً پندرہ روپے۔

نی کو لائی الگ سے یوچ نکر اسوف (۱۸۲۱ - ۱۸۷۸)

نکر اسوف صوبہ یو دو لیا کے ایک چھوٹے شہر میں پیدا ہوا، جہاں اس کا باپ ملازم تھا۔ اس کے باپ نے اپنی حیثیت سے زیادہ ٹھاٹھ کی زندگی بسر کر کے موروثی جائیداد گنوا دی اور آخر کار پولیس میں ایک ادنی ملازمت اختیار کرنے پر مجبور ہوا۔ خاندان چونکہ شریف تھا، اس لیے نکر اسوف کو سولہ برس کی عمر پر پتیر برگ کے کیڈٹ کالج میں داخل کر دیا گیا، مگر اس نے فوجی افسر بننے کا حوصلہ چھوڑ کر یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرنا شروع کر دیا۔ یہ اس کے باپ کی مرضی کے بالکل خلاف تھا اور سرکشی کی سزا میں نکر اسوف کا خرچ، جو ویسے بھی بہت کم تھا، بلند ہو گیا۔ طالب علمی کے تین چار سال نکر اسوف نے فائے کر کر کے گزارے اور اس کے بعد بھی کئی سال تک انتہائی افلاس کی مصیبتیں جھیلنا رہا۔ شائع کے قریب، جب وہ اخبار ”ہم عصر“ میں مضامین اور نظمیں لکھتے دیکھتے اس کا مددگار ایڈیٹر ہو گیا تو اس کی حالت کچھ سنبھل گئی اور عمر کا بقیہ حصہ اس نے کسی قدر آسودگی میں بسر کیا۔

بچپن میں نکر اسوف اپنے باپ کے ساتھ گائوں کی گشت لگایا کرتا تھا اور اسی زمانے میں اُسے دیہاتیوں کے اخلاق اور عادات اور دیہاتی زندگی کے اچھے اور بُرے، دلکش اور دلگداز پہلوؤں سے بہت گہری نصیبت ہو گئی۔ پتیر برگ میں افلاس نے اُسے شہر کے سب سے ذلیل اور گرے ہوئے لوگوں کی صحبت میں ڈال دیا اور اُسے ان کی مادی اور روحانی حالت کا بھی علم ہو گیا۔ نکر اسوف نے اپنی ذاتی مصیبتیں بہت جوں جوں

برداشت کی تھیں اور وہ اس کے دل میں نوع انسانی کی طرف سے کسی قسم کی
 بخشش، بیزاری، مایوسی یا نفرت نہیں پیدا کر سکیں۔ پتھر برگ کے ان باشندوں
 میں جو سماج سے خارج اور انسانوں میں شمار ہونے کے ناقابل سمجھے جاتے
 تھے اسے ہر طرح کے آدمیوں سے سابقہ پڑا، لیکن یہاں بھی نکر اسوف نے
 اپنا دل کھٹا نہیں ہونے دیا اور محبت اور انسانی ہمدردی کے سوا کوئی اور
 جذبہ اس کی طبیعت پر غالب نہیں آنے پایا۔ غریبوں اور عیبت زدوں سے
 محبت اور ہمدردی رکھنے کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ نکر اسوف ان کی زندگی کو قابل
 برداشت بنانے کی عملی کوشش کرے۔ ۱۸۶۱ء تک وہ اور یوشن خیال سٹیو
 کی طرح کسانوں کو آزاد کرانے کی جدوجہد میں مشغول بھی رہا، مگر پھر اس کے بعد
 عملی سیاسیات سے کنارہ کش ہو گیا۔ جیسا کہ اُس نے خود اعتراف کیا ہے: ”ہیٹ
 پالنے کی دشواریوں نے میری شاعری کھوٹی کر دی اور شاعری نے مجھے آزادی
 کا مجاہد نہیں بننے دیا“۔ نکر اسوف واقعی اس کشمکش کی وجہ سے نہ کامل شاعر
 بن سکا نہ جانناز مجاہد۔ یہ بات قابل افسوس ہے، مگر اس کے تجربے نے اس کے
 دل میں ایک ایسا سچا اور جان سوز درد پیدا کر دیا جو اس کی شاعری کی ایک
 گراں مایہ صفت ہے اور اس کی وجہ سے اُسے شاعروں میں خاص امتیاز
 حاصل ہوا ہے۔ اس درد کے خلوص اور شدت کو سارے روسی نقاد تسلیم کرتے
 ہیں، لیکن اس کے سوا نکر اسوف کی شاعری کے بارے میں بہت کم اتفاق
 رائے ہے، بعض اسے لپکن اور لیورمنٹوف کا درجہ دیتے ہیں، بعض کو اسے
 اوسط درجے کا شاعر ماننے میں بھی تامل ہے۔ فن کے نقطہ نظر سے نکر اسوف کے

کلام پر بہت سے سخت اعتراض کیے جاسکتے ہیں، لیکن اس کا تحلیل ہمیشہ
 بندی کی طرف مائل رہتا ہو اور اس کی تشبیہیں، استعارے اور مضامین اکثر
 طبع زاد ہیں۔ وہ بات اٹک اٹک کر کہتا ہو، اکثر محسوس ہوتا ہو کہ وہ اپنے خیالات
 کو بہتر الفاظ میں ادا کر سکتا تھا، مگر پھر بھی یہ کہنے کی گنجائش رہتی ہو کہ ان خامیوں
 سے اس کے خیالات پر کوئی حرف نہیں آتا۔ نقادوں میں اختلاف زیادہ تر
 اس وجہ سے ہو کہ شاعری کے معیار مختلف ہیں، ہر شخص کا معیار اس کے مذاق
 کے مطابق ہوتا ہو اور مذاق میں یک رنگی اور ہم آہنگی پیدا کرنا مشکل ہو اور
 سچ بوجھے تو کچھ ایسا ضروری یا مفید بھی نہیں۔ جن روسیوں کی طبیعت قوم پرستی
 کی طرف مائل ہو اور جو عوام سے ہمدردی کرنا، ان کی زندگی سدھارنا اپنا فرض
 سمجھتے ہیں ان کی نظروں میں نکلر اسوف کے مقابلے میں نٹکن، لیر منتوف اور
 چوچیف بھی مشکل سے جرح سکتے ہیں۔ ان کے برخلاف جو لوگ شاعری کو لطیف
 جذبات تک محدود رکھنا چاہتے ہیں اور دوسروں کی مصیبت میں ہمدردی
 کرنا اپنا اخلاقی فرض نہیں سمجھتے وہ نکلر اسوف کے فن کی خامیوں کو بہت زیادہ
 محسوس کرتے ہیں اور اس کی عظمت کبھی تسلیم نہیں کر سکتے۔ ان دونوں کے درمیان
 جو بہت بڑا فرقہ ایسے لوگوں کا ہو جنہیں نازک احساس یا باریک بین نظر رکھنے
 کا دعویٰ نہیں ہو وہ نکلر اسوف کے بارے میں کوئی قطعی رائے نہیں قائم کر سکتے
 اس کے خیالات کا ان کے دلوں پر ضرور اثر ہوتا ہو مگر اس کی نظم کو موزوں
 پڑھنے میں انہیں اکثر دشواری بھی ہوتی ہو۔

نکلر اسوف کی نظمیں زیادہ تر حقیقت نگارانہ ہیں، ان میں دیہاتی اور شہری

زندگی کی پُرورد تصویریں ہیں یا دل سوز واقعات بیان کیے گئے ہیں اُس کے سامنے کلام میں وہ درجہ تجریا و انسانی ہمدردی نے اُس کے دل میں پیدا کیا تھا نمایاں ہوا وہ خاص فلسفہ بھی جو اُس در دکا نیچے تھا نہ کر اسوف غریبوں کی جہانی اور روحانی تکلیفوں کی داستان سنا ہوا میروں کے ظلم اور سرد مہری پر روتا ہوا اور دنیا کے اس نظام کی شکایت کرتا ہوا جس نے انسان اور اس کی تمناؤں کو اس قدر بے بس کر دیا ہے۔ اس کی آخری صدا اُمید اور دلا سے کی ہوتی ہے، مگر یہ دلا سا وہ اسی وقت دیتا ہے جب وہ دوسروں کو اپنی طرح رنج اور خزن میں مبتلا کر کے ان کے دلوں کو وہ صدمے پہنچا لیتا ہے جو اس کے اپنے دل نے برداشت کیے ہیں۔ یہ دلا سا کسی اعلیٰ نصب العین کی صورت نہیں اختیار کرتا، نکر اسوف نے نہ کسی بہتر زندگی کے خواب خود دیکھے نہ دوسروں کو دکھا سکتا ہے، وہ ہمارے دل میں صرف ایسے جذبات بیدار کرتا ہے جن سے اس نے اپنی زندگی میں تسلی اور تسکین حاصل کی، جو اس کے درد کی دوا تو نہیں تھے مگر اسے خزن اور بایوسی اور کلیت کے مرض میں ہمیشہ کے لیے گرفتار ہونے سے بچاتے رہے۔

”روس میں کون چین سے رہتا ہے“ نکر اسوف کی سب سے لمبی اور اکثر نغادوں کی رائے میں اس کی بہترین نظم ہے چند کسانوں میں یوں ہی باتوں باتوں میں یہ بحث چھڑ جاتی ہے کہ روس میں کس طبقے کے لوگ سب سے زیادہ خوش اور مطمئن ہیں اور چونکہ وہ بحث سے مسئلے کو طو نہیں کر سکتے اس لیے وہ ملک کا چکر لگاتے ہیں اور ہر طبقے کے نمائندوں سے اس کی زندگی کے اصل حالات دریافت کرتے ہیں۔ گو گول کی طرح نکر اسوف اس طریقے سے

روس کی دردناک حالت بیان کرتا ہوا اور اگرچہ اس کی نظم میں فن کے اعتبار سے صرف بعض حصے واقعی اچھے ہیں اس نے کیرکٹروں کی صوت گری میں کمال دکھایا ہے۔ اس کی حقیقت نگاری گوگول کی ”مردہ روجوں“ کا مقابلہ کر سکتی ہے۔ لمبی نظموں میں روس میں کون چین سے رہتا ہے ”کے بعد“ ”لال ناک والے پالے“ کا درجہ آتا ہے جس میں ایک غریب کسان کی بیوہ واریا کا قصہ ہے جو اپنے شوہر کے کفن کے لیے لکڑیاں کاٹنے کو جنگل جاتی ہے اور وہاں پالے میں ٹھٹھ کر مر جاتی ہے۔ لال ناک والے پالے کی شکل میں موت کو آتے دیکھ کر وہ گھبراتی نہیں جلاتی نہیں۔ شکایت نہیں کرتی، صرف گزشتہ زندگی کے چند پیارے منظر اس کے سامنے آ جاتے ہیں اور آخر میں اسے ایک سر ملا گیت سنائی دیتا ہے جسے سننے سننے وہ اس دنیا سے رخصت ہو جاتی ہے۔ ان دونوں نظموں کے علاوہ نکر اسونیا ایک اور لمبی نظم بھی قابل ذکر ہے جس میں وکیبرست بغاوت کے سر اور لوگوں کی داستان اور سائی بیریا میں ان کی زندگی کی کیفیت بیان کی گئی ہے، مگر اس نظم میں سوا اس حصے کے جہاں بگیم دول کو نس کیا اپنے سرز یا منتہ شوہرے ملتی ہے اور سب بہت ادٹے درجے کے ہیں۔

نکر اسون کی مختصر نظمیں فن کے لحاظ سے بہت اچھی ہیں اور ان میں اس کا تخیل بے پناہ اور ابھی معلوم ہوتا ہے، گو اکثر ان میں بھی نکر اسون مبلغ اور مصلح کا انداز ترک نہیں کرتا۔ دو نمونے ملاحظہ ہوں :-

مناجات

ایم خدا، اپنی برگزیدہ ملت کو نعمتوں سے مالا مال کر !

اس کی محنت و مشقت پر بار آورے کی برکت نازل کر!
 اس کی آزادی کی آرزوؤں کو قوت دے،
 اس کے اندر انصاف کی بنیاد کو مستحکم کر،
 تاکہ اس کی مبارک کوششیں
 کامیابی کے ساتھ جاری رہ سکیں،
 قوم کو پیاس دے
 اور علم کے سرچشمے کا اسے راستہ دکھا۔
 غلامی کی ذلت سے

اپنے یرگزیدہ بندوں کو بچا،
 کہ وہ ترقی کے راستے پر یہ لغزہ مارتے ہوئے چلیں:
 ”خدا کو روس پر بھروسہ ہی!“

ماں

اس کا دل غم سے بھرا ہوا تھا،
 اور جس وقت اس کے تین شوخ اور کھلنے لڑے بچے
 اس کے گرد کھیل رہے تھے اور شور مچا رہے تھے،
 وہ کسی خیال میں محو تھی اور اس کے ہونٹ آہستہ آہستہ کہہ رہے تھے:
 ”بد نصیب بچو، تم آخر کیوں پیدا ہوئے؟
 تم بیدھڑک تباہی کے سیدھے راستے پر چلو گے،
 تقدیر کے نکتے سے بچنے کی کوئی صورت نہیں!“

ای جاننازا اور جفاکش ماں، ان کی قسمت پر مت رو،
 ان کے روشن دلوں کو غم سے تاریک نہ کر!
 انھیں شروع جوانی ہی سے یہ سمجھا دے:
 ایک ایسا زمانہ بھی ہوتا ہے، پوری صدیاں کی صدیاں
 جب کانٹوں کے تاج سے زیادہ زیبا اور پسندیدہ
 کوئی عزت نہیں ہوتی...

نکراسوف نے اپنی نظم ”پھیری والوں“ میں روسی دیہاتن کی ذہنیت
 کا خاکہ کھینچا ہے۔ ایک لڑکی کا دوست، کوئی رنگیلا پھیری والا، ایک خاص
 تہوار کے دن تک واپس آنے کا وعدہ کر کے چلا گیا ہے۔ لڑکی
 اکثر اکیلی پڑی ہوئی
 ساری رات جاگ کر گزارتی تھی،
 اور جب اونچے گہوؤں کے کھیت کاٹتی
 تو آنکھوں سے آنسوؤں کے دریا بہتے تھے،
 وہ رنج اور مایوسی میں اپنے آپ کو ہلاک کر دیتی
 اگر رنج کرنے کی اسے مہلت ملتی،
 لیکن زمانہ کھیتی کاٹنے کا تھا، جلدی جلدی کام کرنے کا۔
 بیسیوں کام ختم کرنے تھے..

لہ یہاں اس کانٹوں کے تاج کی طرف اشارہ ہے جو انجیل کے مطابق یہودیوں نے صلیب
 پر چڑھانے سے پہلے حضرت عیسیٰ کے سر پر رکھا تھا۔

دراستی کے نیچے وہ گھانس کے ڈھیر لگا دیتی
 اور گیہوں کے انبار،
 صبح سویرے کے وقت اپنی پوری طاقت لگا کر
 اناج کھندلتی،

شام کو دیر تک شبنم سے تر چراگا ہوں میں
 کٹا ہوا سن پھیلاتی۔

سن پھیلاتی، اور ایک خیال
 کبھی اس کا سچا نہ چھوڑتا:
 ”کیا کوئی دوسری موہنی

ٹوٹا کر کے اس کے من کو بھرا رہی ہے؟
 کیا وہ بیوفائی کر رہا ہے؟ پردیس میں
 دوسری عورتوں کے پیچھے لگا رہی؟“
 یہ سوچ کر بیچاری کا دل ٹوٹ جاتا...
 ”اے تو مجھ سے شادی کر لے، مجھ سے،
 میں تجھے یا تیرے باپ کو
 کبھی خفا نہ ہونے دوں گی،
 تیری ماں کی گایاں
 چپ چاپ سن لوں گی،

اے لڑکی اپنے غائب دوست سے دل ہی دل میں خطاب کر رہی ہے۔

میں نہ شریف زادہ ہوں نہ سوداگر کی بیٹی ،
 میری طبیعت مسکین ہے ،
 تیری بیوی بنی تو ہمیشہ ...
 خاموش رہوں گی ، محنت کروں گی ،
 تجھے کام کرنے کی رحمت نہ ہوگی ،
 میرے ہاتھ پاؤں کا اور کوئی مصرف نہیں ،
 میں اپنے پیارے کے لیے
 خوشی سے کھیت بھی جوتا کروں گی ۔
 تو اپنی معنی بیوی کے بل پر
 خوب مزے سے رہنا ،
 بازاروں کی سیر کرنا ،
 مست ہونا ، گیت گانا !
 اگر تو اناج کا سوداگر کے مست واپس آئے ،
 تو تجھے کھلا پلا کر ملنگ پر لٹا دوں گی ۔
 ”سو میرے پیارے ، سو میرے موہن !“
 اس کے سوا اور کچھ نہ کہوں گی ،
 قسم ہے خدا کی ذرا خفا نہ ہوں گی ۔۔۔
 تیرے گھوڑے کو سواری کے لیے سنا دوں گی ،
 تیرے پیروں پر گر کر کہوں گی :-

”میرے دوست، مجھے پیار کرتا جا“

کوٹ سوٹائی کی تن اور الگ سے نئی تالستانی نے پڑانے اسالیب میں اس طرز کا اضافہ کیا جو عوام میں قدیم زمانے سے رائج تھا، مگر اس وقت نے مضامین میں بہت سے ایسے جذبات کو شعر کا لباس پہنایا جو عموماً شعرا کی توجہ سے محروم رہتے ہیں۔ لیکن ان کے ہم عصر اور شاعر بھی تھے جنہیں جدت کا شوق نہیں تھا اور وہ معاصر روسی زندگی اور تہذیبی مسائل سے اس قدر بیگانہ تھے کہ انہوں نے قدیم کلاسیکی اسالیب اور کلاسیکی مذاق کو اپنا رہبر بنایا اور مضامین میں بھی جدت پر اس وضع اور خمیسات کے اس رنگ کو ترجیح دی جو کلاسیکی عہد کے آخری دور میں پایا جاتا ہے۔ ان شاعروں کا معیار یہ تھا کہ آرٹ کی غرض صرف آرٹ ہے اور اسے کسی خاص زمانے کے حالات اور سیاسی یا سماجی مسائل سے کوئی واسطہ نہیں ہونا چاہیے لیکن شعراء کے بعد پچیس تیس سال تک ادب پر نئے خیالات کے مبلغوں اور قوم کے مصلحوں کا راج رہا اور یہ شاعر جو خالص آرٹ کے شیدائی تھے روس کی ادبی دنیا سے خارج رہے اور ان کے کلام کو بہت کم قدر دان نصیب ہوئے۔ ان میں سے اکثر نے شعراء سے اپنی نظموں کی اشاعت شروع کر دی تھی لیکن ان کا دور دراصل شعراء کے بعد سے شروع ہوتا ہے۔

چونچٹ ان شاعروں کا سرتاج مانا جاتا ہے اور ان میں وہی ایک تھا جو مذاق کی قدامت پسندی کے باوجود اپنے کلام میں اپنی شخصیت کو ظاہر کر سکا اور اسے لقل یا تقلید کے الزام سے پاک رکھ سکا۔ مائی کوف، فیت اور

پولون سکی، جن کا اس فرقے میں اس کے بعد درجہ آتا ہے، بڑی حد تک
 فرانسیسی، ”پارناسیوں“ کے مقلد سمجھے جاتے ہیں اور اسی وجہ سے یہ
 سارا فرقہ ”پارناسی“ کہلاتا ہے۔

لے پارناسس یونان کے ایک پہاڑ کا نام ہے۔ چونکہ یہ ناعمر کلاسیکی اسالیب کے بہت
 قائل تھے اس لیے یہ اس نام سے منسوب کیے جاتے ہیں۔

پانچواں باب

پارناسی شاعر، استعاریت اور انقلاب

اپولون نکولائی پوچ مائی کوف (۱۸۲۱ - ۱۸۹۷)

پارناسی شاعروں کی طرح مائی کوف قومی زندگی سے اس قدر بے تعلق رہا کہ اس کی اپنی زندگی میں کوئی خاص واقعات نہیں ہیں جو بیان کے لائق ہوں اور اس کے ذاتی معاملات معلوم بھی بہت کم ہیں۔ اس کا ارادہ پہلے ہی سے بننے کا تھا، لیکن شاعری کا ذوق اس ارادہ پر غالب آیا۔ اس نے چودہ سال کی عمر میں اپنی پہلی نظم شایع کی اور جس انداز سے اس کا ادبی دنیا میں استقبال کیا گیا وہ نو عمر شاعر کی ہمت افزائی کے لیے بہت کافی تھا۔ سلسلہ سے اس نے اپنی زندگی شعر و شاعری کے لیے وقف کر دی۔

مائی کوف کے کلام پر فرانسیسی شاعر آندرے شے ٹی اے اور کلاسیکی سلا فرانسیسی انقلاب کے زمانے کا ایک شاعر، جس کی غزلیں اور مرثیے مشہور ہیں۔ زبان اور

بیان میں اس نے یونانیوں کی تقلید کی ہے (۱۷۶۴ - ۱۷۹۴)

یونانی شعر کا گہرا اثر پایا جاتا ہے اور اس کے مضامین بھی عموماً خالص رومی نہیں ہیں بلکہ یورپ کی تہذیبی اور مذہبی تاریخ سے لیے گئے ہیں۔ مگر آرٹ کی پرستش اسے اپنے ملک کے حالات سے بالکل بیگانہ رکھ سکی اور اس کے کلام کا رنگ قوم کے عام خیالات کے ساتھ بدلتا رہا شروع میں وہ خالص ”پارناسی“ تھا جب شعراء کے بعد ملک میں آزادی کا غوغا ہوا تو اس کی نظموں میں اس کا عکس نظر آنے لگا اور پھر جب شعراء کے بعد لبرل تحریک کچھ کمزور پڑ گئی تو وہ بھی اپنا دامن جھاڑ کر آرٹ کے حرم میں روپوش ہو گیا۔ اس آخری تغیر سے اس کی شہرت میں بہت فرق آگیا، ورنہ اس زمانے میں بھی جب دوسرے ”پارناسی“ شاعر قوم کی بے توجہی دیکھ کر بالکل خاموش ہو گئے تھے اس کا کلام شوق سے پڑھا جاتا تھا اب اس کے قدر دان بہت کم ہیں۔

”تین موتیں“ اور ”دو دنیا“ جن میں مائی کوٹ نے یونانی اور عیسائی تہذیبوں کی جنگ دکھائی ہے اور یونانی تہذیب کو اس کے حریف سے بدرجہا بہتر ثابت کیا ہے مائی کوٹ کا شاہکار مانی جاتی ہیں۔ رومن کلیسا کی تاریخ پر بھی اس کی چند نظمیں ہیں جو روسی شاعری میں کچھ حیثیت رکھتے کا دعویٰ کر سکتی ہیں۔ لیکن مائی کوٹ نے جب کبھی معاصر رومی زندگی کو اپنا موضوع بنایا تو اسے بہت ناکامیابی ہوئی۔ تاریخی نظموں کے علاوہ جو کچھ ہیں وہ اس کی مختصر نظمیں ہیں۔ ان میں اس کے تخیل کا زور اور اس کی طبیعت کی رنگینی کچھ نظر آتی ہے اس کی زبان شیریں اور پرتنم ہے اور اس کی فصاحت کا معیار بہت بلند ہے۔ ذیل کی نظم میں اس کے کلام کا خاص رنگ کسی قدر ظاہر ہو چکا

میرا باغ روز بروز کھلا رہا ہے
ویران، اجڑا ہوا اور خالی خالی نظر آتا ہے؛
میرا دل غمگین ہے۔

خزاں کے سورج کی چمک،
درختوں کی جھڑکی ہوئی پتیاں، شام کے ٹنڈوں کی آواز
طبیعت میں الجھن پیدا کرتی ہے،

جب حسبِ عادت میری نظر چھت پر پڑتی ہے
تو کھڑکی کے اوپر ایک خالی گھونسلہ دکھائی دیتا ہے۔
اس میں ابابیلوں کی سرگوشیاں نہیں سنائی دیتی ہیں،
اس کی گھاس اور تنکے ہوا سے لٹک آئے ہیں۔

مگر مجھے یاد ہے کہ اسے بنانے میں
دوا بابیلوں نے کیا کیا کوششیں صرف کیں،
تنکوں کو مٹی سے کس طرح جوڑ کر مضبوط کیا،
ادھر اُدھر سے بال اوپر کیسے جمع کر کے لائیں۔
اپنا کام وہ کس خوشی سے کرتی تھیں، کس صفائی سے!
ان کے دل کیسے باغ باغ تھے جب گھونسلے سے
پانچ ننھے چنچل بچوں نے

سرنکال کر ادھر اُدھر دیکھنا شروع کیا!
تمام دن ان کی چوں چوں جاری رہتی

جیسے ننھے بچوں کی بکواس۔

اور پھر ایک دن سب کی سب اڑ گئیں!

اس دن سے پھر میں نے انھیں بہت کم دیکھا،

ان کا گھونسلہ خالی پڑا ہی!

وہ اب کہیں اور اڑ گئی ہیں۔

کہیں اور یہاں سے بہت دور۔

آہ کاش میرے بھی پر ہوتے!

افناسی افناس یوچ فیت (۱۸۲۰-۱۸۹۲)

اس اصول کا کہ ”آرٹ کی غرض آرٹ ہے“ فیت سے زیادہ قابل

پارناسیوں میں بھی کوئی نہیں تھا، اسے روس کے سیاسی اور اقتصادی مسائل

سے بہت دلچسپی تھی اگرچہ وہ صرف قدامت پسند نہیں بلکہ جدتوں کا جانی دشمن

تھا اور اس نے ان مسائل پر متعدد مضامین لکھے لیکن اس نے اپنی شاعری

میں آرٹ کی پرستش کے سوا اور کسی غرض کو شامل نہیں ہونے دیا۔ ۱۸۵۵ء

کے بعد نقادوں کی عداوت نے اس کے کلام کی اشاعت روک دی اور

فیت نے اس زمانے کی نظموں کا مجموعہ ۱۸۵۵ء تک نہیں شائع کیا۔ اس

وقت ادب پر سے بسلغوں اور مصلحوں کا اثر جاتا رہا تھا۔

فیت کے کلام کی خاص صفت اس کے احساسات کی نزاکت ہے اس

میں تخیل کی کوئی خوبی نہرت یا گہرائی نہیں، صرف الفاظ اور ترنم کی پیدا

کی ہوئی ایک کیفیت ہوتی ہے جو جذبات میں گدگدی سی پیدا کرتی ہے۔ مجموعی

حیثیت سے نیت کے کلام میں یکرنگی محسوس ہوتی ہے، اس لیے کہ نازک احساسات کے سوا اس نے انسانی جذبات کے کسی اور پہلو کو اپنی شاعرانہ توجہ کے لائق نہیں سمجھا۔ ذیل کی نظم کافیت کے مخالفوں نے بہت مذاق اڑایا تھا، اس لیے کہ اس میں اول سے آخر تک کوئی فعل نہیں ہے۔

زیر آواز دہی سانسیں :

بلبل کے لہرے

دریا کی چاندی جیسی چمک،

اس کی جھومتی چال۔

رات کی دھیمی روشنی۔ دھندلی تاریکی کا سمندر۔

تاریکی کا بے پایاں سمندر

ایک محبوب چہرے کی بدلتی ہوئی کیفیتیں،

مسحور کن ادائیں

دھوئیں جیسے بادلوں میں کہیں ارغوانی رنگ

کہیں کہرِ باکی جھلک

پیار، پیار اور آنسو۔

اور آفتاب کا طلوع! ...

اسی انداز کی ایک اور نظم ملاحظہ ہو :

میں تجھے مبارکباد دینے آیا ہوں۔

یہ کہنے کہ سورج نکل آیا ہے۔

اور اس کی گرم، روشن کرنیں
 پتیوں پر کانپ رہی ہیں -
 یہ کہنے کہ جنگل جاگ اٹھا ہے،
 سارے کا سارا جاگ اٹھا ہے، اس کی ہر شاخ،
 ہر چڑیا چونک پڑی ہے،
 اور وہ بہار کی آرزوؤں سے بھرا ہے
 یہ کہنے کہ کل کی سی اسیدیں اور جوش لے کر
 میں پھر تیرے پاس آیا ہوں،
 میرا دل اسی طرح مسرت کا
 اور تیری خدمت کرنے کا آرزو مند ہے۔
 یہ کہنے کہ ہر طرف سے میرے پاس
 شادمانی کا پیغام آ رہا ہے،
 یہ کہنے کہ میرا دل نغمہ سرائی پر تڑپا ہوا ہے
 مگر معلوم نہیں میں گاؤں گا یا نہیں ...
 یا کوٹ پترو وچ پولون سکی (۱۹۷۹ء)

فیت اور مائی کوٹ کے مقابلہ میں پولون سکی کے مضامین کا میدان بہت
 وسیع ہوا اور اس کا تخیل عام زندگی سے بہت زیادہ وابستہ ہے، اس کے احساسات میں
 اتنی نزاکت نہیں کہ وہ معمولی انسان کی عقل اور سمجھ کو عاجز کر دیں۔ اس نے
 عوام کے طرز پر چند نظمیں لکھی ہیں جو ادبی نقطہ نظر سے قابلِ قدر تو نہیں ہیں

گمان میں کچھ ایسی سادگی ہو اور ان کی زبان اتنی سہل کہ وہ ایک زمانہ میں بچے بچے کو یاد ہو کر تھی تھیں اس کے کلام میں ظرافت بھی پائی جاتی ہو اور ساتھ ہی ایک فلسفہ حیات جو بہت گہرا نہیں ہو مگر اوسط درجے کے تعلیم یافتہ لوگ اس سے نہایت درجہ مرعوب ہوتے ہیں۔ پولونسکی روس کی سیاسی فرقہ بندیوں سے ہمیشہ الگ رہا اس لیے اسے نقادوں کی عداوت کا سامنا نہیں کرنا پڑا اور اس کے کلام کی اشاعت میں کوئی دشواری یا رکاوٹ نہیں ہوئی مگر اعلیٰ ادبی مذاق کے لوگوں میں اسے بہت کم قدر دان ٹھہریں۔ اُسے وہی لوگ پسند کرتے ہیں جن کی علمی بساط کم ہو اور جو شاعری کے ذریعہ سے اپنے جذبات اور خیالات میں ذرا سا میجان یا ہلکا سا سرور پیدا کرنا چاہتے ہیں پولونسکی کی سب سے مشہور نظم ”موسیقی کے شوقین ٹڈے“ کا قصہ ہے جو کسی بلبل کا گانا سن کر اس پر عاشق ہو گیا اور ملاقات کے شوق میں اُس کا دل ٹڑپنے لگا۔ بڑی ممتاؤں کے بعد آخر کار اُسے دیدار کا شرف حاصل ہوا لیکن بلبل اُسے دیکھتے ہی کھا گیا۔ اس نظم کے علاوہ پولونسکی نے ”پاراسی“ طرز کے مطابق مختصر نظمیں بھی لکھی ہیں جن میں سے بعض بعض ہر لحاظ سے بہت اچھی ہیں مگر یہ اعلیٰ نمونے اس کے کلام میں صرف گاہے گاہے نظر آتے ہیں۔ اس کی بہترین نظموں میں سے ایک کا ترجمہ دیا جاتا ہے۔

گزر رہا ہوا زمانہ

مجھے یاد ہیں وہ بچپن کے دن، جب ہمارے گالوں پر پھول کی سی سرخی تھی،
ہم تم بھر بھرے پرت پر کھیلے پھرتے تھے۔

اور سردی ایک بوڑھی عورت کی طرح اپنے ہاتھوں سے
 ہمیں پیار کرتی اور پھر اپنی بیابھی سے آگ کے پاس بھگا دیتی،
 شام کے اندھیرے میں تمھاری آنکھیں جھپکتی تھیں،
 آتش دان کی چنگاری تمھاری صورت دیکھا کرتی تھی،
 اور بوڑھی کھلائی ہمیں کہانیاں سناتی تھی،
 ایک بے وقوف کی جو کسی زمانہ میں تھا۔
 لیکن وہ جاڑا بہار کی طرح مسکراتا ہوا چل دیا،
 گرمیاں بھی گزر گئیں اور اب خزاں کے طوفان کا شور مچا کر
 ایک اور جاڑا آ رہا ہے، بالکل دوسری طرح کا،
 ایک بے حس جاڑا اور وہ بھی اپنی بیابھی سے ڈرا رہا ہے...

ہماری کھلائی پیر پھیلائے سو رہی ہے
 قبر میں آرام کر رہی ہے اور یہ بھی نہیں دیکھتی
 کہ تم تھک کر میرے سینے سے چھٹ گئی ہو،
 گویا سن رہی ہو کہ میرا دل کیا کہتا ہے۔
 لیکن کھلائی کی طرح میرا دل بھی آج پیار سے
 متاثر نہیں ہوتا، وہ چنگاری بجھ گئی ہے،
 اور میرا دل تمہیں کہانیاں سناتا رہا ہے
 ایک بے وقوف کی جو کسی زمانہ میں تھا۔

۱۸۵۵ء سے ۱۸۶۳ء کے سیاسی جوش کے رفتہ رفتہ ٹھنڈے ہونے کے ساتھ ہی روسی شاعری کا معیار گرتا گیا، اس میں نہ فن کی وہ خوبیاں رہیں نہ تخیل کی وہ بلند پروازیاں جو لٹکن، لیرمنٹوف اور چیوف کے کلام میں پائی جاتی ہیں۔ نکر اسوف نے مضامین میں بہت جدت پیدا کی اور اگر اسے اچھے پیرو ملتے تو ممکن ہے روسی شاعری کا باغ پھر سرسبز اور نشاۃ ہو جاتا اور اس میں نئے نئے پھول کھلتے۔ لیکن افسوس ہے ایسا نہ ہوا اور جب تک کہ صدی کے آخری سالوں میں استعاریت نے نئے باغبان نہیں پیدا کیے روسی شاعری کا باغ ویران ہوتا گیا۔ سم یون یا کو فے وچ نادسون (۱۸۶۲ء - ۱۸۹۷ء)، الک سے ئی نکولایے وچ اپونخ تن (۱۸۶۷ء - ۱۸۹۳ء)، کونس تان تن کونس تان تی نو وچ سلو چیف سکی (۱۸۶۷ء - ۱۸۹۲ء) اور ولا جیم سرگے پوچ سولوف یوف (۱۸۶۷ء - ۱۸۹۲ء) کی شاعری میں اس دور کے تمام ذہنی اور فنی نقائص نظر آتے ہیں۔ نادسون نے بہت شہرت حاصل کی اور غالباً اس کے کلام سے زیادہ اشاعت اور ہر دغیریزی اس دور کے کسی شاعر کو نصیب نہیں ہوئی، لیکن نقاد اسکی مقبولیت کو محض عام مذاق کی پسندی کی ایک علامت مانتے ہیں اور اگر غور سے دیکھا جائے تو نادسون کی شاعری میں لغاظی کے سوا کچھ نہیں اور اس کے خیالات بھی جو کچھ ہیں وہ ذہن اور تصور کی بیماری کی دلیل ہیں۔ اپونخ تن کے کلام میں پھر بھی زیادہ جان ہے، لیکن اس میں ایک دوسرے طریقے پر ظاہر ہوتا ہے کہ روسی قوم میں انحطاط کی کیفیت تھی۔ اپونخ تن کی نظمیں روس کے

جہی گوتوں کی زبانی بہت سننے میں آتی ہیں اور ان جہی گوتوں کا کام عموماً
 میخانوں میں لوگوں کو مست کرنا اور عیاشی میں چٹپٹا پن پیدا کرنا تھا۔ سلوین
 سکی اور سولوت یوف پر اس قسم کا کوئی الزام نہیں لگایا جاسکتا، لیکن ان
 دونوں میں فنی خامیاں بہت ہیں اور تخیل کی کوئی خاص خوبی نہیں پائی جاتی۔
 ان چاروں شاعروں کی یادگار بس اسی درجے سے قائم ہو کہ ان کے دور میں
 ان سے بہتر کوئی اور شاعر نہیں تھا، یہ ”کلاسیکی“ اور ”استعاری“ دوروں
 کی درمیانی کڑی ہیں۔

استعاریت اس عام فہنی میجان کا ایک پہلو اور اس کی ایک پیداوار
 تھی جو انیسویں صدی کے آخر میں نظر آتا ہو اور جس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی
 کہ مہذب اور منظم ہونے کے باوجود روسی قوم اپنی سیاسی اور سماجی زندگی
 میں جان نہیں بچونک سکی تھی۔ ہر طرف خانہ ساز خیالات کا غوغا تھا، ہر
 روشن خیال آدمی اپنا فلسفہ حیات بناتا، قومی اصلاح اور نئی زندگی کی تعمیر
 کی تدبیریں سوچتا، کلیسا، مذہب، حضرت عیسیٰ کی شخصیت، ریاست پرستی
 زار پرستی، قوم پرستی، یورپ پرستی ان سب کے معتقد اور مبلغ تھے، مگر سب
 یکساں ناکامیاب رہے اور وہم و گمان کے جال میں گرفتار ہو گئے۔ نیکولاسوف
 کے بعد سے ۱۹۱۷ء کے انقلاب تک شاعری کا عام سیاسی اور سماجی زندگی
 سے بس اتنا تعلق تھا کہ بعض نادسون جیسے شاعروں نے قومی خدمت کی
 امنگوں کو نظم کا جامہ پہنایا، لیکن یہ زمانہ ایسے انحطاط کا تھا کہ ان شاعروں
 کے کلام میں نہ سلاف دوستی کے اعلیٰ جذبے نظر آتے ہیں، نہ قومیت کے بلند

دولے۔ استعاریت کی تحریک روسی شاعری کو نئے اسالیب کے ذریعے سے دوبارہ زندہ کرنے کی کوشش تھی۔ اس کا سلسلہ نسب فرانسیسی شاعری کی ہم نام تحریک سے ملتا ہے، لیکن روسی استعاریت پسند شاعروں نے اپنے استادوں کی زیادہ پیروی نہیں کی اور دراصل ان سے سیکھا بھی بہت کم۔ امریکن شاعر ایڈگر ایلن پو (۱۸۰۹ء - ۱۸۸۹ء) اور جرمن فلسفی اور شاعر گوٹے کاؤن پر فرانسیسی استعاریت پسند شاعروں سے بہت زیادہ اثر تھا۔

فرانسیسی شاعر پو ویلیر (۱۸۲۱ - ۱۸۶۷ء) کا ایک مصرعہ جس میں کائنات ”استعاروں کا ایک جنگل“ بتائی گئی ہے اور جرمن شاعر گوٹے کا ایک شعر کہ ”سب فانی چیزیں محض مجازی نقوش ہیں“ استعاریت کے فلسفے کی بنیاد ہیں۔ استعارے اور مجازی نقوش جس حقیقت پر پردہ ڈالتے ہیں اس کی جستجو اور اس کے دیدار کا اشتیاق روسی استعاریت پسند شاعروں کا محرک ان کا ”جنون“ اور ”سوما“ تھا۔ انھوں نے اپنے فرانسیسی استادوں کی طرح اسے صرف ایک شاعرانہ انداز اور نظم میں جدت اور انوکھا پن پیدا کرنے کا ایک بہانہ نہیں بنایا بلکہ اسے ایک مکمل فلسفہ حیات کی صورت دیدی اور اس سے وہ روحانی غذا حاصل کرنے لگے جو ان کا مذہب اور کلیسا فراہم کرنے سے معذور تھا یوں گو استعاریت شروع میں ایک مغربی چیز تھی اور مغربی رنگ میں ڈوبی ہوئی تھی روس میں اس نے بہت جلد روسی بھیس اختیار کر لیا، اپنا نسب بھول گئی اور روس کے گزشتہ ذہنی رہبروں خصوصاً دستہ ثنہ سکی سے بہت گہرا رشتہ قائم کر لیا۔ اس رشتے کے قائم ہونے سے

روسی ادب کو سراسر فائدہ ہوا، انحطاط کے زمانہ میں روس کے ادبی مناسیر کی نظر سے جو فحلت برتی جاتی تھی اس کے بجائے انھیں سمجھنے کا ایک نیا شوق پیدا ہو گیا، ان کے فلسفہ پر غور کرنے کی ضرورت محسوس ہونے لگی اور جیسے کوئی گہری فنید سے چونک کر سونے سے پہلے کے واقعات یاد کرتا ہو اور انھیں اپنی زندگی کا ایک ضروری حصہ سمجھنے لگتا ہو، انحطاط کے بعد استعاریت بندی کے ذریعہ سے روسی ذہن نے بیدار ہو کر اپنی ذہنی جدوجہد کے نئے ہونے سلسلہ کو پھر جوڑ دیا وہ اپنی ذہنی دولت کو یوں بہت بڑھا دیا۔ اس کی سب سے روشن دلیل یہ ہے کہ روس کے استعاریت پسند شاعر آزاد خیال، بلند حوصلہ اپنے دلیں اور باطنی قوم کے پتے اور گہرے دوست اور خیر خواہ تھے یہ کیا تحریکوں میں ان میں سے کوئی شریک نہیں ہوا، لیکن ۵-۱۹ کے انقلاب میں انھوں نے دکھا دیا کہ وہ جابرانہ حکومت کے دشمن اور ہر تحریک کے حامی ہیں جس کا مقصد روس کی آزادی اور ہمدردی ہو۔

استعاریت پسند شاعروں کے کلام کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے جمالیات پر تصوف اور فلسفے کا رنگ چڑھانا چاہا اور اپنے جذبات کو نفسانیت اور مجاز پرستی سے بڑی حد تک پاک رکھا، عشق کو وہ ایک خالص روحانی کیفیت کی صورت میں پیش کرتے ہیں، جس کی پاکی اور صفائی پر انسان کے سرکش، نفس پرست جذبات دھتے لگاتے رہتے ہیں، جن ان کی نظروں میں ایک جلوہ ہے جس کے دیدار سے انسان محروم رہتا ہے، کیونکہ وہ ہوس اور شہوت کا بندہ ہے۔ لیکن یہ شاعر مذہبیت کے یا تو قائل نہیں یا اسے

مآشنا ہیں اور ان کی روحانیت کو تصوف کا ہم معنی نہ سمجھنا چاہیے۔ کائنات دنیا اور دنیاوی زندگی استعارے ہیں، حقیقت نہیں، ”استعاروں کے جھگل میں“ بھٹکتے پھرنا انسان کے شایانِ شان نہیں، بس اسی کو جتا کر استعاریت کا فلسفہ ختم ہو جاتا ہے۔ باقی جو کچھ ہے وہ انسان کی گمراہی پر آدمی تمناؤں کی بیکیسی کا گلہ ہے اور سرد آہیں اور آنسو۔ نادسون اور اپو ح تن کے بعد شعر و شاعری کا ایسا موضوع اختیار کرنا بہت قابلِ قدرِ جدت تھی اور اس کے ساتھ ہی استعاریت پسند شاعروں نے اپنے کلام کو فنی حیثیت سے بھی اس درجہ کمال تک پہنچایا جو لشکن کے عہد کے سواروسی شاعری کو کبھی نہیں نصیب ہوا تھا۔ یہ خاص طور سے تعریف کی بات ہے، کیونکہ ان شاعروں نے نئے مفہم نئے طرز پر ادا کئے، اور ایسے ادبی انقلابوں کے ہر ادولوں میں عموماً فنی خیال اس کثرت سے ہوتی ہیں کہ اہل ذوق کو ان کی جدتیں تسلیم کرنے میں بہت تاثر ہوتا ہے۔

استعاریت پسند شاعروں کی تیسری خصوصیت ان کی زبان اور الفاظ کا انوکھا استعمال ہے۔ وہ زبان کو محض خیالات ادا کرنے کا آلہ نہیں سمجھتے بلکہ کیفیات اور فضا پیدا کرنے کا ذریعہ بھی اور یوں وہ الفاظ کے معنی سے زیادہ ان کی آواز کی تاثیر کو توجہ کے لاینِ فرض کرتے ہیں بحر اور قافیہ و لفظ کے ارکان کی اوپنچ نیچ سے وہی کام نکالنا چاہتے ہیں جو گویئے سروں سے۔ زبان اور الفاظ بھی ان کے نزدیک استعارے ہیں جن کے توسط سے جذبات کی حقیقت ظاہر ہوتی ہے اور چونکہ جذبات کا تعلق صرف انسان کے

ذہن سے نہیں بلکہ اس کی ہستی سے ہے، اس لیے وہ جذبات کے ادا کرنے
 میں شاعر کے لیے ایسا طرز اختیار کرنا لازم قرار دیتے ہیں جس میں تصویروں
 کے رنگ ہوں اور موسیقی کے سُور اور ناپچ کے بھاؤ۔ ظاہر ہے یہ معیار کس قدر
 بلند اور مشکل ہے اور کوئی تعجب نہیں استعاریت پسند شاعروں کے کلام
 کا اکثر حصہ اس معیار پر پورا نہیں اُترتا، کبھی آواز کی تاثیر پیدا کرنے کی
 کوشش میں معنی خبط ہو جاتے ہیں کبھی کیفیت اور فضا کے چکر میں شاعر اپنے
 مطلب اور مقصد کو بھول جاتا ہے۔ پڑھنے والے کو بھی اپنا فرض ادا کرنے میں
 بہت دشواریاں ہوتی ہیں اور اگر استعاریت کے قدر دانوں میں ہلکے سرور
 اور ذرا ذرا سی گدگد می کا خاص شوق نہ ہوتا، اگر وہ نظم میں معنی اور مطلب
 اور فلسفے کی جگہ آوازوں کی خوش گوار گونج اور اس کیفیت کے جو موسیقی
 کے سُوروں سے چھا جاتی ہے خواہش مند نہ ہوتے، تو ممکن ہے استعاریت ہر لغز
 اور شہرت سے محروم رہتی۔ لیکن استعاریت پسند شاعروں کے ہنران کے
 عیبوں کو نظر سے چھپا دیتے ہیں۔ ان کے کلام کے اعلیٰ نمونوں سے ظاہر ہوتا
 ہے کہ ان کا تخیل صرف بلند اور پاک نہیں، وہ اپنی زبان کے سب جوہر
 پہچانتے ہیں، اس کے ہر رنگ سے واقف ہیں اور اس پر اتنی قدرت
 رکھتے ہیں کہ نازک سے نازک احساس اور نادر سے نادر کیفیت انتہائی سہولت
 اور صفائی سے بیان کر سکیں، الفاظ کی جا پخ پر تال اور انتخاب میں وہ
 ویسے ہی ماہر ہیں جیسے موفروش شرابوں کا مزہ پہچانتے، یا جہری نگینوں
 کے پرکھنے، یا سچا گویا اپنے راگ کو اور گیت کو خارجی فضا سے موزوں کرنے

میں۔ اپنے علم و ہنر کا کمال دکھانا بھی انھیں خوب آتا ہو۔

استعاریت کا بیش خمہ دلاجمیر سولوفیوٹ اور دمیتری میرزکوف سکی کا کلام تھا، لیکن اپنی اصل صورت میں وہ اس مجموعے میں نظر آئی جو ۱۸۹۲ء میں بال مونت (رپیدالیں ۱۸۹۲ء) اور بریوسوٹ (۱۸۹۲ء) نے "روسی استعاریت پسند" کے عنوان سے شایع کیا۔ اسی کے ساتھ ہی بال مونت نے اپنے کلام کا ایک مجموعہ بھی ناظرین کے سامنے پیش کیا۔ روسی نقاد ان جہتوں کو تسلیم کرنے پر نہیں تیار تھے جو ان نظموں میں اختیار کی گئی تھیں اور استعاریت پسندوں پر اعتراضوں اور تنقید کی بوجھار ہونے لگی۔ مگر وہ ہمت نہیں ہارے اور بیسویں صدی کے شروع تک وہ روسی مذاق پر حاوی ہو چکے تھے۔ ۱۸۹۲ء کے انقلاب نے انھیں ہر طبقے میں ہر دلعزیز بنادیا اور اس کے بعد سے دس سال تک میدانِ سخن میں انھیں کارج رہا۔ ان میں سے اکثر کو ۱۹۱۷ء کے انقلاب کا منظر دیکھنا بھی نصیب ہوا اور جس صدق دل اور خلوص اور جوش سے انھوں نے اُس نئی زندگی کا استقبال کیا جس کی امید انھیں انقلاب کے بھونچال اور زلزلے دلا رہے تھے، وہ ان کی بیدار دلی، قوم پرستی اور قوم کے مستقبل میں شاعرانہ عقیدیت کو بہت بہت آموز بنادیتی ہو اور ان کے کلام کی وقعت ہماری نظروں میں اور بھی بڑھا دیتی ہو۔

بال مونت اور بریوسوٹ کے کلام پر مغربی، یعنی فرانسیسی اور انگریزی اثرات غالب ہیں اور ان کی زبان میں نہ وہ فصاحت ہے اور نہ وہ ترنم جو

استعاریت پسند شاعروں کا معیار تھا۔ بال مونٹ فطرتاً شاعر تھا، مگر اس نے زبان کی طرف کوئی توجہ نہیں کی، بریوسوف نے محنت اور مشق سے زبان میں پختگی اور لوح پیدا کر لی لیکن اس کے کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا ذہن اور تخیل ایک سچے اور اعلیٰ شاعر کا نہیں تھا۔ بال مونٹ کے عروج کا زمانہ انیسویں صدی کے آخری سال تھے اور گو اس کے بعد بھی وہ ہر سال اپنی نظموں کے مجموعے شائع کرتا رہا، اس کا بعد کا کلام بالکل بے رس ہے۔ ۱۹۱۷ء میں اس نے پولشوک انقلاب کو تسلیم کرنے سے انکار کیا اور فرانس میں جا بسا۔ بریوسوف کو شہرت ۱۹۰۵ء کے انقلاب میں حاصل ہوئی، جب اس نے اپنی نظموں کا ایک مجموعہ جس کا عنوان ”سے فانوس“ تھا شائع کیا، اسے سیاسی معاملات سے کوئی گہری دلچسپی نہیں تھی، صرف اس کا شاعرانہ خیال تھا کہ

در مرکز حسن ہر مشرقی بادشاہ اسار ہرون کی قوت اور شان کا
جلوہ و عجب دار ہر وہ منظر جب ایک بچہری قوم کا غصہ بادشاہ
کے لڑکھڑاتے تخت پر طوفانی موجوں کی طرح تھپیڑیں مارتا
ہو، مگر قابل نفرت ہیں درمیانی کیفیتیں“

طوفان کے شوق نے بریوسوف کو ۱۹۱۷ء کے انقلاب کا بھی ہمدرد بنا دیا، لیکن اس کے کلام سے یہ نہیں ظاہر ہوتا کہ اسے روس یا اشتراکیت سے واقعی کوئی روحانی تعلق تھا۔ آخر عمر میں اس کی سب سے قابل قدر خدمت تھی ”مزدور“ شاعروں کو اپنے فن میں تعلیم دینا، جس کا وہ شعر

کہتے سے زیادہ اہل تھا۔

بال مونٹ کی ایک نظم جس کا موضوع ڈاکٹر اقبال کی ”تنہائی“ سے
بہت ملتا جلتا ہے ترجمہ کی جاتی ہے:
میں نے آزاد ہوا سے پوچھا:

کہ جوانی کا راز کیا ہے؟

ہوانے کھیلنے کھیلنے جواب دیا:

”قید صورت سے نجات حاصل کرنا، جیسے ہوا اور دھواں“

میں نے صاحبِ حمث سمندر سے پوچھا:

کہ زندگی کا سب سے اعلیٰ مقصد کیا ہے؟

سمندر نے اپنے راگوں میں جواب دیا:

”ہمیشہ میری طرح محو فریاد رہنا!“

میں نے آسمان کے بادشاہ، آفتاب سے پوچھا:

کہ وہ چمک کیسے حاصل ہوگی جو صبح کو شرمندہ کرے؟

آفتاب نے کوئی جواب نہیں دیا،

مگر میرے دل میں کہیں سے آواز آئی: ”جلنے سے!“

بال مونٹ اور بریوسوٹ ہراول تھے، جو استعاریت پسندانہ شاعروں

بعد میدان میں آئے انھوں نے استعارہ شاعری سے بڑی حد تک وہ

فنی خامیاں دور کر دیں جو ان دونوں کے کلام میں پائی جاتی ہیں، استعارہ

کو مغرب کی رہنمائی سے بے نیاز کر کے اسے ایک خالص روسی تحریک

بنادیا، الفاظ اور طرز بیان خود ایک معیار ہونے کے بجائے شاعر کے فلسفہ حیات اور نظم کے موضوع کے ماتحت کر دیے گئے، گو ان کی استعارہ بہت صرف قائم نہیں رہی بلکہ اور پڑھ گئی۔ اداں کو یقین سکوی (شاعر) ایک بہت ہو نہا شاعر جو عین جوانی میں ڈوب کر مر گیا، ایک ساندھینا کو وچ دو بر ویو پوف (پیدائش) ایک بہت ہی منگی اور مرقی آدمی اور لاپتہ پھر کرتا ہی اور اب معلوم نہیں زندہ ہی یا نہیں اور ہو تو کہاں ہو۔ مرث کوٹ سکی کی بیوی، زنی داکو لافنا ہی دوس (پیدائش) یہ تینوں استعارے پسندوں میں فلسفیانہ طرز کے شاعر مانے جاتے ہیں اور ان کے کلام میں کائنات اور انسانی زندگی کے معنی حل کرنے کی ایک بہت گرم آواز پائی جاتی ہے۔ نوکتی فیو ڈور وچ آسن سکی (شاعر) کے کلام میں استعاریت کا انداز خاص شاعرانہ ہے، لیکن اس منظر میں وہی مسائل ہیں جن پر فلسفیانہ رجحان کے استعارے پسند محور رہتے ہیں۔ ناول نویس فیو ڈور سولوگب (پیدائش) نے اپنا ایک جمالیات اور اخلاق کا انوکھا فلسفہ گھڑا ہے، لیکن ذیل کی نظم سے معلوم ہوتا ہے کہ اس فلسفہ میں بھی وہ گہرے خیالات رکھتا ہے اور انھیں ادا بھی خوب کرتا ہے:

اس سے محبت کیوں کر، دنیا تری محبت کی

سزاوار نہیں۔

اس کے اوپر سے گزر جا، شہاب ثاقب کی طرح

تیزی سے۔

اس کی سر دفن میں ایک لمحہ کے لیے
 چمک اٹھ۔۔۔
 ایک دم بھرا ایمان و عقیدت کی مشعل بن
 اور گل ہو جا۔

دیباچہ (اولاد) (ایڈیٹرز) اور ایک سائڈ بک (۱۹۹۷ء)
 (۱۹۹۷ء) استعاریت پسند شاعروں کے سر تاج مانے جاتے ہیں اور انہیں
 کے کلام میں استعاریت اپنی پوری شان میں نظر آتی ہے اور ان کے پیڑ پر گستا
 خانیہ بلوک ماسکو کے گروہ کا سر دار تھا اور وہ اولاد اپنے طرز میں لکھتا ہے۔
 اولاد (۱۹۹۷ء) استعاریت پسند شاعروں کی نظر کا پہلا مجموعہ شائع کیا۔ گو اس کا
 کلام (۱۹۹۷ء) استعاریت پسندوں کے عام طرز سے بہت مختلف تھا، لیکن ان لوگوں
 نے اس کی شاعری کی عظمت اور اس میں استعاریت کا خاص رنگ اچھوس
 کیا اور اولاد کو اپنے حلقے میں شامل کر لیا۔ اولاد کی شخصیت ایسی
 قوی تھی، اس کے علم کا سرمایہ ایسا زبردست کہ وہ بہت جلد بے پروا ہو
 ہو گیا اور (۱۹۹۷ء) (۱۹۹۷ء) (۱۹۹۷ء) کے شاعروں کا بے ناچ کا
 بادشاہ رہا۔ اس کا مکان شاعروں کا مرجع تھا اور ہر بدھ کی رات کو وہاں
 مجلسیں ہوا کرتی تھیں جس میں آگے دوسرے دن تک نظمیں سننے اور
 سناتے، بالخصوص اولاد کے مسائل پر بحث مباحثہ کیا کرتے تھے۔
 (۱۹۹۷ء) میں کسی وجہ سے ان دوستوں میں جو یہاں جمع ہوا کرتے تھے،
 پھوٹ پڑ گئی، اولاد روس چھوڑ کر یورپ چلا گیا اور جب واپس ہوا

توپیر برگ کے بجائے ماسکوں میں سکونت اختیار کی بولشویک انقلاب کے وقت اس نے وہ جوش نہیں دکھایا جو ۱۹۱۷ء کے انقلاب میں، مگر پھر بھی وہ بولشویکوں کا حامی تھا اور اس نے خانہ جنگی کے زمانے کی (۱۹۱۷ء تا ۱۹۲۱ء) ساری مصیبتیں خاموشی سے برداشت کیں۔ ۱۹۲۱ء میں وہ آذربائیجان کے نئے قائم کردہ دارالعلوم میں قدیم یونانی زبان اور ادب کا پروفیسر مقرر ہوا اور وہاں تین سال کام کیا، ماسکو واپس ہونے پر بھی اس کے تعلقات بولشویک حکام سے بہت اچھے رہے۔

ادانوف نے ”دل سوزاں“ کے عنوان سے اپنی نظموں کا دوسرا مجموعہ ۱۹۱۷ء میں شایع کیا اور یہ اس کے کلام کا عروج تھا۔ چارٹے کے گیت جو اس نے ۱۹۲۱ء میں شایع کیے، صرف اس کے ادبی ذوق کی شدت نہیں دکھاتے، بلکہ اس کے کلام کا ایک دوسرا رنگ بھی جو چند لحاظ سے ”دل سوزاں“ کے جواہر ریزوں سے بھی بہتر ہے۔ اسی سال کا ایک اور کارنامہ ”دوگوٹوں کے درمیان خط و کتابت“ ہے جس میں ادانوف اور اس کے دوست گرشن زون کی اس زمانے کی گفتگو ہے جب دونوں ہسپتال میں بیمار پڑے تھے، یہ کمرے کے ایک گوشے میں، وہ دوسرے میں گرشن زون کی آرزو ہے کہ دنیا سے گزشتہ زندگی کے تمام آثار مٹ جائیں اور ایک نیا انسان ”تنگا“ آزاد، زندگی کی تعمیر نئے سرے سے شروع کرے۔ ادانوف انسان کی حاصل کردہ تہذیبی اور اخلاقی دولت کو محفوظ رکھنے کا قائل ہے اور انسان کی گزشتہ ذہنی جدوجہد کی بہت محبت، عقیدت

اور جوش سے حمایت کرتا ہے ایسی صورت میں جب دن کو بھوک ستاتی ہو اور رات کو جاڑا، نظمیں لکھنا اور تمدن اور تہذیب کے گن گانا انتہائی شوق اور محویت کی دلیل ہو اور اوانوف کے لیے یہ اسی وجہ سے ممکن ہوا کہ وہ ساری عمر علم اور ادب میں ڈوبا رہے۔ اسے قدیم یونانی ادب سے بہت گہرا روحانی تعلق تھا اور اس نے جدید روسی ذہنیت پر قدیم یونانی فلسفے اور احساسات کی قلم جس صفائی اور کامیابی سے لگائی وہ واقعی حیرت انگیز ہے۔ اپنی نظموں میں اس نے اکثر یونانی محاورے استعمال کر کے ایک عجیب شوکت پیدا کر دی، اپنی مذہبیت کے مایوس چہرے میں قدیم یونانی رند مشربی کے پریشان بال اس طرح کھپائے کہ ایک ہی صورت معلوم ہوتی ہو، اور وہ بھی حسن اور ادا کا کرشمہ۔ اس کی نظمیں بہت مشکل ہیں، اس کے خیالات کی باریکیاں پورے طور سے سمجھنے کے لیے یونانی اور روسی ادب اور مذہب اور فلسفہ حیات سے گہری واقفیت درکار ہے، لیکن جو یہ استعداد نہیں رکھتے وہ اس کی زبان کے ترنم اور شیرینی کی لذت اٹھا سکتے ہیں اور اس کی ان کیفیتوں سے جن میں علمی اور تہذیبی نکتہ سنجی نہیں اور جو دراصل اس کے کلام کا بہترین حصہ ہیں اس شراب کا مزہ چکھ سکتے ہیں جس کے نشے میں شاعر خود چور رہتا تھا۔ اوانوف کا کلام کچھ اس وجہ سے بھی مشکل معلوم ہوتا ہے کہ اس میں معاصر روسی ذہنیت کا تقاضا کہ ہر شاعر اور ادیب کا اپنا فلسفہ بھی ہونا چاہیے پورا کیا گیا ہے اور چونکہ شاعر کی طبیعت وہ پابندیاں نہیں منظور کر سکتی جو کسی خاص نظام فلسفہ

یا مذہبی عقیدے کے مبلغوں پر لازم ہے، اس لیے اس کوشش سے اس کے کلام میں خواہ مخواہ الجھاؤ اور پیچیدگی پیدا ہو جاتی ہے۔

ادانوف نے ۱۹۰۵ء کے انقلاب میں دستہ نفع سکی کے مشہور گیر کر
 اوان کرمازوف کے طرز پر انگار اور بغاوت کا فلسفہ اختیار کیا اور اس کی
 تعلیم دی کہ انسان کو تمام خارجی پابندیوں اور کاوٹوں سے آزاد کرنا
 چاہیے۔ اس تصور کا نام اس نے ”فلسفیانہ نزاج“ رکھا تھا، انقلاب کی
 تحریک دب جانے کے بعد ”فلسفیانہ نزاج“ سے ادانوف کو زیادہ عقیدت
 نہیں رہی اور پیتر برگ کے استعاریت پسندوں کی رہبری کے زمانے میں
 اس نے ایک نیا فلسفہ اس بنا پر تعمیر کیا کہ آرٹ بھی ایک قسم کا مذہب اور
 تصوف ہے اور اس کا معیار مذہبی اور فلسفیانہ ہونا چاہیے۔ لیکن اس حالت
 میں جب کہ مذہب اور تصوف خود تعریف اور تعین کے محتاج ہوں اس
 قسم کے عقیدے بالکل بے معنی ہیں اور یہ نہ ادانوف کے ذہن میں کوئی
 مستقل صورت اختیار کر سکے نہ اس کے چیلوں کے ذہن میں۔ ادانوف
 کے کلام میں جو شخصیت ظاہر ہوتی ہے وہ آزاد ہے، نکتہ چیں ہے، کبھی کبھی شاکہ
 بھی ہو جاتی ہے، اپنے احساسات اس ستائش اور شوکت سے ادا کرتی ہے کہ
 معلوم ہوتا ہے اسے مذہب اور تصوف کی سرپرستی بالکل درکار نہیں اور
 اس کے غموں میں ایک سرور ہے جس کی تاثیر میں عقیدے کی موافقت اور
 مخالفت سے کوئی فرق نہیں پڑ سکتا۔

ادانوف کی نظموں کا ترجمہ کرنا دراصل ان کی توہین کرنا ہے کیونکہ

زبان کا ترنم اور الفاظ کے انتخاب کی باریکیاں جو اس کی نظموں کا خاص
زیور ہیں ترجمے میں کسی طرح ظاہر نہیں ہو سکتیں اور اس کے خیالات اگر
ان خاص الفاظ سے الگ کر دیے جائیں جن سے آراستہ کر کے ادانوف نے انہیں
پیش کیا ہے تو ان کی صورت بگڑ جاتی ہے۔ تاہم ایک دو نظموں کا ترجمہ
دیا جاتا ہے۔

یونانی عشق کے دیوتا ایروس کی شان میں ایک گیت ہے جس کے
آخر میں شاعر کہتا ہے۔

تیرے تیر کا زخم کھاتے ہی
میں تیری تیر اندازی کا محرم راز بن گیا۔
تیرا شاگرد بننے سے معلوم ہوا
کہ جدائی ایک بیش بہا دولت ہے،
موت عشق کی ضمانت ہے
موت عشق کا ہم زاد ہے۔

اُس روح کے لیے جو دنیا میں پھنسی ہوا،
موت اور عشق ایک ہی انجام کے
دو نام ہیں، پکارنے کے دو طریقے۔
”جاڑے کے گیتوں“ کی ایک شکایت سنیے:-

میرے دیران راستوں کے غیبی رہبر!
تو مدتوں سے میری آزمائش کر رہا ہے۔

اعراف کے ان گہرے قعروں میں، جہاں داخل ہونے کو
ہم اس دنیا میں پیدائش کہتے ہیں۔
میری عزت چھن گئی اور مجھے ملا کیا؟
اوروں کے ساتھ ایک کال کوٹھری میں بند رہنا،

جب تک کہ میں ان چیزوں سے جو میرے دل کو نہیں بھائیں
راضی نہ ہو جاؤں، ایک بوسہ دے کر دل کا غبار دور نہ کر دوں۔
میں نے سنگ دل، بے لطف جاڑوں کی صحبت سے گریز کیا،
اور عیاسنوں کی طرح ان دلیوں میں جا کر جہاں جاڑے کی پہنچ نہیں
مناظر فطرت کو محبوب بنایا اور رنگ رلیاں مناتا رہا۔
لیکن میرے آقا اور استاد نے خفا ہو کر حکم دے دیا

کہ تاریکی کے بادل میری دنیا ہوں، برف کے ڈھیر میری قبر
اور برف کے طوفان میری نجات کے لیے گیت گائیں دعائیں مانگیں۔
استعاریت کے خاص طرز اور روسی کلاسیکی، رومانی اور حقیقت نگار
شاعری کے اسالیب کی بہترین آمیزش الکساندر بلوک کے کلام میں پائی
جاتی ہے۔ شروع میں اس پر سو لوفیوٹ کے فلسفے اور زینئی دامپیئس کے
طرز کا اثر تھا اور اس کے پہلے مجموعہ کلام (سلسلہ ۷) میں یہ ظاہر بھی ہوتا
ہے۔ پنٹیمیں ایک ”خوبصورت خاتون“ کی شان میں تھیں اور یہ معلوم کرنا
دشوار نہیں کہ یہ ”خوبصورت خاتون“ کو مئی انسان نہیں ہے بلکہ عقل کامل
کا وہ مجسمہ جسے بعض یونانی فلسفی ”صوفیا“ کہتے تھے اور جس کا ذکر سو لوفیوٹ

کی نظموں میں آتا ہوں۔ لیکن ”خوبصورت خاتون“ کی ذات و صفات اور نظم کی ساخت اگرچہ بلوک کی اپنی ایجاد نہیں، پھر بھی اس پر سرتے کا الزام نہیں لگایا جاسکتا اور اس کی ان نظموں میں بہت سی خوبیاں ہیں جو اس کی اپنی طبیعت کی پیدا کی ہوئی ہیں۔ اس مجموعہ نے شاعری کے عام قدردانوں میں تو بلوک کو مشہور نہیں کیا، کیونکہ اس کے کلام کا استعاریت کے خاص تخیل سے بہت تعلق تھا اور جو بلوک کے خیالات سے واقف نہ تھے انہیں ان نظموں کے سُرِیے الفاظ کے سوا اور کسی چیز سے لطف نہیں حاصل ہو سکتا تھا لیکن خود شاعروں کے حلقوں میں بلوک اور اس کا کلام ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ ۱۹۱۹ء کے انقلاب میں بلوک کا خون بھی اُبل اُٹھا، وہ نظموں میں ”فلسفیانہ نزاج“ کی تعلیم دینے لگا، اور ایک موقع پر اس نے سُرِخ جھنڈا لے کر ٹرکوں کا گشت بھی لگایا۔ یہ جوش چند روزہ تھا۔ انقلابیوں کی ناکامی نے بلوک کو بہت مایوس کر دیا اور وہ صرف ”فلسفیانہ نزاج“ کے عقیدے نہیں بھول گیا بلکہ اپنی ”خوبصورت خاتون“ کو بھی اور ۱۹۱۹ء میں اس کے کا جو مجموعہ شایع ہوا اس میں ان دونوں کا پتہ نہیں ملتا۔ بلوک نے فلک پیمائی کے حوصلے چھوڑ کر دنیا کی طرف رُخ کیا، شاعرانہ طبیعت کے نازک احساسات ترک کر کے دنیا اور زندگی کی حالتوں اور کیفیتوں کو اپنا موضوع بنایا۔

”خوبصورت خاتون“ کی بجائے اب ایک ”اجنبی عورت“ کا تصور اس کے ذہن پر حاوی ہو گیا، ایک انجان ہستی جو ”خوبصورت خاتون“ کی طرح آسمان کی رہنے والی اور ستاروں کی ہیلی نہیں ہے بلکہ ایک لڑکی جو طرح طرح کے

بھیس بنا کر دنیا کا تماشا دیکھنے جرتی ہے اور اکثر ایسے مقامات پر نظر آتی ہے جہاں شرابی اور عواش جمع ہوتے ہیں۔ کبھی شاعر اسے دوسری سے دیکھتا ہوا فٹ پتھر شراب دل کے گوشہ گوشہ میں سرایت کر جاتی ہے، کبھی مٹل بھیڑ ہو جاتی ہے اور شاعر کو اس کے چہرے پر اس کے مزاج کی عجیب عجیب کیفیتیں اس کے دل کے راز اس کی آرزوئیں اور تمناؤں نظر آتی ہیں۔ لیکن گو "اجنبی عورت" کی کیفیتیں روشن ہیں، شاعر اپنی امنگیں اور خواہشیں نہیں سمجھتا کہ کیا ہیں۔

”میں“ اپنے نصیب کے ستارے کے چمکنے سے مست ہواؤں میں گھولے۔

شراب نے اور صبح کی رونق اور دیدار نے

مجھے بے زبان کر دیا ہے، تڑپا دیا ہے،

مجھے امید اب کس بات کی ہے، انتظار کا ہے کاہ

”نو بصورت خاتون“ اور ”اجنبی عورت“ دونوں کے عشق سے بزرگ

اپنے دل کو تسکین نہیں پہنچا سکا، اس کا جذبہ نہایت پاک تھا اور شوق بے انتہا

لیکن یہ استعارے اصلیت کی شکل نہیں اختیار کر سکے اور بلوک ان میں جان

ڈالنے کی کوشش سے اکتا گیا۔ آخر میں روس، اس کا دل، وہ سرزمین جس

کی گود میں اس کی شخصیت پلے تھی، جس کی مصیبتوں نے اس کا دل دکھایا تھا

جس کی فضا نے اسے فاسیجی سکھائی تھی، اس کی معشوقہ بن گئی۔ نظموں کا تکرار

مجموعہ جس میں بلوک کے فلسفے کا یہ رخ نظر آتا ہے، ہر صورت سے اس کے کلام

کا بہترین حصہ ہے۔ وہ مایوسی جو اس سے پہلے کی نظموں میں محسوس ہوتی ہے،

لے روسی زبان میں رہیں مرنے لے۔

اب حد سے گزر جاتی ہو، مگر اس کے ساتھ ہی بلوک کو روس کے مستقبل کا خیال
 کر کے کچھ روحانی سہارا بھی مل جاتا ہو اور اس کی مایوسی محض ایک ذاتی نسبت
 ہو جاتی ہو، کل کائنات پر چھائی ہوئی نہیں رہتی۔ اس مہوئے کی انماوت
 کے ایک سال بعد ہی پولشوک انقلاب نے روسی زندگی کی کایا پلٹ دی اور
 گو بلوک کو سیاسی معاملات سے کوئی دلچسپی نہیں تھی، وہ پولشویکوں کے ساتھ
 شریک ہو گیا اور اپنی شاعرانہ امیدوں کو ان کی کوششوں سے وابستہ کر دیا۔
 اس کی دو لہریں اور بہت سی مختلف نظمیں جو انقلاب کے دوران میں لکھی گئیں
 ان امیدوں کا رنگ دکھاتی ہیں لیکن اپنی نسبت اس کا وہی خیال رہا، اپنی
 ذات کی طرف سے وہی مایوسی جو ۱۹۱۷ء کی ایک نظم سے ظاہر ہوتی ہو:

اور اگر ہمارے بستر مرگ پر
 جیل کوٹے چلائیں اور منڈلائیں تو پروا نہیں۔
 تو ان کو جو ہم سے زیادہ سزا وار ہیں،
 اے خدا اپنے جلوے کے دیدار سے سرفراز کر!
 بلوک کے پہلے طرز کی دو نظمیں ملاحظہ ہوں؛
 مجھے مت بلا، میں بن بلائے
 تیرے حرم میں پہنچ جاؤں گا۔
 خاموشی سے تیرے پیروں پر
 سر کیڑھکا دوں گا،
 تیرے احکام سنوں گا،

چُپ چاپ انتظار کروں گا۔

دیدار کے لمحے کے مزے لے کر

پھر اسی آرزو میں محو ہو جاؤں گا:

تیرے جذبات کی شدت

میرے گلے کا طوق ہوگی۔

کبھی خادم بنوں گا، کبھی محبوب

اور ہمیشہ غلام رہوں گا،

شاعر کے دل کی ایک خاص کیفیت کا بیان مینے۔

شام کو جب زمین کھرے کی نقاب ڈال لیتی ہے

تو بھوسچال اور شعلوں سے گھرا ہوا

ایک فرشتہ قرآن کے صفحوں سے نکل کر

میری ہر وہ روح میں داخل ہو جاتا ہے۔

دماغ کمزور اور تھکا ماندہ ہوتا ہے،

روح اُڑتی چلی جاتی ہے...

ہر طرف بے شمار پروں کی پُھر پُھر اہٹ ہوتی ہے،

کانوں میں ایک پُرا سرار گیت کی صدا گونجتی ہے۔

تیسرے دور میں بلوک کی ذہنیت پر مایوسی کا غلبہ تھا۔ ایک مختصر نظم میں وہ

اسے اپنے خاص طرز میں ظاہر کرتا ہے:

عینش و طرب کی مجلس کا لطف اٹھا کر

میں رات کو بہت دیر سے گھر واپس آیا۔
 رات کا اندھیرا میرے کمرے میں منڈلا رہا تھا،
 میرے گوشہٴ عافیت کی حفاظت کرنے کو...
 صرف میرا شیطان دم بھر بھی چین نہیں لیتا۔
 وہ مجھ سے کہتا ہی: دیکھ یہ تیرا جھوپڑا ہی،

اب اس وقت کی کیفیت، اس وقت کی بیہودگیاں بھول جا
 اور پارساؤں کا سامنہ بنا کر اپنے گیتوں میں گزشتہ زمانے کی جھوٹی تعریف کر۔
 اس دور کی بہترین نظمیں وہ ہیں جن میں بلوک نے اپنے کو مخاطب کیا ہی،
 مگر افسوس ہی طوالت کے اندیشہ سے یہاں ان کے ترجمے دینا ممکن نہیں بلوک
 کی استعاریت پر آخری دور میں حقیقت نگاری کا جو رنگ چڑھ گیا اس کی
 بہت اچھی مثال ایک نظم میں ملتی ہے جس میں ایک فوج کا ریل پر سوار ہو کر پیرنگ
 سے میدانِ جنگ کے لیے روانہ ہونا بیان کیا گیا ہے:

اس ریل گاڑی کے مسافروں میں جدائی کے درد، محبت کی بے چینیوں
 قوت، جوانی، امید کے ہزاروں پھول کھلے ہوئے تھے...
 اور دور مغرب کی طرف

دھویں جیسے بادل خون میں ڈوبے ہوئے تھے۔

موت کا یہ شگون اور بھی واضح کر دیا جاتا ہے۔

گاڑی اسٹیشن سے نکل گئی

اندھیرے میں آخری ڈبے چپک گئے۔

اور خاموشی نے صبح تک کے لیے ڈیرے ڈال دیئے؛
لیکن بارش سے گیلے میدانوں سے ”ہووا“ کی آواز آتی رہتی
جس کی ہولناک صدائے بازگشت تھی ”آگیا، وقت آگیا“

سلامت کے بعد استعاریت کا زور کم پڑ گیا۔ اگرچہ بلوک اور ویاچسلاف
ادانوف، اس کے دو عظیم انسان نمائندے زندہ تھے اور ان کا کلام بہت
مرغوب بھی تھا؛ اس سال سے ایک نئی تحریک شروع ہوئی جو ”شاعری
پیشہ برادری“ کے نام سے مشہور ہوئی اور جس کا بانی نکولائی سینپا نوویچ گومی
لیوف تھا۔ شاعری کے اس نئے معیار کے مطابق دنیا اور زندگی کو استعارہ
سمجھنا غلط تھا، اور شاعر کا فلسفہ حیات ایک حقیقت نگاری قرار دی گئی جو
پھل کو پھول کہے اور خوبصورت سمجھے، مگر اپنے احساسات کے بیان میں
وہ تازگی پیدا کرے؛ اپنی نظر میں وہ سادگی جو اس انسان کی خصوصیات تھیں
جس نے پہلے پہل دنیا میں وارد ہو کر دنیا کو دیکھا اور اس پر تعجب کیا اس
نئے معیار نے تصوف کو بھی شاعری سے خارج کر دیا اور شاعر کو بجائے استعارہ
پسندوں کی طرح عارف سمجھنے کے محض صنائع قرار دیا۔ خود گومی لیوف کا
کلام اس معیار پر پورا اترتا ہی نہیں کیونکہ وہ آدمی بہت من جلا تھا، سیاحت
اور درندوں کے شکار کا شوقین، بالکل دیاسہی دنیا میں نوازد انسان جیسا
”شاعری پیشہ برادری“ والوں نے شاعر کے لیے ہونا لازم کیا تھا۔ اس کی
نظموں کے موضوع بھی جنگل اور شکار اور شکار کے حادثے، سمندر کے سیاح

اور بہادر سپاہی تھے۔ ایک نظم میں جہاں گومی لیون نے جسم اور روح کا ایک مکالمہ بیان کیا ہے، جسم کہتا ہے ”مگر اس سب کے بدلے جو میں نے لیا ہوں اور اب بھی لینا چاہتا ہوں، اپنی خوشی اور حماقتوں اور رنج کے بدلے، میں، جیسا کہ ہر مرد آدمی کو چاہیے، مرنے اور مٹ جانے پر بھی راضی ہوں“ مرد انگلی کو ہاں دے کر درجے تک پہنچا تا کہ وہ شعر بن کر بھی ظاہر ہوا کرے آسان کام نہیں، اور ”شاعری ہمیشہ برادری“ کا گومی لیون کے علاوہ ایک ہی اور رکھتا ہے جس نے میدان سخن میں نام پیدا کیا: آئن آخنا تووا، جو چند سال تک گومی لیون کی بیوی بھی رہ چکی ہیں۔

آئن آخنا تووا (پیدائش ۱۹۱۷ء) کی نظمیں پہلی بار ۱۹۱۹ء میں، گومی لیون سے شادی ہونے کے ایک سال بعد شائع ہوئیں۔ یہ نظمیں خاص شاعروں کے حلقوں میں بہت پسند کی گئیں، عام شہرت آئن آخنا تووا کو ان کے کھام کے دوسرے مجموعے کی اشاعت پر حاصل ہوئی (۱۹۲۷ء) اس کے بعد دو اور مجموعے شائع ہوئے، ایک ۱۹۲۷ء میں دوسرا ۱۹۲۸ء میں بلوک کے انتقال پر پیر برگ کے شاعروں کی سرداری ان کا حصہ ہوئی۔

آئن آخنا تووا کی نظمیں زیادہ تر ڈراما کے سے مناظر ہیں، مگر بہت مختصر۔ ان کے جذبات میں کسی قسم کا شاعرانہ بناؤ سنگار نہیں، لیکن شدت ہر اور خصوص، طرز بیان کے اختصار سے ان کی نظموں میں ایک عجیب طبع پیدا ہوتا ہے اور گو وہ زیادہ تر آپ بیتی سمجھتی ہیں، ان کی کیفیت ایک خواب کی سی رہتی ہے۔ دو نمونے ملاحظہ ہوں۔

جیسا کہ سیدھی سادی خوش اخلاقی کا تقاضا ہے،
تم میرے پاس آئے ہمسکرائے۔

کچھ پیار سے، کچھ بے پروائی سے
میرے ہاتھ پر بوسہ دیا،

اور مجھ پر ایک نظر ڈالی۔ معلوم ہوا
کہ پُرانی اسجنان صورتیں مجھے دیکھ رہی ہیں۔

میں نے ایک لفظ کہا جس میں
دس برس کی آہوں، اس مردنی کی جو مجھ پر طاری تھی،
ان راتوں کی جو میں نے جاگ جاگ کر کاٹی تھیں
ساری تاثیر جمع تھی۔ مگر اس کا کہنا بے سود ہوا۔

تم چلے گئے اور پھر میرا دل
سپاٹ اور ویران اور خالی ہو گیا۔
جُدا ہی کی ایک صورت یوں بیان ہوتی ہے:

میں تیرا سفید مکان، تیرا خاموش باغ چھوڑ دوں گی،
اس کی پروانہ کروں گی کہ میری زندگی ویران ہو گئی، جیسے بے بادل آسمان،
تیرا صرف تیرا اپنے گیتوں میں چرچا کروں گی،
جتنے مشہور کروں گی، جیسا کوئی عورت اپنے دوست کو نہیں کر سکتی ہے۔
تو اپنی عزیز دوست کو یاد کرے گا، اس جنت کو

جو تو نے اس کی آنکھوں کو فرحت پہنچانے کے لیے بنائی تھی،

اور میں سوداگری کروں گی ایک بیش بہا مال کی:

تیری الفت اور محبت کو شعر بنا کر بیچوں گی۔

آتنا آخا تو داکہ ایک اور نظم کا ترجمہ دیا جاتا ہے جس میں صرف روس کی نہیں بلکہ ہر اس قوم کی ذہنیت جو تنزل کی حالت میں ہوتی ہے بہت پتھے اور دل کش طریقے پر بیان کی گئی ہے:

ہم نے سمجھ لیا کہ ہم مفلس ہیں، ہمارے پاس کچھ بھی نہیں۔

اور جب ایک کے بعد ایک نعمت ہمارے ہاتھ سے جانے لگی،

اور ہر دن ایک نئے نقصان کا ماتم ہونے لگا،

تو ہم نے گیت بنا کر شروع کیے

خدا کے عظیم الشان فین و کرم پر،

اور اس دولت پر جسے کبھی ہم اپنی کہتے تھے۔

استعاریت کے زوال پر روسی شاعروں کے اصولوں اور اسالیب

میں انتشار پیدا ہو گیا اور ابھی تک یہی صورت قائم ہے۔ اوسپیمیل پوچ

مازل تاں نے شروع میں "شاعری پیشہ برادری" کے اصول نظم اور گومی تینو

کی تقلید کی، لیکن پھر اپنا نیا طرز ایجاد کیا ہے جس میں خیالات اور زبان

کے اعتبار سے کوئی خوبی نہیں، صرف الفاظ کے انتخاب اور ترتیب سے

موسیقی کی خاص کیفیتیں شعر میں پیدا کر دی گئی ہیں۔ اس سلسلہ کے بعد دو اور

نئے طبقے وجود میں آئے ہیں "دیہاتی شاعری" یا "تصوری" اور "مستقبل"۔

دونوں پر اشتمالیت کی تعلیم اور انقلاب کی فضا کا بہت اثر ہے، یعنی انھوں نے

نن شاعری کے وہ بنیادی اصول اور وہ مقاصد جو شروع سے اس وقت تک ہر شاعر نے تسلیم کیے ہیں اور جو شاعروں کا خاص میدان سمجھے جاتے ہیں بالکل رو کر دیے ہیں۔ ان کی شاعری کو جالیات سے کوئی واسطہ نہیں، وہ خود نہ لطیف جذبات رکھتے ہیں نہ دوسروں کی طبیعتوں میں ان کا وجود تسلیم کرتے ہیں محض سے انھیں کوئی سروکار نہیں خواہ وہ منظرِ فطر کا ہو یا انسان کا یا تخیل کا۔ اس صورت میں ان کے کلام کا ذکر کرنا فضول ہی اور اسے سمجھنے کی کوشش کرنا بیکار۔ ان جذبات سے کہیں بہتر ان پرانے شاعروں کی نظمیں ہیں جو انقلاب کے زمانے میں انقلاب کی اخلاقی اور روحانی کیفیات پر لکھی گئی ہیں جن میں سچی باتیں اچھے طریقے سے کہی گئی ہیں اور جن کے مصنف روسی قوم اور روسی فطرت سے انقلابیوں کی بہت بہت زیادہ گہری واقفیت رکھتے ہیں۔

انقلابی دور کی پڑانے طرز کی شاعری کا ذکر کرتے ہوئے سب سے پہلے بلوک کا نام زبان پر آتا ہے۔ بلوک اور پر بیان کیا جا چکا ہے، بلوک نے خوبصورت خاتون اور ”اجنبی عورت“ کی طرف سے سرد مہر ہو کر اپنی سر زمین روس کو معشوقہ بنا یا تھا۔ پہلے انقلاب کی ناکامی اور اصل حقیقت کے انکشاف نے اسے بہت مایوس کر دیا تھا، مگر اس مایوسی کے باوجود اس کی محبت کا جذبہ بہت قوی رہا۔ ایک نظم میں وہ روس کو ایک دنیا دار عورت کی شکل میں پیش کرتا ہے اور اس کی طرف ہر قسم کی اخلاقی بستی اور دل کا کینہ پن منسوب کر کے آخر میں کہتا ہے:

مگر اس صورت میں بھی ۱۱۰ سرزمین روس
تو مجھے دنیا کے ہر ملک سے زیادہ عزیز ہے۔

جہاں روسی فطرت کی خامیاں نہیں بیان کی جاتی ہیں وہاں اور
عیوں پر افسوس ظاہر کیا جاتا ہے مگر شاعر کی محبت ہر دوسرے جذبے پر غالب
رہتی ہے :-

روس، مفلس روس، میرے نزدیک

تیرے مٹیالے جھوپڑے،

تیرے گیتوں کے سبک نغے۔

گراں بہا ہیں جیسے محبت کے پہاڑے ہوئے پہلے آنسو۔

کبھی کبھی اُمید نے بلوک کی دست گیری کی اور اس نے اپنے ملک کی
غلطی کے جید دل ربا خواب دیکھے، جن میں سے ایک اس کی نظم
”نئے امریکہ“ میں بیان کیا گیا ہے۔ لیکن ترقی اور رونق کے یہ خواب اس
کے دل سے بے چینی اور اندیشہ دور نہ کر سکے مثلاً ع میں اس نے ایک نظم
”میدان کوئی کوہ“ لکھی جس میں جنگ عظیم اور انقلاب کے زلزلے کی پیشین گوئی ہو اور انقلاب
تک بلوک اپنے دل کو اسی ابد سے تسکین دلاتا رہا کہ روسی زندگی میں کوئی نہ کوئی ایسا
بنیادی تغیر ضرور ہو گا جو حالات کو بالکل بدل دے گا، پُرانے فلسفہ حیات کو
جڑ سے اُٹھا کر پھینک دے گا اور یوں روس کی فلاح کا ذریعہ ہو گا لیکن
حزن اور مایوسی بلوک کی طبیعت پر اس طرح حاوی ہو گئی تھی کہ جب مستقبل
کے وجدانی علم نے اسے انقلاب کے آمد کی خوش خبری سنائی تب بھی وہ

اپنے آپ پر، یا ان روسیوں پر جو اس کے ہم عمر تھے مطلق اعتبار نہ کر سکا،
 روس میں جان بچو بچنے کی خدمت دوسروں کو سونپی اور اپنے لیے روحانی
 تباہی کے سوا اور کوئی انجام تصور نہ کر سکا۔ مایوسی اور امید کی عجیب آمیزش
 ان تمام نظموں میں پائی جاتی ہے جو اس نے انقلاب کے زمانے میں لکھیں اور
 جو دراصل اس دور کی سب سے قابل قدر ادبی یادگاریں ہیں۔ اپنی کیفیت
 وہ ذیل کی نظم میں بہت پروردگار صحیح طریقے سے ظاہر کرتا ہے:

مجھ پر سچا رے جاہل ہفتے تھے،
 کہتے تھے نوجوان شاعر شعبدہ بازی کر رہا ہے،
 جہاں امید کی صورت نہ تھی، امید پیدا کر دی،
 جس کی کوئی انتہا نہ تھی، اس کی حد باندھ دی،
 مجھے خود بھی وہ شعلہ جو میں نے روشن کیا ہے
 عجیب نظر آتا ہے، میرے دل کو اس سے وحشت ہوتی ہے،
 میں خود اپنے تیر کا زخمی ہوں،
 خود اس نئی زندگی کا بوجھ اٹھانے سے ہمت ہار بیٹھا ہوں۔
 گزرنے والو، میرے پاس سے گزرتے جاؤ،
 میرے درد کا مذاق اڑاتے جاؤ
 میں تو مر رہا ہوں، مگر مجھے معلوم ہے میری بنائی ہوئی دنیا
 میری موت کو برداشت کرے جائے گی اور تھارے ہی ہیبت ناک تضئیک کو بھی۔
 ایک اور نظم ملاحظہ ہو۔ اس میں مایوسی کی وہ شدت نہیں اور ناکامی کا

کچھ اندیشہ جو ظاہر ہوتا ہے انقلاب کے غلطی کے احساس میں محو ہو جاتا ہے:
 دنیا کی اس تاریکی پر جو صدیوں سے چھائی ہوئی تھی،
 اس تاریکی پر جو نفرت اور شہوانیت سے بھری ہوئی تھی،
 اس تاریکی، پر جنگی نعروں کے جواب میں آسمان پر
 ایک نئی قوت کا آفتاب طلوع ہو رہا ہے۔
 وہ شعاعیں جو اس آفتاب کے تاج کے گوشے ہیں
 بہت جلد کالے بادلوں کی گھٹا کو پار کر جائیں گی۔
 اور لوگ میدان جنگ سے دریا کے دھارے کی طرح
 اس کے چمکتے ہوئے تخت کے سامنے پہنچیں گے۔
 ہم جو صرف رات کے اندھیرے اور طوفان سے آشنا ہیں
 اس شاہانہ جلوے کے دیدار کی تاب نہ لائیں گے۔
 اور ہماری دنیا آسمان کا دشت ناک منظر دیکھ کر۔
 راگھو کا ایک ڈبہ بن جائے گی۔

انقلاب کے زمانے کا ادبی کارنامہ بلوک کی نظم ”بارہ سوار“ ہے جس کا
 اکیس مختلف زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے اور بعض زبانوں میں متعدد بار۔
 اس میں بارہ سواروں کا قفقہ ہے جو رات کو شہر میں پہرہ دے رہے ہیں
 اور غنیمت گیت گاتے اور ادھر ادھر گولیاں چلاتے سڑکوں کی گشت لگا رہے
 ہیں۔ انقلاب کا زمانہ ہے۔ زیادہ رات گزرنے کے بعد لوگوں کو سڑکوں پر
 گھومنے کی اجازت نہیں ہے، اس لیے یہ بارہ سوار جب اپنے آگے ایک شخص

کو سر جھکائے جاتے ہوئے دیکھتے ہیں تو اسے فوراً للکار تے ہیں وہ شخص کوئی جواب نہیں دیتا، سوار فوراً گولی مارتے ہیں، مگر اس کا بھی راہ رو پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ تب وہ گھوڑوں کو ایڑ لگا کر اس کے پاس پہنچتے ہیں راہ رو منہ پھیر کر ان کی طرف دیکھتا ہے اور سوا اس کی صورت دیکھ کر دنگ رہ جاتے ہیں کیونکہ وہ کوئی معمولی راہ رو نہیں، خود حضرت عیسیٰ ہیں، جو اپنی محبوب قوم میں روحانی بیداری کے آثار دیکھ کر آتے ہیں کہ کچھ ان کی بھی امیدیں پوری ہوں۔ اس نظم میں بلوک نے صرت انقلاب کی روحانی اہمیت نہیں بتائی ہے بلکہ شاعری کا ایک کرشمہ دکھایا ہے۔ اس کی زبان وہی ہے جو عوام خصوصاً شہری مزدوروں کے گیتوں کی، مگر اس کی بحرین موسیقی اور ترنم کے جواہر ریزے ہیں اور اس میں ایک شان ہے جو بہت کم نظموں میں پائی جاتی ہے۔ بلوک کے علاوہ ان تمام شاعروں نے جن میں وطن پرستی کی ذرا بھی گدگدی تھی اپنے اپنے طرز پر انقلاب سے ہمدردی ادا ان مصیبتوں پر افسوس ظاہر کیا جو انقلابیوں اور روس کی عام آبادی کو اس تخریب کے کامیاب بنانے کے لیے اٹھانی پڑیں، لیکن بلوک کے پایہ کو کوئی نہیں پہنچا، آئنا آئنا تو اس کو بھی اپنے وطن سے بہت محبت ہے اور لڑائی کے زمانے میں انھوں نے اپنے جذبے کا یوں اظہار کیا۔

برسوں بیمار رکھ کر میری زندگی تلخ کر دے،
مجھے سانس کے روگ میں مبتلا کر دے، میری نیند چھین لے، مجھے گرمی میں جلا،
اولاد اور دوست سے محروم کر دے،

نغمہ سرائی کی پُراسرار نغمت واپس لے لے،
 لیکن ای خدا، میری یہ دعا بھی قبول کر لے
 کہ اتنے دنوں تکلیف دینے اور ترہ پانے کے بعد
 وہ بادل جو تاریک روس پر چھایا ہوا ہے
 آخر کار آفتاب کی شعاعوں سے چمک اُٹھے۔

لیکن یہ وطن پرستی ایسی شدید اور دل افروز نہیں کہ شاعر کو مستقبل
 کے راز بتا دے، یا انقلاب کے روحانی اسرار اس پر واضح کر سکے۔ انقلاب
 کی نسبت آتنا آخلاق و اسیرت یہ کہہ سکیں:

گزشتہ عہدوں سے ہمارا زمانہ کس صورت سے بدتر ہے؟
 کیا اس لحاظ سے کہ درد اور پریشانی کی انتہائی حالت میں
 اس نے وہ روگ دور کرنا چاہا جو سب سے زیادہ زہر پلا تھا،
 اور نا کامیاب رہا؟

ان شاعروں نے جو انقلاب اور انقلابیوں کے خاص حامی اور مبلغ
 مانے جاتے ہیں اور جن کا سردار مایاکوفسکی (پیدائش ۱۸۹۲ء) ہے، تعمیل
 کی بلند پروازی اور ادبی کمال سے بالکل بیگانہ ہیں اور ان کی شاعری کو
 دراصل ادب میں شامل ہی نہ کرنا چاہیے۔ البتہ انقلاب نے نئی زندگی کی
 تعمیر کا سچا جوش اور حوصلہ پیدا کر دیا ہے اور یہ حوصلہ ممکن ہے رفتہ رفتہ نئے
 پھول کھلائے۔ ولیرئی بریوسوف کی نظم ”تیسری خزاں“ کے آخر میں جو
 دعویٰ ہے اس میں مبالغہ بہت ہے مگر روسی قوم کی عام بیدار دلی دیکھتے ہوئے

اس کا بھی امکان ہے کہ وہ ایک حد تک صحیح نکلے۔
 ای ہوا، ای ہوا، یہ یاد رکھ
 کہ جھگڑاؤں اور یکسی اور مفلسی کے باوجود
 سارا روس تعمیر کی خوابوں سے مرت
 خدا کے حکم پر چلے گا اور فتحیاب ہوگا !
 ای ہوا، یاد رکھ کہ پرانی قوت پھر روس میں آگئی ہے،
 فتحیابی کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے،
 اور اس کی روز افزوں طاقت اور اقتدار
 اسے دنیا کی ساری قوموں کا رہبر بنا دے گا !

روسی حکایتیں

ادان آندرے یوچ کرلیوف (۱۷۹۸-۱۸۴۴)
 کرلیوف، روس کا حکیم لقمان، زمانے کے اعتبار سے شروع کے
 ادیبوں میں تھا، لیکن اس کی بالکل جداگانہ حیثیت ہے اور اس سبب
 سے اس کا الگ ذکر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ روس کا وہی ایک
 ادیب ہے جس نے حکایتیں لکھیں اور جو حکیم کہلانے کا مستحق ہے، وہ نہ
 شاعروں میں کہلتا ہے اور نہ ڈراما نویسوں میں، اگرچہ ڈراما نویسوں میں
 اس نے خاصا ملکہ پیدا کیا اور اپنے زمانے میں خاصا مشہور ہوا۔ قصہ
 کہانی کا وہ خاص انداز جو حکایت میں اختیار کیا جاتا ہے افسانہ نویسی
 سے بالکل جدا ہے۔

کرلیوف کی زندگی اور ادبی کوششیں روسی قوم کی سرگزشت
 سے بہت ملتی جلتی ہیں۔ وہ ایک فوجی افسر کا لڑکا تھا جسے ایمانداری
 نے دوسروں کی طرح رشوت کھا کر دولت نہیں جمع کرنے دیا اور اسے
 درثی میں باپ کی نیک نامی اور صندوق بھر کتابوں کے سوا اور کچھ
 نہیں ملا۔ لیکن کرلیوف کو تعلیم حاصل کرنے کا سچا شوق تھا، اور جو

مشکلیں مغلس نے پیدا کیں وہ اس کی غیر معمولی محنت اور جفاکشی نے اس پر آسان کر دیں۔ ۱۹۲۰ء میں وہ اپنی ماں کے ساتھ پتیر برگ گیا، جہاں اسی زمانے میں ایک نیا ٹھیٹر کھلا تھا اور فون ویزن کے ڈرامے دیکھ کر کرلیون کو بھی ڈراما نویسی میں طبع آزمائی کرنے کا حوصلہ ہوا۔ اس کا پہلا ڈراما فون ویزن کے طرز پر تھا، مگر اس میں آئینہ ترقی کے آئنا دیسے نمایاں تھے کہ ایک کتب فروش نے نوجوان انشا پرداز کی ہمت افزائی کے لیے اسے ۸۰ روپل میں خرید لیا۔ کرلیون نے اس روپیے سے مشہور فرانسیسی ڈراما نویس مولییر، راسین اور کورنیلے کے ڈرامے خریدے اور ان سے سبق لے کر پھر مشق شروع کی۔ اس کے ڈراموں میں آج کل تو کوئی خاص خوبی نظر نہیں آتی، لیکن اس وقت ان کی خاص قدر کی گئی اور کرلیون ڈراما نویس کی حیثیت سے شاہی ٹھیٹر میں ملازم رکھ لیا گیا۔ کرلیون کی آزادی پسند طبیعت ملازمت کی پابندیوں کو گوارا نہیں کر سکتی تھی، اس نے ۱۹۲۹ء میں استعفا دے کر چند دوستوں کی شرکت میں ایک اخبار نکالا جس میں کرلیون کا حصہ طنزیہ مضامین، ڈرامے اور قصے لکھنا تھا۔ یہ اخبار بہت جلد بند کر دیا گیا اور اس کے بعد کوئی تین سال تک کرلیون ادارہ گردمی کرتا رہا۔ ۱۹۳۰ء میں اس کی نواب گولیٹین سے ملاقات ہوئی اور ۱۹۰۵ء تک کرلیون اس کے ساتھ رہا۔ اس عرصے میں اس نے بہت سے ڈرامے لکھے، مگر ایک مرتبہ اس نے جوئے میں تیس ہزار روپل جیتے تو اس نے اپنے

رئیس دوست کو خیر باد کہی اور پھر آوارہ گردی کرنے لگا۔ دو سال تک وہ میلوں اور بڑے شہروں کے قمار خانوں میں جوا کھیلتا پھرا اور آخر کو تھک کر پتھر برگ میں مستقل رہنے کا انتظام کر لیا۔ اسی زمانے میں اسے اپنی ایک نئی صلاحیت کا پتہ چلا تھا۔ اس نے مشہور فرانسیسی حکایت نویس لافون تین کی دو حکایتوں کا ترجمہ کر کے ایک ممتاز نقاد و میٹری لفٹ کو دکھایا اور میٹری لفٹ نے اسے یقین دلادیا کہ اس کی طبیعت اس قسم کی کہانیاں لکھنے کے لیے خاص موزونیت رکھتی ہے۔ کریٹوف نے اس کی مشق جاری رکھی اور جب اس نے ۱۸۰۸ میں پتھر برگ کے ایک رسالے میں سترہ حکایتیں شائع کیں تو وہ اس فن کا استاد مان لیا گیا، زار روس سے لے کر معمولی تعلیم یافتہ آدمیوں تک سب کو اس نے اپنا گردیدہ کر لیا اور اس کی حکایتوں کا چرچا وقت کے ساتھ برابر بڑھتا رہا۔

کریٹوف کی ہر دغیر نثری کاتب سے بڑا سبب یہ تھا کہ اس کی طبیعت اس کی ذہنیت، اس کی حکمت اور اس کا انداز بیان ٹھیکہ روسی تھا۔ بچپن میں وہ مچلی کوچوں میں مارا مارا پھر چکا تھا، آوارہ گردی کے زمانے میں اسے ہر قسم اور ہر طبقے کے لوگوں کی صحبت میں بیٹھنے کا موقع ملا تھا۔ وہ مشلیں، کہا دیتیں، چبھتے ہوئے فقرے جو اس نے سُنے تھے سب اس کے ذہن نشین ہوتے گئے اور جب اس نے حکایتیں لکھنا شروع کیا تو سمجھے اس کی زبان خود بخود روسی قوم کی ترجمانی کرنے لگی۔ شاعری اور ڈراما نویس کی مشق سے اسے زبان پر اتنی قدرت ہو گئی تھی کہ وہ موقع

اور طرزِ بیان میں انتہائی مناسبت پیدا کر سکتا تھا اور حکایتوں کا رس کبھی نظم کی لطافت ہوتی ہو، کبھی ڈراما کی کشمکش اور کبھی حکمت اور نصیحت کی نکتہ رسی۔

حکایتوں کے چند نمونے پیش کیے جاتے ہیں۔ اس کا خیال رہے کہ یہ ترجمے ہیں اور ترجمے میں خواہ مخواہ ایک بناوٹ آ جاتی ہو، خاص طور سے اگر مترجم کو بات کہنے کا وہ سلیقہ نہ ہو جو اصل مصنف کو۔

گوئیے

ہسائے نے ہسائے کی دعوت کی۔

مگر اس میں ایک غرض بھی تھی:

میربان کو تھا موسیقی کا شوق

اور اس نے ہسائے کو اس بہانے سے جند گویوں کا گانا سنانے کو بلایا تھا۔

یہ پہلوان بڑی بے جگری سے سردوں کی کھینچ تان کرتے رہے،

خوب گلا بھاڑ بھاڑ کر چیخے

مہان کے کان جھٹانے لگے،

سر جھکانے لگا۔

اس نے حیرت سے پوچھا: ”بھئی مجھے معاف کرنا

مگر اس میں بات کیا ہو؟ تمہارے گوئیے تو

پھٹے ڈھول کی طرح چلاتے ہیں“

مہان نے معذرت کے لہجے میں جواب دیا: ”یہ تو ٹھیک ہے،

ان کی آواز بھٹی بھٹی سی ضرور ہے،
 مگر یہ بھی تو دیکھیے کہ یہ شراب بالکل نہیں پیتے
 اور چال چلن کے بہت اچھے ہیں۔
 مگر میں کہتا ہوں: پینے کو جی چاہے تو خوشی سے پیو،
 پر اپنا کام سلیقے سے کرو۔

ہاتھی اور کتیا

سڑک پر ہاتھی کو گھما رہے تھے،
 ظاہر ہو اس لیے کہ سب اسے دیکھیں۔
 یہ تو آپ جانتے ہیں ہاتھی ہمارے یہاں ایک انوکھی چیز ہے۔
 اس لیے ہزاروں آدمی منہ پھیلانے اس کے پیچھے پیچھے پھر رہے تھے۔
 نہ جانے کدھر سے ایک ذرا سی کتیا نکل پڑی۔
 اور ہاتھی کو دیکھتے ہی اس پر لپکی،
 بھونکی، غڑائی، پتیرے بدل بدل کر جمبھٹی...
 سمجھو لڑائی پر تلی تھی۔
 ”بی ہسائی، اپنی لاج نہ گنواؤ“
 اس سے ایک کتے نے کہا: ”تمہاری حقیقت کیا ہو کہ ہاتھی سے
 لڑائی چھیڑو؟“

دیکھو، تم جبار ہی ہو، وہ اطمینان سے چلا جا رہا ہے،
 گویا تمہاری آواز اس کے کانوں تک پہنچتی ہی نہیں!“

”ارے جاؤ بھی“ کتیا نے پھٹ سے جواب دیا،
 ”میری تو اس بات سے اور ہمت بڑھتی ہے
 کہ میں بغیر لڑے ہوتے
 بڑے جنگی جوانوں کا سامنا کر لیتی ہوں...
 تم آپ ہی دیکھنا، سارے کتے کہیں گے،
 ”دیکھو تو اس کتیا کو، یہ بڑی سورا ہوگی
 جو ہاتھی پر بھی بھونک لیتی ہے!“

بطینیں

کوئی کسان بطخوں کو ایک لمبی قطار میں
 بیچنے کے لیے بازار ہٹکائے لیے جا رہا تھا۔
 بیچ تو یہ کہ وہ بطخوں کے اس جھنڈ کا کوئی خاص سحاظ نہیں کرتا تھا؛
 بازار کا دن تھا، وہ چاہتا تھا جلدی سے جا کر انھیں اچھے داموں
 بیچ آئے۔

(یہ تو آپ جانتے ہیں، منافع کی خاطر
 بطینیں کیا آدمی بھی بیچ ڈالے جاتے ہیں)
 میں کسان پر کوئی الزام نہیں لگاتا
 مگر ان بطخوں کی رائے کچھ اور تھی
 اور رائے میں جب انھیں ایک مسافر ملا
 تو وہ اس سے کسان کی شکایت کرنے لگیں:

”بھلا دنیا میں کسی اور پر بھی ایسا ستم ڈھایا گیا ہوگا جیسا کہ ہم پر؟
یہ کسان ہمارے ساتھ بدسلوکی کرتا ہی،
ہمیں ادھر ادھر نہکا تا پھرتا ہی، سمجھتا ہی ہم معمولی بطخیں ہیں۔
اس گنوار کو یہ نہیں معلوم ہی۔

کہ ہماری عزت کرنا اس کا فرض ہی،
کیوں کہ ہم ان بطخوں کی نامورسل سے ہیں
جنہوں نے ایک زمانے میں روم کو دشمنوں سے بچایا تھا
اور جن کی یاد تازہ رکھتے کے لیے ایک تہوار منایا جاتا تھا!“
مسافر نے پوچھا: ”مگر آپ کس بنا پر اپنی قدر کرنا چاہتی ہیں؟“
”مگر دیکھیے تو، ہمارے آباؤ اجداد۔“ ”جی میں جانتا ہوں،
میں نے یہ سب کتابوں میں پڑھا ہی... میں تو یہ پوچھ رہا ہوں
کہ آپ نے کسی کا کیا بھلا کیا ہی؟“

”حضرت! ہمارے آباؤ اجداد نے روم کو بچایا تھا!“
”یہ تو ٹھیک ہی، مگر آپ نے بھی کچھ کر دکھایا ہی؟“
”ہم نے؟... نہیں کچھ نہیں۔“ ”تو پھر آپ میں کون سی صفت ہی؟“
اپنے آباؤ اجداد کو آرام کرنے دیجیے،
اُنہوں نے جو کچھ کیا اس کا انہیں اجر ملا،
آپ تو بس بچا کر کھانے ہی کے لائق ہیں!“
اس کہانی کا مطلب اوردن زیادہ صاف صاف بیان ہو سکتا ہی،

پر میں ڈرتا ہوں کہیں اور طعنیں خفا نہ ہو جائیں !

بھیڑ اور کتے

بھیڑیوں سے بچنے کے لیے بھیر دوں کے ایک گلے نے بہت سے محافظ کتے رکھے ۔

اور انجام کیا ہوا ؟ کتوں کا ایسا ہجوم ہو گیا

کہ بھیڑیوں سے تو بھیریں بچی رہیں ،

لیکن کتوں کو بھی تو آخر بھوک لگتی ہی :

پہلے تو انھیں بھیر دوں کے بچے کھلاتے جانے لگے ،

اس کے بعد باری باری سے بھیریں ان کی نذر ہونے لگیں ،

آخر میں صرف پانچ چھو باقی بچیں

اور انھیں بھی کتے چٹ کر گئے ...

پن چکی والا

ایک پن چکی والے کے حوض سے پانی بہنے لگا ۔

یہ کوئی بڑی مصیبت نہ تھی

اگر سوراخ پہلے ہی سے بند کر دیا جاتا ۔

لیکن ۔ کیا یہ کہنے کی ضرورت ہے ۔ پن چکی والے کو اس کی پروا بھی نہ ہوئی ،

اور پانی دن بہ دن زیادہ بہنے لگا ۔

معلوم ہوتا تھا کوئی گھڑ دوں میں بھر بھر کر پھینک رہا ہے ۔

اُسے پن چکی والے ، کھڑا جمجھائی کیا لے رہا ہے ؟

ذرا اپنی چیز کی خبر لے؟“
 مگر پن چکی والے نے کہا: ”بھی کون سی مصیبت آپڑی ہے!
 مجھے سمندر بھر پانی تو چاہیے نہیں،
 اور جتنا چاہیے اتنا میرے حوض میں رہتا ہی ہے۔“
 وہ بے فکر رہا اور اس درمیان میں
 پانی مشکوں پہنے لگا۔

اب مصیبت نے سچ جمع آگھیرا تھا:
 چکی کے پاٹ چلتے چلتے رُک گئے، پن چکی بے کار ہو گئی۔
 تب پن چکی والے کو کام سنبھالنے کی سوچھی، خوب کا نکھا، پسینے پسینے ہو گیا،
 اور پانی بچانے کی بسیوں ترکیبیں سوچیں۔۔۔
 وہ پانی کا بہاؤ دیکھنے کے لیے حوض پر کھڑا ہوا تھا
 کہ اتنے میں اس کی مرغیاں بہتے پانی کو پینے پہنچیں۔
 وہ دانت ٹٹکٹا کر چلا یا: ”نکمی! حرام خور! بد معاش!
 میری سمجھ میں نہیں آتا کہ پانی کہاں سے لاؤں
 اور تم مزے میں اسے پیے ڈالتی ہو!“
 اس نے کھینچ کر ان کے ٹنڈا مارا۔ اور سب کو لٹا دیا۔
 لیکن اس سے فائدہ کیا ہوا؟
 پانی بہ چکا تھا، مرغیاں بھی ہاتھ سے گئیں۔
 میں نے اکثر ایسے حضرات دیکھے ہیں

را اور انہیں کی خدمت میں یہ کہانی بطور تحفہ پیش کی جاتی ہے)
 جو فضول چیزوں میں ہزاروں روپیے بھینکتے ہیں،
 مگر جلی ہوئی سو مہینوں کے سرے پچالیں
 تو سمجھتے ہیں کہ بڑی کفایت کی،
 اس لیے ان کو اٹھارے کھنے کا بڑا اہتمام کیا جاتا ہے۔
 جس گھرانے میں ایسی گرسی کی جاتی ہو
 وہ کیا تعجب ہے کہ ستیا ناس ہو جائے۔

استرہ

سفر میں ایک مرتبہ میرا اور ایک دوست کا ساتھ ہوا
 اور رات کو ہم ایک ہی کمرے میں سوئے۔
 صبح سویرے میری آنکھ کھلی تو کیا دیکھتا ہوں
 میرا دوست بڑی سخت تکلیف میں ہے۔
 رات کو ہم سنہی مذاق کی باتیں کرتے بے فکر سوئے تھے،
 صبح جو پہلی آوازیں کان میں پڑیں ان سے پتہ چلا کہ اس کی کیفیت کچھ
 اور ہے:

”وہ کبھی چلا اٹھتا ہے، کبھی کراہتا ہے، کبھی ہائے ہائے کرتا ہے!
 ”میرے مشفق، تمہیں کیا ہو گیا ہے... کیا تمہارے کہیں درد ہو رہا ہے؟“
 ”ارے نہیں، میں داڑھی مونڈ رہا ہوں...“
 ”کیا؟ بس!“ یہ کہہ کر میں اٹھ بیٹھا۔ دیکھتا کیا ہوں: میرا مسخرہ

آئینے کے سامنے کھڑا ہے، آنکھوں میں آنسو ہیں اور ایسی بھیاں تک نکلیں بنا رہی ہے کہ گویا اس کی کھال کھینچی جا رہی ہے۔۔۔

جب مجھے داویلا کا سبب معلوم ہوا

تو میں نے کہا، ”کوئی تعجب نہیں، تم تو اپنے اوپر ظلم کر رہے ہو!
ذرا مہربانی کر کے دیکھو تو۔“

متمھارا اُسترہ اُسترہ نہیں کلباڑی ہی!

تم اس سے ڈاڑھی نہیں مونڈ سکتے، صرف اپنے آپ کو تکلیف پہنچا سکتے ہو!
”ارے بھئی، میں بھی جانتا ہوں میرے اُسترے سب کُند ہیں!

میں ایسا بوقوف نہیں ہوں کہ اتنی سی بات بھی نہ سمجھوں۔۔۔

لیکن میں ڈرتا ہوں کہ تیرا اُسترے سے کہیں کھال نہ کٹ جائے!“
”مگر، میرے دوست، میں تو یہ کہوں گا

کہ کُند اُسترے سے کھال کٹ جانے کا اندیشہ زیادہ ہے۔

تیرا اُسترے سے حماست بہت اچھی بنے گی۔

بس اسے استعمال کرنا سیکھ لو!“

میں اس کہانی کا مطلب اور واضح کیے دیتا ہوں:

کیا ایسے بہت سے لوگ نہیں ہیں، چاہے وہ اس کا اقرار کرتے ہوئے

شرمائیں

جو سمجھ در آدمیوں سے ڈرتے ہیں

اور صرف بیوقوفوں کی صحبت گوارا کر سکتے ہیں۔

تماشائی

”ارے یار! کہو اچھے رہے؟ کہاں سے آرہے ہو؟“
 ”بھئی میں تو عجائب خانے گیا تھا۔ تین گھنٹے ٹینک وہاں گھومتا رہا،
 سب کچھ دیکھ آیا، خوب جی بھر کر دیکھا۔ تم تو مانو گے نہیں، لیکن مجھے تو
 وہاں کی عجائبات نے ایسا حیرت میں ڈال دیا کہ بیان نہیں کر سکتا!
 سچ کہتا ہوں، وہاں عجائبات سے کمرے بھرے پڑے ہیں!

قدرت نے بھی کیا کیا ایجادیں کی ہیں!
 کیسے کیسے جانور، کیسے کیسے پرند دیکھنے کو ملے!
 کیسی کیسی تتلیاں، پتنگے مارنگین کیڑے مکوڑے، نکھیاں، بھینگر،
 کوئی زمر دی رنگ کا، کوئی جیسے مونگا۔
 ایسے ننھے ننھے بھنگے جیسے آپس کا سر!“

”مگر یہ تو بتاؤ، تم نے وہاں ہاتھی کو بھی دیکھا؟ وہ بھلا کیسا
 ہوتا ہی؟“

”میں سمجھتا ہوں اُسے دیکھو تو معلوم ہو کہ جیسے کوئی پہاڑ سا سنے
 آگیا!“

”کیا وہاں ہاتھی بھی ہے؟“

”ہاں ہی!“

”پھر تو مجھ سے چوک ہوئی، ہاتھی مجھے دکھائی نہیں دیا۔“

روسی ڈراما

پہلا باب

روس میں مغربی تہذیب کی نقل کے سلسلے میں ڈراما دیکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ شروع میں یہ شاہی خاندان اور درباریوں تک محدود تھا اور پیترا غظم کا باب ماسکو کے چند جرمن باشندوں سے ڈرامے لکھوا کر دوبارہ میں مناشے کراتا تھا۔ ان جرمن ادیبوں کے علاوہ اس دور میں ایک روسی عالم پولوٹسکی کا نام بھی ڈراما نویسوں میں ملتا ہے اور اس کے چند مذہبی ڈرامے اب تک موجود ہیں۔ لیکن اس فن کو رائج کرنے کی کوشش قبل از وقت تھی، اور قدامت پسند امیروں اور درباریوں نے اسے جائز دیکھیوں میں شامل نہیں ہونے دیا۔ جب پیترا غظم تخت پر بیٹھا اور اسے ریاست پر کافی تسلط حاصل ہو گیا تو اس نے جرمنی سے ایکٹر بیلوائے اور خود ان کے رہنے سہنے کا انتظام کیا (۱۷۶۰ء)۔ پہلے ماسکو میں ایک ٹھیٹر قائم ہوا جو بعد کو پیترا غظم کے بے دارالسلطنت میں منتقل کر دیا گیا، اور رفتہ رفتہ ناظرین کے شوق اور دل چسپی کے ساتھ ٹھیٹروں اور ایکٹروں کی تعداد بڑھتی رہی۔ ان ٹھیٹروں میں

جو ڈرامے دکھائے جاتے تھے وہ زیادہ تر جرمن ڈراموں کی نقلیں یا ترجمے ہوا کرتے تھے اور ان کے ایکٹر بھی اکثر غیر قوموں کے لوگ ہوتے تھے، ۱۷۵۰ میں چند لوگوں نے مل کر قصبہ یاروسلافل میں ایکٹروں کی جماعت بنائی اور انھیں کوروس کے پہلے دیسی ایکٹر سمجھنا چاہیے۔ قائم ہونے کے چھو سال بعد ملکہ ایلزبتا کے حکم سے یہ جماعت پیربرگ بلانی گئی، اسے ”شاہی ٹھیٹر“ کا خطاب دیا گیا اور ریاست نے باقاعدہ اس کی سرپرستی شروع کر دی۔

ملکہ کیتھرین دوم (۱۷۶۲-۱۷۹۶) کو تمام فنون لطیفہ کا بہت ذوق تھا، اور انشا پردازی میں وہ طبع آزمائی بھی کیا کرتی تھی۔ اس کے عہد میں ٹھیٹر کو بہت فروغ ہوا اور سوارو کوٹ نے متعدد ڈرامے لکھ کر دکھانے کے واسطے بھی بہت سامان مہیا کر دیا۔ اس زمانے کے ایکٹر دو اور ڈراموں پر تنقید نہ کی جائے تو بہتر ہے۔ فرانس کی تقلید میں سارے تعلیم یافتہ روسی ایسے دیوانے ہو گئے تھے کہ ڈراما اور ایکٹنگ میں فرانسیسی طرز کے سوا ان کی نظروں میں کچھ جنبٹا نہیں تھا، اور مصنوعی، بے جان فرانسیسی طرز کی نقل کر کے انھوں نے اپنا معیار بہت گرادیا۔ تقلید کے مرض نے انتہا کو پہنچ کر ایک حد تک خود اپنا علاج کیا اور ملکہ کیتھرین کے عہد ہی میں بے تکی تقلید کے مخالفت اپنی آواز بلند کرنے لگے۔ کنیاثرین (۱۷۴۲-۱۷۹۱) اور اوزے رون (۱۷۶۹-۱۸۱۶) نے فرانسیسیوں کی نقل تو نہیں چھوڑی مگر انھوں نے

روسی زندگی کو اپنا موضوع بنایا اور یوں روس کے پہلے حقیقت نگار ڈراما نویس دے نیس فون ویزن (۱۷۴۴-۱۷۹۲) کے یہ میدان تیار ہو گیا۔

دے نیس فون ویزن کا خاندان جرمنی سے آکر روس میں آباد ہوا تھا، لیکن فون ویزن کی پیدائش تک وہ بالکل روسی ہو گیا تھا اور جو دولت اس کے پاس تھی وہ بھی زیادہ تر گنوائی جا چکی تھی۔ ۱۷۶۲ میں فون ویزن نے تعلیم ختم کر کے وزارت خارجہ کے ایک دفتر میں نوکری کر لی، جہاں اسے فرانسیسی اور لاطینی زبان سے کاغذات کا ترجمہ کرنا ہوتا تھا۔ نوکر ہونے کے دو سال بعد ہی اس نے اپنا پہلا ڈراما ”فوجی افسر“ شایع کیا اور اگر وہ اپنی تصانیف کا سلسلہ جاری رکھتا تو وہ روس کی ادبی دنیا پر آسانی سے چھا جاتا، کیوں کہ ”فوجی افسر“ کو جس نے پڑھا اس نے بہت پسند کیا۔ لیکن فون ویزن کو ملازمت میں بہت ترقی ہوئی، وہ امیرانہ زندگی بسر کرنے لگا، کئی سال پوٹا کا سفر کرتا رہا، اور یوں ”فوجی افسر“ کے بعد اٹھارہ سال تک اس نے کوئی ڈراما نہیں لکھا۔ لیکن جب فون ویزن نے اپنا دوسرا ڈراما ”پیر نابالغ“ شایع کیا اور وہ اسٹیج پر دکھایا گیا تو اس کی ایسی دھوم مچی جس کا آج کل اندازہ کرنا مشکل ہے۔ ”پیر نابالغ“ اس کا لازماً تھا اور اس کی آخری تصنیف بھی۔ ایک خاص قسم کی کیفیت، جو معلوم نہیں کہ مذہب کے اثر سے پیدا ہوئی یا کوئی بیماری تھی، اس کے ذہن پر

بھوت کی طرح سوار ہو گئی اور اس کی صحت عیاشی کی نذر ہوئی۔ موت سے بہت پہلے اس کی زندگی بے مصرف ہو چکی تھی۔

اس زمانے کا تقاضا تھا کہ روسی سوسائٹی پر تنقید کی جائے اور فون ویزن نے اپنے دونوں ڈراموں میں تنقید اور طنز سے رنگ پیدا کیا۔ اس نے یہ طرز بلاوجہ نہیں اختیار کیا، اس کا خیال تھا کہ مغربی قوموں کا دن ڈھل رہا ہے، اور روس میں ابھی صرف افق پر ڈراما سحر خئی نئے دن اور تازہ زندگی کی پہلی جھلک دکھا رہی ہے۔ ”ہم شروع کر رہے ہیں، وہ خاتمے کے قریب ہیں۔ مستقبل ہمارا ہے اور ہم اپنی قومی زندگی کو جو شکل چاہیں دے سکتے ہیں۔“ اس عقیدے نے فون ویزن کے طنز کو اور بھی بے باک کر دیا اور روسیوں میں خود داری پیدا کرنے کی آرزو کو اور بھی گرمادیا۔ ”فوجی افسر میں اس نے اپنے زمانے کی فرانس پرستی اور اس تربیت کا مذاق اڑایا ہے جو فرانس پرستی نے رائج کرائی تھی، اس ڈرامے کا ہیرو اوانشکا اس زمانے کے نوجوانوں کا ایک مثالی نمونہ ہے، اور اسے پیش کرنے کا مقصد والدین کو بیدار کرنا اور نوجوانوں کو عبرت دلانا ہے۔ اوانشکا نے جس اسکول میں تعلیم پائی اس کا بانی ہنر مند اور ہیڈ ماسٹر ایک فرانسیسی ہے جو پیرس میں کرایے کی گاڑی چلاتا تھا، اور روس میں آکر عالم اور مدرس بن گیا۔ اس مدرسے سے فارغ ہو کر اوانشکا پیرس گیا، وہاں اوباشوں کی صحبت میں بڑ کر باز رہی زندگی کی راہ دیکھ سیکھی اور روس واپس ہوا تو اپنی

قابل رشک تربیت کی بنا پر ناز و نخرے کرنے لگا۔ والہی کے بعد باپ سے اس کی جو پہلی گفتگو ہوتی ہے اس کا ایک حصہ ملاحظہ ہو:-

فوجی افسر (اولنٹکا کا باپ) سن رے، ادا دان، بچپن سے اب تک میری نظر شرم سے بہت کم نیچی ہوئی ہے لیکن تو نے تو مجھے ایسا شرمندہ کر رکھا ہے کہ جی چاہتا ہے زمین میں دھنس جاؤں اولنٹکا: آبا جان، میں کیسے گوارا کر سکتا ہوں کہ آپ لوگ کسی روٹیاں لڑکی سے میری شادی کر دیں۔

فوجی افسر: مگر تو فرانسیسی کیسے بن بیٹھا؟ کیا تو روس میں نہیں پیدا ہوا تھا؟

اولنٹکا: میرا جسم روس میں پیدا ہوا مگر میری روح شاہ فرانس کی تابعدار ہے... مجھے آپ کے عہدے اور آپ کی عزت آبرو سے کوئی واسطہ نہیں، میں اس کا لحاظ کرنے پر تیار نہیں، خصوصاً جب آپ یہ بھول جاتے ہیں کہ میں دنیا کی سیر کر آیا ہوں، پیرس میں رہ چکا ہوں۔

فوجی افسر: بھلا یہ بھول جانا کسی کے بس کی بات ہے؟ جناب من، ہر لمحے آپ کی کوئی نہ کوئی نئی حاکمت اس کی یاد تازہ کر دیتی ہے اور آپ کی حاکمتیں ایسی ہیں کہ اگر آپ فوج میں ہوتے تو آپ کی سب سے ادنیٰ حاکمت کی سزا میں آپ کی نازک پیٹھ پر کوڑے لگتے۔

ادانشکا: ابا جان، آپ تو ہر وقت اسی خیال میں رہتے ہیں کہ آپ کے سپاہیوں کی ایک قطار کھڑی ہو اور آپ کمان دے رہے ہیں۔ آخر اس قدر چلانے کی ضرورت کیا ہے؟
 فوجی افسر ٹھیک کہتا ہے، چلانے سے کوئی فائدہ نہیں۔ لیکن تو نے مجھے پھر تنگ کیا تو تیری پیٹھ پر کم از کم سو روسی ڈنٹے رسید کروں گا۔ سمجھا؟

ادانشکا: جی سمجھا۔۔ میرے خیال میں اگر آپ کی کسی جنگل میں ایک ریچھ سے ٹک بھڑ ہو جائے تو وہ آپ کے ساتھ دلیسا ہی سلوک کرے جیسا آپ میرے ساتھ کر رہے ہیں۔
 فوجی افسر کیا بد زبان لونڈا ہے! ہاپ کو ریچھ سے تشبیہ دیتا ہے۔
 کیا میری صورت ریچھ کی سی ہے؟

ادانشکا: متباہت کا کوئی سوال نہیں۔ میں نے تو بس اپنا خیال صاف صاف ظاہر کر دیا ہے۔ میری طبیعت ہی کچھ ایسی صاف گو واقع ہوئی ہے۔

فرانس پرستی ہی روسی سماج کا روگ نہیں تھی کوئی سمجھ دار روسی اس سے انکار نہیں کر سکتا تھا کہ قدامت پسند حلقوں میں جمالت اور تنگ نظری کی کوئی انتہا نہ تھی اور ان لوگوں کی اصلاح کرنا اتنا ہی ناگزیر تھا جتنا فرانس کے مقلدوں کا دماغ درست کرنا۔
 فون دیزن نے اپنے دوسرے ڈرامے ”پیرنا بالغ“ میں قدیم طرز کے

ایک گھرانے کی تصویر دکھائی ہے اور پُرانے فلسفہ حیات اور طرز معاشرت کا بھرم کھول دیا ہے۔ ڈرامے کا تہیہ و مترو فان ایک سولہ سترہ برس کا نوجوان ہے جس کی دماغی حالت چھو سات سال کے بچے کی سی ہے، اسے اپنی طبیعت پر بالکل قابو نہیں اور اپنی تربیت کی وجہ سے وہ انسانیت کی تمام فضیلتوں سے بالکل محروم رہ گیا ہے۔ اس کی ماں پر دستکودا کو حکومت کی ایسی ہوس ہے کہ وہ اسے یا اس کے باپ کو کسی قسم کی آزادی دینا گوارا نہیں کر سکتی، شوہر کو اس کی ڈانٹ ڈپٹ نے ایسا سہا دیا ہے کہ وہ کسی معاملے میں رائے رکھنے کا حوصلہ ہی نہیں کرتا، اور مترو فان کو اس کے دلانے چھیننا اور احمق بنا دیا ہے۔ پروستکودا کے گھر کی حالت ڈرامے کے پہلے دو سین سے معلوم ہو جاتی ہے۔

پہلا سین

مترو فان، پروستکودا اور ایک خادمہ مترو فان ایک تازہ سلا ہوا کفتان پہنے ہے۔

پروستکودا: کفتان بالکل چوہٹ ہو گیا ہے (خادمہ سے) اے ری، جا ذرا اس بد معاش تربشکا کو بلاتو لا! مونے چوٹنے نے کفتان بالکل تنگ کر دیا ہے مترو فان بیٹے، میں تو سمجھتی ہوں تمہارا اس میں دم گھٹ رہا ہو گا۔ چہ ہجاریہ!

لے کفتان یا خفتان ایک طرح کا کوٹ جو اچکن سے بہت ملتا تھا۔

جاؤ، ذرا اپنے آبا جان کو بلا لاؤ۔ (متر و فان چلا جاتا ہی)

دوسرا سین

پروستکووا، تریشکا، خادمہ۔

پروستکووا: ابے گدھے، ادھر آ... میں نے تجھ سے کہہ دیا تھا کہ گفتان
ذرا ڈھیلا سینا، ایک تو بچہ ابھی خدا کے فضل سے بڑھ
رہا ہے، دوسرے اسے تنگ کپڑے پہننا نہیں چاہئیں،
اس کا بدن بہت نازک ہے۔ پھر بتا تو نے گفتان کیوں
تنگ کر دیا۔

تریشکا :- بی بی آپ تو جانتی ہیں میں درزی نہیں ہوں، آپ
کے حکم سے سینا شروع کیا ہی میں نے تو پہلے ہی عرض
کیا تھا کہ گفتان کسی اچھے درزی سے سلوائے۔

پروستکووا: تو کیا گفتان سینے کے لیے درزی ہونا ضروری ہے؟
تیری بھی کیا گائے بھینس کی سی سمجھ ہی!

تریشکا :- مگر سرکار درزی اپنا کام سیکھتے ہیں، میں نے تو کبھی کچھ
سیکھا نہیں۔

پروستکووا: تو تو بس اپنی رٹ لگائے ہی۔ ارے یہ تو بتا کہ اگر ایک
درزی نے دوسرے سے سیکھا تو آخر دنیا میں جو سب
سے پہلا درزی تھا اُسے کس نے سکھایا؟

تریشکا :- اگر اُسے کسی نے سکھایا نہیں تو وہ گفتان مجھ سے بھی بدتر

سیتا ہوگا۔ (مستروفان دوڑتا ہوا اندر آتا ہے)
 مستروفان: ابا جان کو بلا آیا ہوں۔ اُنہوں نے فرمایا: ابھی آتا ہوں۔
 لیجیے وہ آ بھی گئے۔ (پر دستکوف ڈرتے ڈرتے داخل
 ہوتا ہے)

پر دستکوف: یہ تم آخر مجھ سے چپے چپے کیوں رہتے ہو؟ ...
 دیکھو سرکار، آپ کی طبیعت کی ترمی نے مجھے کیا دن
 دکھائے ہیں۔ دیکھو ماموں کی منگنی کے دن بھانجے
 کو کس شان کا کفتان پہننا نصیب ہوا ہے! دیکھو تڑشکا
 نے کیا نفیس کفتان سیاہی!

پر دستکوف: (خوف سے پیچھے ہٹتے ہوئے) ہاں، کچھ ڈھیلا ہے۔

پر دستکوف: میاں عقلند، آپ خود ڈھیلے ہیں۔

پر دستکوف: مگر میں تو سمجھا تھا کہ آپ کا بھی یہی خیال ہے۔

پر دستکوف: مگر تم خود کیا اندھے ہو گئے ہو؟

پر دستکوف: آپ کی موجودگی میں میری آنکھیں نہیں دیکھتی ہیں۔

پر دستکوف: یا اللہ، مجھے بھی کیا شوہر ملا ہے! اتنی بھی سمجھ نہیں

کہ ڈھیلے اور تنگ میں تمیز کر سکے۔

پر دستکوف: مجھے ہمیشہ آپ کی رائے پر اعتبار رہا ہے اور رہے گا

پر دستکوف: جی، تو پھر یہ بھی سمجھ لیجیے کہ میں ان لونڈی غلاموں کو
 سر نہ چڑھاؤں گی۔ جائیے، اس لڑکے کو فوراً سزا دیجئے

(سکوتی نن، پروستکودا کا بھائی داخل ہوتا ہے)۔
 سکوتی نن: کسے سزا دیجیے؟ کیوں؟ خاص میری منگنی کے دن؟
 بہن، آپ سے التجا کرتا ہوں کہ سزا کو منگنی کے بعد تک
 ملتوی رکھیے... میرا نام ترا س سکوتی نن نہیں اگر میں
 کبھی کسی کو سزا دینے میں تامل کروں، اس معاملے میں
 بہن میری آپ ہی کی سی عادت ہے۔ لیکن آپ خفا
 کس بات پر ہوئیں؟

پروستکودا: دیکھو بھیا، تمہاری آنکھوں کے سامنے ہے۔ متر وفان
 پیارے، ادھر آؤ۔ دیکھو بھیا، یہ کفتان ڈھیلا ہے۔
 سکوتی نن: نہیں۔

پروستکوف: مگر بیگم میں نے تو خود کہا تھا تنگ ہے!
 سکوتی نن: مجھے تو وہ تنگ بھی نہیں معلوم ہوتا۔ کفتان تو بھی نہایت
 نفیس سلا ہے۔

پروستکودا: (تریشکا سے) دور ہو، مردود! (خادم سے) جا بچے
 کو ناشتہ کھلا، اس کے اُستاد آتے ہوں گے۔

”پیرنا بالغ“ کی ہیر دُن پروستکودا کی ایک رشتے کی بھتیجی سونیا
 ہے، جو اپنے والد کے انتقال کے بعد پروستکودا کے یہاں رہنے لگی اور
 وہیں اس نے تربیت پائی۔ سکوتی نن کی منگنی جس کا اوپر ذکر آیا
 ہے، اسی کے ساتھ ٹھہری تھی۔ ڈرامے کا اہل قصہ اس وقت سے

شروع ہوتا ہی جب پر دستکو واکو خبر ملتی ہے کہ سوفیا کو درشے میں دس ہزار روپے نقد اور ایک جائیداد ملنے والی ہے۔ سوفیا کے ساتھ اس کا برتاؤ ہمیشہ سے خراب تھا، لیکن یہ خبر سنتے ہی وہ اس پر نہایت مہربان ہو جاتی ہے اور کوشش کرتی ہے کہ وہ سکوتی نن کی بجائے متردفان سے شادی کر لے۔ سکوتی نن کی ساری عمر سو رہا کرتے گزری ہے، اور سوروں کے سوا وہ کسی موضوع پر گفتگو نہیں کر سکتا، لیکن روپے کے لالچ میں سوفیا سے اس کا برتاؤ نہایت نیازمند ہو جاتا ہے اور وہ خاندان والوں کو اس پر مجبور کرنا چاہتا ہے کہ سوفیا کی اس سے شادی کرادی جائے۔ بہن اور بھائی میں اپنی اپنی غرض پوری کرنے کے لیے جو مقابلہ ہوتا ہے اور ایک دوسرے کو زبردستی کو وہ جو چاہیں چلتے ہیں نہایت مضحکہ خیز ہیں۔ مگر بچا رہی سوفیا مصیبت میں پھنس جاتی ہے۔ اتفاق سے اس کا چچا ستار و دوم اس موقع پر آ پہنچتا ہے اور سوفیا کو پناہ مل جاتی ہے۔ ستار و دوم کے سامنے پر دستکو واکو اور سکوتی نن کے کچھ بنائے نہیں بنتا، اور آخر میں سوفیا اسی کے مشورے سے ایک خوش اخلاق اور روشن خیال نوجوان سے شادی کر لیتی ہے۔ پر دستکو واکو کی ناکامی اس کی تباہی کا پیش خیمہ ہوتی ہے، کیوں کہ جائیداد کو ساہوکاروں سے بچانے کی یہی صورت تھی کہ متردفان کی کسی امیر لڑکی سے شادی ہو جائے۔ سکوتی نن مایوس ہو کر پھر اپنے سوروں میں جا بیٹھتا ہے۔

”پیرنا بالغ“ کا موضوع نہایت مناسب ہی اور اس کے اکثر کیرکٹر اس کے زمانے کے روسیوں کی سچی تصویریں ہیں۔ لیکن مصنف نے واقعات کا سلسلہ ختم کرنے کے لیے بیان میں بہت عجلت کی ہے جو کبھی کبھی ناگوار معلوم ہوتی ہے اور ڈرامے کے بعض کیرکٹر اس طرح عین موقع پر نمودار ہوتے ہیں کہ ڈرامے کی حقیقت نگاری میں شبہ پیدا ہو جاتا ہے۔ نئے خیالات کی تبلیغ بھی جس انداز سے کی گئی ہے وہ ”پیرنا بالغ“ کو بحیثیت ڈرامے کے کم زور کر دیتی ہے اور اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مصنف کو اپنے قدر دانوں سے اس کی اُمید نہیں تھی کہ وہ اشارے اور کنایے سے بات سمجھ لیں گے اور سب کچھ تفصیل سے کہنے پر مجبور تھا۔ پروٹکووا اسکوئی نن اور متردفان روس کے دیہاتی شرفا کی ذہنیت کے عیب دکھانے کے لیے بہت کافی ہیں۔ ان کی سیرت کا نقشہ کھینچنے کے بعد اس کی ضرورت نہیں رہتی کہ اصلاح کی الگ سے ترغیب دلائی جائے۔ لیکن سوفیا کا چچا ستار دوم، جسے فون دیزن نے اپنے خیالات کا منبع بنایا ہے نہایت لمبی لمبی تقریریں کرتا ہے جن سے طبیعت اُکتا جاتی ہے اور ڈرامے کا ایک اچھا خاصا کیرکٹر ہماری نظروں سے گر جاتا ہے۔ دراصل ”پیرنا بالغ“ کا کوئی اچھا کیرکٹر اس خوبی سے نہیں دکھایا گیا ہے جیسے پروٹکووا یا اسکوئی نن۔ ہر ایک میں یہ نقص ہے کہ وہ خالص خوبیوں کا مجسمہ بنایا گیا ہے، اور ایک جیتی جاگتی ہستی

نہیں بلکہ مصنف کی ایجاد معلوم ہوتا ہے۔

”پیرنا بالغ“ کے بعد ایک مدت تک کوئی ایسا ڈراما نہیں لکھا گیا جو صحیح معنوں میں روسی کہا جاسکتا ہو۔ اور نے روت (۱۸۶۰-۱۷۹۹) کے ڈراموں میں رومانیت کے اثرات نظر آتے ہیں اور اگرچہ رومانیت بھی روس میں یورپی انشا پردازی کی تقلید میں اختیار کی گئی، اس میں قومی فطرت اور مذاق کے ظاہر ہونے کی خاصی گنجائش تھی اور نے روت نے اس وقت جب پولین سے جنگ ہو رہی تھی ایک قومی ڈراما، ”دستیری دون سکومی“ لکھا، جو نہایت مقبول ہوا، لیکن اصل ڈراما اور تاریخ دونوں کے لحاظ سے یہ بالکل مہمل ہے۔ کرلیوف جس کی کہانیاں اتنی مشہور ہوئیں، کئی سال تک ڈرامے کے میدان میں طبع آزمائی کرتا رہا، مگر اس کی طبیعت ڈراما نویس کے لیے بالکل ناموزوں تھی اور وہ فرانسیسی اور کامیاب روسی ڈراموں کی نقل سے آگے بڑھنے کی ہمت نہیں کر سکا۔ جو ترقی انیسویں صدی کے پہلے بیس سالوں میں ہوئی وہ ایکٹنگ اور اسٹیج تیار کرنے کے فن میں ہوئی۔ اس زمانے میں اچھے ایکٹروں کی ایک خاصی تعداد پتیر برگ اور ماسکوی پیدا ہو گئی اور فرانسیسی ڈرامے اور ان کی روسی نقلیں دونوں مقابلتاً بہت بہتر طریقے سے دکھائی جانے لگیں شیکسپیر کی قدر دانی بھی اسی دور میں شروع ہوئی اور یوں ایکٹروں کو اپنا کمال دکھانے کے لیے بہت موقع تھا۔

روسی سوسائٹی کا عکس اُتارنے اور روسیوں کو حقیقت سے آگاہ کرنے کا بیڑا الکساندر سرگے پوچ گریبیے دوت (۱۸۹۵-۱۸۹۶) نے اٹھایا۔ ”عقل مندی کی سزا“ حقیقت نگاری اور تنقید کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔ گریبیے دوت ایک رئیس خاندان میں پیدا ہوا اور اس نے بہت اچھی تعلیم پائی۔ ”عقل مندی کی سزا“ کا خاکہ اس کے ذہن میں طالب علمی کے زمانے ہی سے قائم تھا اور اس وقت سے ۱۸۹۶ تک جب ڈرا مکمل ہو گیا، وہ اسی کی تصنیف میں مشغول رہا۔ ۱۸۱۲ میں نپولین نے روس پر حملہ کیا اور گریبیے دوت وطن کو دشمن سے محفوظ رکھنے کے لیے فوج میں بھرتی ہو گیا۔ اس نے چار سال قوجی افسر کی زندگی بسر کی، یہاں اسے خلاف معمول صحبت بہت اچھی ملی، کیوں کہ وطن پرستی کے جوش میں تعلیم یافتہ طبقے کے بہترین نوجوان فوج میں بھرتی ہو گئے تھے۔ گریبیے دوت نے اس صحبت سے پورا فائدہ اٹھایا اور اس کے ڈرامے کے بصیرت افروز خیالات اسی زمانے کی یادگار ہیں۔ ۱۸۱۶ میں گریبیے دوت نے اپنی ماں کے اصرار پر وزارت خارجہ میں ملازمت کر لی، اور دو سال بعد روسی سفیر کا سکرٹری ہو کر طہران چلا گیا۔ یہاں اس نے فارسی سیکھی، ایران کی خوب سیر کی اور اپنی خوش مزاجی اور شرافت کی وجہ سے دربار میں بھی ہر دل عزیز ہو گیا۔ مگر وہ بہت سچا اور مخلص، یعنی نہایت ہی خود غرض وطن پرست تھا اور ہم وطنوں کی حمایت کے سلسلے میں اسے بہت کچھ کرنا پڑا جو شاہ ایران

اور اس کے دلی عہد عباس مرزا کو بہت ناگوار معلوم ہوا۔ ۱۸۲۱ء میں گریجویٹ
دو فٹ تفلنس آیا اور چوں کہ علاج کی غرض سے کچھ عرصے وہیں رہنا تھا اس
لیے اس نے قفقاز کے گورنر کے مشیر کا عہدہ حاصل کر لیا اور یہ خدمت بھی
بہت تن دہی اور سلیقے سے انجام دی۔ کوئی تین سال بعد وہ رخصت
لے کر روس آیا اور اپنے دوستوں کو ”عقلمندی کی سزا“ جو اس نے تفلنس
کے قیام کے دوران میں ختم کر لیا تھا، دکھایا۔ ڈراما بے حد پسند کیا گیا،
لیکن کوشش اور سفارشنوں کے باوجود دفتر احتساب نے اسے ٹھیکڑ میں
دکھانے کی اجازت نہیں دی۔ گریجویٹ دو فٹ رخصت کے بعد تفلنس
والبس ہوا اسی تھا کہ پتر برگ میں ۱۸۲۵ء کی مشہور بغاوت ہوئی اور اس
کی گرفتاری کا حکم بھی جاری ہوا۔ اس کی خبر گریجویٹ دو فٹ کو ایک
دوست کے ذریعے سے مل گئی تھی اور جب پولیس والے تلاشی لینے آئے
تو وہ کل کاغذات جن سے اس کا باغیوں سے تعلق ظاہر ہوتا تھا جلا چکا
تھا۔ پھر بھی وہ گرفتار کر کے پتر برگ بھیجا گیا اور ایک سال کے قریب
قید رہا۔ قید سے چھوٹا تو وہ قفقاز میں اپنے پُرانے عہدے پر دوبارہ
مامور ہو گیا اور روس اور ایران کی جنگ میں جو اسی زمانے میں پھڑکنی
اس نے بہت حصہ لیا۔ جنگ کے ختم ہونے پر وہ روس کی طرف سے
صلح کے شرائط منظور کرانے کو ایران بھیجا گیا۔ ان شرائط نے ترکمان
چائی کے صلح نامے کی صورت اختیار کی جس کے روسے ایران کے
ایک بہت زرخیز علاقے پر روس کا قبضہ ہو گیا اور اس کو ایران کے

اندر دنی معاملات میں دخل دینے کا حق بھی حاصل ہو گیا۔ صلح کے بعد گریو بے دو ف چند مہینے کے لیے روس آیا اور پھر روسی سفیر کی حیثیت سے طہران گیا۔ اسے معلوم تھا کہ عباس مرزا، شاہ ایران، ترکمان چانی کے صلح نامے کا بدلہ ضرور لے گا اور وہ طہران ہی سمجھ کر گیا تھا کہ شاید ہی زندہ واپس آنا ہو۔ چنانچہ ہوا بھی ایسا ہی۔ ایک روز شہر کے غنڈوں کی ایک فوج نے اس کے مکان کو گھیر لیا اور اندر گھس کر اسے مار ڈالا۔

سرکاری ملازمت کی وجہ سے گریو بے دو ف کو ادبی مشاغل کے لیے بہت کم مہلت ملتی تھی۔ ”عقلمندی کی سزا“ کے علاوہ اس نے صرف ایک ڈراما اور لکھا جس کا آخری حصہ گم ہو گیا ہی۔ اس وقت اس کی نسبت صرف اتنا کہا جاسکتا ہے کہ جن لوگوں نے پورا ڈراما پڑھا ان کا بیان ہے کہ وہ بہت اچھا تھا۔ گریو بے دو ف کی قبل از وقت موت سے روسی ادب کو بہت نقصان ہوا۔ مگر اس کا نام زندہ رکھنے کو ”عقلمندی کی سزا“ بہت کافی ہے۔

یہ ڈراما نظم میں ہے، لیکن روسی نقاد سب اس پر متفق ہیں کہ نظم میں ہونے کے باوجود وہ ماسکو کی عام بول چال کی زبان کا بہترین نمونہ ہے۔ اس کی ظرافت بھی بے مثل ہے اور اس کی ہر دل غزنی کا بہترین ثبوت یہ ہے کہ اس کے سینکڑوں فقرے مدتوں تک ہر روسی کی زبان پر رہے۔ اس کا قصہ بھی ایسا ہی جسے صرف اس زمانے کی نہیں بلکہ ہر وقت اور تقریباً ہر قوم کے تعلیم یافتہ اور خوش حال طبقے کی

زندگی کا آئینہ کہا جاسکتا ہو اور دیکھنے والا اس کے کیر کڑھر جگہ دیکھ سکتا ہو۔ فاموسوف، جو کسی محکمے میں ایک اعلیٰ عہدہ دار ہے، ہر وقت اپنی لڑکی سوفیا کے واسطے شوہر کی تلاش میں رہتا ہے اور یہ فرض اس پر بہت گراں گزرتا ہے۔ اس کی لڑکی سوفیا کو مگر کسی بات کی فکر نہیں رات کو دیر تک وہ عشق کے فسانے اور جذبات کو بھڑکانے والے فرانسیسی ناول پڑھتی رہتی ہے، دن کے دو پہر گزر جاتے ہیں تو سوکر اٹھتی ہے اور لوگوں سے ملنے ملانے چلی جاتی ہے۔ اس کی کل روحانی فروزا ناولوں کے مطالعے سے پوری ہو جاتی ہیں اور جب جی چاہتا ہے تو وہ اپنے باپ کے سکریٹری مولچالین کو دل بہلانے کے لیے اپنے پاس بلا لیتی ہے۔ مولچالین کو اس سے کوئی محبت نہیں، وہ صرف اپنی ترقی کے واسطے ضروری سمجھتا ہے کہ اپنے آقا کی لڑکی کو خوش رکھے۔ اس وجہ سے وہ سوفیا کے کمرے میں جا کر بیٹھتا ہے اور عجز و نیاز کی باتیں کرتا ہے مگر موقع ملتا ہے تو سوفیا کی خادمہ لیزا کو پیار کرنے کی کوشش کیا کرتا ہے۔ فاموسوف کے ملنے والوں میں ایک فوجی افسر سکا لوزوب ہے، جس سے وہ اپنی لڑکی سوفیا کی شادی کرنا چاہتا ہے، مگر سکا لوزوب سوفیا کو ایک آنکھ نہیں بھاتا، کیوں کہ وہ ہر وقت فوجی معاملات پر گفتگو کرتا رہتا ہے اور فوجی معاملات کے سوا اور کچھ اس کی سمجھ میں آتا نہیں۔ سکا لوزوب کے علاوہ فاموسوف کے اور بہت سے معزز لوگوں سے مراسم ہیں، بیگم

تو گواخوف سکی، جن کی چھوڑ کیاں ہیں اور جو ہر شخص کو اس نظر سے دیکھتی ہیں کہ وہ ان کا داماد بن سکتا ہے یا نہیں، ان کے یہاں اکثر آتی ہیں، اسی طرح زگورٹ سکی، رے پے تی لوف، وغیرہ بھی جو ملازم ہیں اور ترقی کی ترکیبیں سوچتے رہتے ہیں۔ اس گروہ میں جہاں ہر شخص کی نظر محدود اور خیالات تنگ ہیں، ڈراما کا ہیر و چاٹ سکی پہنچ کر ایک طوفان برپا کر دیتا ہے۔ وہ بچپن میں سو فیہ کے ساتھ کھیلا کرتا تھا، سو فیہ سے اسے محبت تھی، لیکن کچھ صحت کے خیال سے اور کچھ سیر و سیاحت کے شوق میں زیادہ تر ماسکو اور اپنے بچپن کے ماحول سے دور رہا، اور کئی سال غائب رہنے کے بعد اس ارادے سے واپس آیا ہے کہ اگر ممکن اور مناسب ہو تو سو فیہ سے شادی کر لے۔ اپنے ہم وطنوں کی تنگ نظری اور غفلت سے اسے شکایت پہلے سے تھی، مگر اس مرتبہ یہ قومی عیب اس کو ناقابل برداشت معلوم ہونے لگے اور اس کی زبان، جو ہمیشہ سے تیز اور اس کے قابو سے باہر تھی، عیب جوئی کرنے اور زہر اگلنے سے ایک لمحہ بھر بھی باز نہیں رہتی۔ پہلے ہر جگہ سب اس کی آؤ بھگت کرتے ہیں، کیوں کہ وہ رئیس ہے، اور اس کی شادی نہیں ہوئی ہے، مگر اس کی زہر بلی اور خطرناک باتیں سب کو بہت جلد نیرا کر دیتی ہیں۔ چاٹ سکی خود برداشتہ خاطر ہے اور جب اسے سو فیہ کے چال چلن کی خبر ہو جاتی ہے تو ماسکو کی زندگی سے اس کا آخری رشتہ ٹوٹ جاتا ہے۔

ڈرائے کے آخر میں، جب فاموسوف نے ایک دعوت دی ہر اور اس کے تمام دوست آشنا جمع ہیں، چاٹ سکی ایک لمبی تقریر میں اپنی ساری نفرت اور بیزاری بیان کر کے چل کھڑا ہوتا ہے اور ارادہ کر لیتا ہے کہ پھر کبھی ماسکو کی صورت نہ دیکھوں گا۔ فاموسوف کے یہاں، جو چاٹ سکی کا مطلب نہیں سمجھ سکے ہیں اور اس کے اچانک غائب ہو جانے کی اصل ہیں، اس کی تاویل یوں کرتے ہیں کہ اسے پولیس نے گرفتار کر لیا ہے اور پھر مبالغہ غلط فہمی اور غیبت کا شوق ایک حیرت انگیز طریقے سے انھیں یقین دلادیتا ہے کہ چاٹ سکی دیوانہ ہو گیا ہے۔

مہذب اور تعلیم یافتہ لوگوں میں ایک ایسے شخص کا جو بلند حوصلہ، روشن ضمیر اور بیدار دل ہے، بلاوجہ دیوانہ قرار پانا مصنف کی طرف سے ان لوگوں کی ایسی سخت تنقید ہے جس کے مقابلے میں خود چاٹ سکی کے اعتراض ہلکے اور معمولی نظر آتے ہیں۔ اس کے بعد چاٹ سکی کی عذر خواہی کرنا ضروری نہیں۔ لیکن چاٹ سکی کے خیالات اور اس کی مہمت کی داد دیتے ہوئے ہمیں اس کی اپنی خامیوں سے چشم پوشی نہیں کرنا چاہیے، اور مصنف کا مقصد بھی یہ نہیں معلوم ہوتا کہ ہم ایسا کریں۔ چاٹ سکی کا معیار بلند ہے، اس کے خلوص سے انکار نہیں کیا جاسکتا، اس کا درد سچا اور دل سوز ہے، مگر اس کے خیالات کا تعمیری پہلو بہت کم زور ہے، وہ سب کچھ درہم برہم کرنے پر تکیا ہوا ہے، کچھ بنا کر کھڑا کرنے کا اہل نہیں۔ اس نے ارادہ کر لیا ہے

کہ نوکری، خوشامد، خود پسندی اور حیوانی سکون سے اپنی زندگی کو پاک رکھوں گا، مگر اس کی زندگی بس ایک صاف مکان ہے جس میں رہتا کوئی نہیں۔ گر بیویے دوت اپنے ہیرو کی اس کم زوری سے بخوبی واقف ہے اور جس طرح چاٹ سکی کے اعتراض عبرت انگیز اور دل افروز ہیں، اسی طرح اس کی خامیاں بھی حقیقت کی ایک سبق آموز اور پُر درد تصویر بن جاتی ہیں۔ جس حقیقت کو یہ ڈراما واضح کرتا ہے دراصل یہ ہے کہ روسی سوسائٹی کے معترض اور مصلح اتنے ہی بے بس اور مجبور ہیں جتنے کہ وہ لوگ جو ان کی ظرافت اور طنز کا تختہ نشین ہوتے ہیں، اور یہی حقیقت کی وہ تصویر ہے جسے دیکھ کر ہنسی بھی آتی ہے اور رونام بھی آتا ہے۔

”عقل مندی کی سزا“ کی تصنیف کے بعد سے ۱۸۳۵ء تک جب گوگول کا ڈراما ”انسپیکٹر جنرل“ شائع ہوا، ڈراما نویس کا کوئی اچھا نمونہ نہیں ملتا۔ لیکن کے ”پورس گو دوت“ میں شاعرانہ خوبیاں بہت ہیں، مگر ڈرامے کی حیثیت سے وہ بہت معمولی ہے۔ گوگول کے ڈراموں کا اس کی تصانیف کے سلسلے میں پہلے ذکر آچکا ہے، اس کی خصوصیت جس کا روسی ٹھیٹر اور ناولٹک کے فن پر بہت گہرا اثر ہوا، یہ تھی کہ اس نے ایکٹروں کا ایک دوسرے سے اور ان سب کا ڈرامہ نویس سے ایسا تعلق قائم کرنے کی کوشش کی جس سے ڈرامے کا مطلب، اس کی خوبیاں اور باریکیاں پوری طرح سے

ظاہر ہو سکیں، ایکٹر بجائے اپنا اپنا کمال دکھانے کے ڈرامے کی خاص فضا پیدا کرنے کی طرف متوجہ ہوں، اور مختلف کیرکٹروں کی ہم آہنگی ان کا معیار بن جائے۔ ”عقل مند ی کی سزا“ کو تو بہت عرصے تک محکمہ احتساب نے اسٹیج پر دکھانے کی اجازت نہیں دی، لیکن گولگول کے ڈرامے اور بیرونی ڈراما نویسوں کے چند منتخب کارنامے ہاسکو میں ایک ایسے ٹھیٹر کا کام چلانے کے لیے کافی تھے جس نے گولگول کے معیار کو اختیار کیا تھا۔ ایکٹروں کو اس تیاری کی بہت ضرورت تھی، کیوں کہ گولگول کے بعد جو ڈراما نویس پیدا ہوا اس کے ڈراموں کا حق ادا کرنا کوئی آسان کام تھا۔

دوسرا باب

اوس تروفنگی

فن ڈراما نویس کا یہ استاد روس کی ان چند ادبی شخصیتوں میں سے تھا جنہیں اطمینان سے زندگی بسر کرنا نصیب ہوا۔ اور اس کی عمر ایک گہرے دریا کے دھارے کی طرح آہستہ اور خاموش بہتی ہوئی گزر گئی۔ اس نے شہرت حاصل کی، مگر اس کی کبھی دھم نہیں مچی، وہ بے چینی کی کیفیتیں جو اس نے اپنے ڈراموں میں انتہائی نفاست اور نکتہ بینی سے پیش کی ہیں۔ اس کے اپنے روحانی سکون میں کوئی خلل نہیں ڈال سکیں اور اگر ہم یہ نہ بھی مانیں کہ اس کا دل پیچ و تاب سے بالکل ناآشنا رہا، تو بہر حال اس کی سیرت کا توازن ایسا تھا جس کو درد اور تلخ تجربے بگاڑ نہیں سکے۔

وہ ۳۱ مارچ ۱۸۷۷ء میں پیدا ہوا۔ اسکول اور یونیورسٹی میں اس نے کسی غیر معمولی قابلیت کا ثبوت نہیں دیا۔ دو چار نظمیں جو اس نے اس زمانے میں لکھیں بڑی نہیں ہیں، مگر اس کے

افسانوں کو کسی نے نہیں پوچھا۔ شاعری اور افسانہ نویسی کے میل جول میں طبع آزمائی کرنا اس نے خود ہی چھوڑ کر ڈراما نویسی کی مشق شروع کی اور اسی کا اسے سچا شوق بھی تھا۔ اس کی تعلیم ختم نہیں ہوئی تھی کہ اسے ایک عدالت میں ملازمت مل گئی، جہاں وہ دنیا کے کاروبار کو اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتا تھا، اور یہی مشاہدہ اور معلومات اس کے لیے محرک بنیں اور موضوع فراہم کرتی رہیں۔

۱۸۸۷ء میں اس نے ”اپنے لوگ ہیں“ آپس میں سمجھ لیں گے کے عنوان سے ایک مختصر اور نامکمل منظروں کا مجموعہ ماسکو کے ایک رسالے میں شائع کیا، اور پھر اسے مکمل کر کے اپنے ایک پروفیسر کے مکان پر ایسی محفل میں پڑھ کر سنایا جس میں ماسکو کے بشیر مشہور ادیب موجود تھے۔ پروفیسر خود بہت صحیح اور اعلیٰ مذاق رکھتا تھا، اس نے فوراً اس تروف سکی کی قدر پہچان لی اور محفل میں کوئی ایسا نہیں تھا جسے یقین نہیں ہو گیا کہ اس تروف سکی روسی ڈرامے کو ایسی بلندی پر پہنچائے گا جو اسے پہلے کبھی نصیب نہ ہوئی تھی اور روسی ادب کے باغ میں نئے پھول کھلنے والے ہیں۔ اس تروف سکی کا یہ ڈراما شائع تو ہو گیا، لیکن محکمہ اعتبار نے اسے اسٹیج پر دکھانے کی اجازت نہیں دی، پھر بھی نوجوان مصنف نے ہمت نہیں ہاری اور اپنی مشق کو جاری رکھا۔ ”غریب کنواری“، ”مغلسی عیب نہیں“، ”پرائی گاڑی میں کیوں بیٹھو“ اور ”اپنی ہی مرضی پر

مت چلو“ کے بعد دیگرے شایع ہوئے (۱۸۵۱-۱۸۵۴)۔ ۱۸۵۳ء میں محکمہ احتساب سے چند ترمیموں کے بعد اسے ”اپنے لوگ ہیں، آپس میں سمجھ لیں گے“ ایسٹج پر دکھانے کی منظوری مل گئی۔ اس کے بعد سے اوس تروف سکی تقریباً ہر سال ایک نیا ڈراما لکھتا رہا اور وہ تماشا یوں میں اس قدر ہر دل عزیز ہو گیا تھا کہ اس کے ڈرامے ٹھیٹروں میں دکھائے بھی جاتے رہے۔ ٹھیٹروں کے مالکوں اور منتظموں سے ناراض ہو کر اس نے کچھ عرصے تک اپنا خاص طرز چھوڑ دیا اور تاریخی ڈرامے لکھنا شروع کیا، مگر سلسلہ ع کے بعد پھر اپنے پُرانے ڈھڑے پر آگیا اور آخر تک اسی پر قائم رہا۔

۱۸۴۰-۴۱ میں اوس تروف سکی نے اطالیہ کا سفر کیا۔ اس ملک کو روسی انشا پر داز باغ ارم سمجھتے آئے تھے اور اس کی سیر کہہ ناں کی معراج تھی، اکثر پر اطالیہ کے مناظر اور آثار قدیمہ نے گہرا اثر کیا اور ان کے دلوں میں ہزاروں نئی امنگیں پیدا کر دیں۔ جرمن شاعر گوٹے کی زندگی اور فلسفے کا ایک نیا دور اس زمانے سے شروع ہوتا ہے جب وہ اطالیہ گیا اور وہاں کے کھنڈروں سے اس نے انسانیت کی جدوجہد اور سرگزشت کی ایک نئی بصیرت افروز داستان سنی لیکن اوس تروف سکی پر اطالیہ اور اس کے جادو کا مطلق اثر نہیں ہوا۔ اس نے عمارتیں دیکھیں، سیر کی، مگر سفر کے حالات اور آثار قدیمہ کی تعریف اس نے جس انداز سے

اور جن معمولی روزمرہ الفاظ میں کی ہو وہ صاف ظاہر کر دیتے ہیں کہ اطالیہ اور یورپ کی قدیم تہذیب اسے گرویدہ نہیں کر سکی۔ اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ بے حس تھا، یا اطالیہ کے مناظر اور ان کیفیتوں کا جو یہ مناظر پیدا کرتے ہیں پورا حق ادا کرنا اس کی بساط سے باہر تھا۔ اس تروف سکی سچا روسی تھا اور اسے روسی سیرت، طرز معاشرت اور فلسفہ حیات سے ایسا لگاؤ تھا کہ یورپی تہذیب سے فریفتہ ہونا تو درکنار اس سے متاثر اور مرعوب ہونے کا بھی کوئی امکان نہیں تھا۔ اس کا یہ ذہنی رجحان اس کے ڈراموں کی سب سے نمایاں خصوصیت ہو اور جب تک اس کا پورا لحاظ نہ کیا جائے، ہم اس کا اصل مطلب اور نقطہ نظر صحیح طور پر سمجھ نہیں سکتے۔

اوس تروف سکی نے کل چوالیس ڈرامے لکھے، جو موضوع کے لحاظ سے تین حصوں میں تقسیم کیے جاسکتے ہیں۔ پہلا حصہ وہ ہے جس میں ۱۸۶۱ء سے پہلے کا طرز معاشرت اور روسی سیرت کا وہ خاص رنگ جو اس معاشرت کا ایک حد تک نیچہ قرار دیا جاسکتا ہے، دکھایا گیا ہے۔ یہ دور ۱۸۶۰ء کے قریب ختم ہوتا ہے۔ اس کے بعد اوس تروف سکی نے حقیقت نگاری ترک کر کے تاریخی ڈرامے لکھنا شروع کیا اور کوئی دس سال تک زیادہ تر تاریخی سیرتیں اور واقعات اس کا موضوع رہے۔ یہ اس کے ڈراموں کا دوسرا

حصہ ہیں۔ ۱۸۷۰ کے بعد پھر وہ معاصر زندگی اور مسائل کی طرف متوجہ ہوا اور اس کی تصانیف کے تیسرے دور کا پس منظر ۱۸۶۱ کی اصلاحوں کا پیدا کیا ہوا طرز معاشرت اور فلسفہ حیات ہی اور اس کا موضوع وہ انوکھی طبیعتیں اور نفسیات کے گہرے اور سمجیدہ مسائل ہیں جو اس وقت ظہور میں آئے۔

اوس تروفسکی نے جب لکھنے کو قلم اٹھایا تو اس کے ذہن پر ان لوگوں کی سیرتیں حاوی تھیں جن سے اس کا ان عدالتوں میں سابقہ پڑا جن میں وہ نوکر تھا اور سب سے پہلے اس نے انھیں سیرتوں کا عکس بھی اُنارہ۔ یہ سیرتیں زیادہ تر تاجروں کی تھیں، جن کا ہندوستان کی طرح روس میں بھی عام طور سے سوسائٹی کے بقیہ حصے سے الگ طبقہ تھا، اور ان کا اپنا طرز معاشرت اور ایک بالکل جداگانہ فلسفہ حیات تھا۔ یہ طبقہ اب تک انشا پردازوں کی توجہ اور حقیقت نگاروں کی پردہ درمی سے بالکل محفوظ رہا تھا اور جب اوس تروفسکی نے اس کی زندگی پر ایک بارگی تیز روشنی ڈالی تو بہت کچھ نظر آیا جسے دیکھ کر بھی یقین کرنا مشکل تھا۔ اوس تروفسکی کے پہلے ڈرامے پڑھ کر خیال ہوتا ہے کہ اس نے جدت کے شوق میں چلتا رستہ چھوڑ کر ایک نیا ڈھنگ اور تازہ موضوع محض اس نیت سے اختیار کیا کہ لوگوں کی توجہ اپنی طرف جلد منتقل کرے اور ان کی نادافینیت سے فائدہ اٹھا کر اپنے آپ کو تنقید اور اعتراضات سے

بچائے رکھے۔ لیکن اوس تروف سکی کا مقصد اپنے ناظرین اور نقادوں کو حیرت میں ڈالنا نہیں تھا، اور اس کے وہ یورپ دوست مداح جو سمجھ بیٹھے تھے کہ وہ تاجروں کی زندگی اس غرض سے عام نظروں کے سامنے پیش کر رہا ہے کہ ان کی اصلاح کی ترکیبیں سوچی جائیں بہت جلد اپنی غلطی سے آگاہ ہو گئے۔ اوس تروف سکی کا مقصد صرف زندگی کی تصویریں اور جیتی جاگتی ہستیوں کو ان کے اصل ماحول میں دکھانا تھا اور اس نے تاجروں کو سب سے پہلے اپنا موضوع اس لیے بنایا کہ اس کی نظر سب سے پہلے انھیں لوگوں پر پڑی۔ اس دور کے بعض ڈرامے ایسے ہیں جن میں زمینداروں کی زندگی دکھائی گئی ہے، اور گو وہ انوکھی اور نرالی سیرتیں جو خاص طور پر تاجر طبقے میں پائی جاتی تھیں اوس تروف سکی کے ڈراموں میں آخر تک ملتی ہیں، اس کا ہرگز ارادہ نہ تھا کہ اپنے میدان کو تاجروں کی زندگی تک محدود رکھے۔

تاریخی ڈراموں کی تصنیف کے بعد جب اوس تروف سکی نے پھر معاصر حالات کی طرف رجوع کیا تو زندگی کا نقشہ بالکل بدل گیا تھا، کسانوں کے آزاد ہو جانے سے زمینداروں کی آمدنی میں بہت کمی پڑ گئی تھی، اور کمی پوری کرنے کے لیے انھیں اپنی نوابی چھوڑ کر سب معاش کے عام مقابلے میں شریک ہونا پڑا۔ اسی طرح تاجروں نے بھی نئے حالات دیکھ کر اپنی وضع بدلی اور اپنے کاروبار

اور تعلقات کا دائرہ وسیع کیا۔ یوں ان دونوں طبقوں کے درمیان جو دیوار حائل تھی وہ گر گئی، ان کے ایک دوسرے سے مراسم ہو گئے، آپس میں شادی بیاہ ہونے لگے اور وہ تفریق جسے پہلے دونوں قائم رکھنے پر مصر تھے خود بخود مٹ گئی۔ اصلاحوں نے انفرادی آزادی اور حقوق میں بھی بہت اضافہ کر دیا، خصوصاً عورتوں کے حقوق میں، اور پرانا فلسفہ حیات جس نے عورتوں کی زندگی اور دلچسپیوں کو بہت محدود رکھا تھا، رد کر دیا گیا، مگر اس کے ساتھ ہی بہت سے معیے اور پیمائیاں پیدا ہو گئیں جن کے حل کرنے کی کوئی صورت نہ تھی۔ اس وقت کے اہم معاشرتی اور روحانی مسائل میں سے اس تروڑ سکی نے کسی کو نظر انداز نہیں کیا، اور وہ ہر مسئلے پر اپنی رائے رکھتا تھا، مگر نصیحت یا کسی خاص خیال کے پرچار کو اپنا فرض نہیں سمجھتا تھا۔ جس طرح پہلے وہ بغیر اپنی رائے ظاہر کیے اور بغیر کسی کو بُرا بھلا کہے تاجروں کی معاشرت اور ان بگڑی طبیعتوں کو جو اس معاشرت میں گندے پانی کے کیرڑوں کی طرح نمودار ہو رہی تھیں دکھاتا تھا، ویسے ہی اس نے نئے حالات اور نئے ماحول میں جو لوگ اور جو مسائل قابل غور معلوم ہوئے انھیں ہوہونا ظہرین کے سامنے پیش کر دیا اور اپنی طرف سے ان کی رائے پر اثر ڈالنے کی ذرا بھی کوشش نہیں کی۔

اوس تروڑ سکی کے خیال میں روسی طرز معاشرت کوئی ناپائیدار چیز نہیں تھی جس کی طرف زیادہ توجہ کرنا یا جسے زیادہ اہمیت دینا

بے کار یا غلط ہو۔ وہ قوم پرست مگر جدت کے فدائی لوگوں کی طرح صرف اصلاح کی گنجائش نکالنے یا اس کی ضرورت ثابت کرنے کی فکر میں بھی نہیں تھا۔ اپنے ایک خط میں وہ لکھتا ہے: ”بہتر یہی ہے کہ روسی اپنے ہم شکل اور ہم صفت لوگوں کو ایسٹج پر دیکھ کر خوش ہوں اور اپنی مشاہدے کی خواہش پوری کریں، مصلح تو انھیں ہمارے علاوہ بھی بہت سے مل جائیں گے۔ جو کوئی یہ نہ ثابت کر سکے کہ وہ ان کی نسبت اچھی باتیں بھی جانتا ہے اور کہہ سکتا ہے وہ ان کی اصلاح نہیں کر سکتا۔ صرف توہین کرتا ہے۔“ جیسا کہ اوپر مضمنا بیان ہوا ہے، اوس تردیف سکی کو روسی طرز معاشرت اور فلسفہ حیات سے سچا اور گہرا لگاؤ تھا اور وہ ان دونوں کی تعظیم کرتا تھا۔ گو اسے روسی طرز معاشرت سے محبت تھی اور وہ ان اصولوں کو ماننا تھا جو صدیوں سے روسی قوم کی رہبری کرتے آئے تھے، اس محبت اور عقیدت نے اُسے تعصب و عصب پوش یا طرف داری پر مائل نہیں کیا۔ اس کی آنکھوں سے نہ وہ داغ دیکھے چھپے رہے جو روسی سوسائٹی پر لگ گئے تھے، نہ وہ روگ جنھوں نے روسیوں کو پست اور انسانیت کے فرائض سے غافل کر دیا تھا، اور اس نے اپنے ڈراموں میں صاف گوئی بلکہ عیب منائی میں کبھی تاثر نہیں کیا۔ لیکن اس کا عقیدہ تھا کہ زندگی کی ایک خاص شکل ہونا چاہیے جو قومی سیرت کے مناسب ہو اور اسی لحاظ سے اس کو قدیم روسی طرز معاشرت تشکیل زندگی کی ایک نہایت کامیاب کوشش معلوم ہوئی۔

پیتراغلم کی اصلاحوں نے اوس تروف سکی کے زمانے تک قدیم طرز معاشرہ اور فلسفہ حیات بس نام کو باقی چھوڑا تھا اور وہ بھی تاجروں کے طبقے میں۔ اوس تروف سکی نے اسی کی سرپرستی شروع کی اور نکتہ چینی کے ساتھ اس کی حمایت بھی کرتا رہا، کیوں کہ اپنی بڑائیوں کے باوجود وہ ایک قدیم مسلک تھا اور روسیوں کے لیے اس پر چلنا بہتر تھا بہ نسبت اس کے کہ وہ اپنی خود داری اور انفرادیت سے ہاتھ دھو کر یورپ کی اندھا دھند تقلید کریں اور بعد کو پھٹائیں۔ اوس تروف سکی اصلاح چاہتا تھا مگر ایسی نہیں جو زندگی کو بالکل بے اصول اور بے شکل کر دے، تاریخ اور روایات کا سلسلہ بالکل توڑ دے اور سلامت روی بلکہ اخلاق کی تعلیم ہی ناممکن کر دے۔ ۱۸۶۱ کے بعد جب پُرانی روش ایک بڑی اور تکلیف دہ عادت کی طرح ترک کر دی گئی، تو اوس تروف سکی نے اس کا ماتم نہیں کیا، نئے حالات سے کوئی نارضا مندی نہیں ظاہر کی اور نئی فضا کو بلا تکلف اپنی حقیقت نگاری کا موضوع بنالیا۔ پہلے وہ ذراتنگ معنوں میں حقیقت نگار تھا اور خاص روسی طرز معاشرت کا اپنے ڈراموں میں عکس اُتارنا چاہتا تھا، آخری دور میں وہ وسیع معنوں میں حقیقت نگار بن گیا، اور بغیر ماحول کی بدلتی ہوئی کیفیتوں کو نظر انداز نہ کیے، ان مسائل پر بحث کرنے لگا جو انسانی زندگی کا ایک لازمی جزو ہیں، اور جنہیں قوموں کی تقدیر پھیرایا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ آخری دور میں نہ کوئی ایسے اصول تھے نہ کوئی ایسا فلسفہ جس کی

طرف وہ قلبی یا ذہنی اور اخلاقی گتھیاں سلجھانے کے لیے اشارہ کرتا ہیں اس کے ڈرامے دل میں کوئی بے چینی نہیں پیدا کرتے اور جہاں اس کی نظر جن جن کردہ تمام خامیاں نکالتی رہی جو نئے دور کے لوگوں میں تھیں اور اس کی عاقبت اندیشی ان خدروں سے آگاہ کرتی رہتی رہی جن میں نیا طرز معاشرت لوگوں کو ڈال رہا تھا، وہاں اس کی انسانی ہمدردی کبھی ساتھ نہیں چھوڑتی اور ہر پریشانی اور درد کے لیے وہ کوئی نہ کوئی دوا بھی تجویز کرتا رہتا ہے۔ اسے نئے دور کے لوگوں سے، ان سیرتوں سے جو اس وقت ظہور میں آئیں، اتنی ہی محبت تھی جتنی پہلے دور کے لوگوں سے، اگرچہ طرز معاشرت اور فلسفہ حیات کی تبدیلی نے دنیا میں زمین آسمان کا فرق پیدا کر دیا تھا، اور یہ محبت اس کے ڈرامے آخر وقت تک ظاہر کرتے ہیں۔

اوس تروف سکی کے خیالات، اُس کا اخلاقی اور سماجی فلسفہ اس وجہ سے خاص اہمیت رکھتا ہے کہ اُس کے فن پر اس کا ہت اثر پڑا۔ کسی ڈرامے کی جب تنقید کی جاتی ہے اور اس کی خوبیاں و اندازہ لگایا جاتا ہے تو ہم پہلے یہ دیکھتے ہیں کہ جن مسائل پر اس میں بحث کی گئی ہے ان کی اہمیت کیا ہے اور جس طریقے سے وہ پیش کیے گئے ہیں وہ ان کی اہمیت اور مصنف کا مطلب پورے طور پر واضح کر دیتا ہے یا نہیں۔ سیرتیں اور سیرت کشی، مکالمے کی دلچسپی اور بقیہ فی نکات بعد کو دیکھے جاتے ہیں، مگر اوس تروف سکی کے ڈرامے

جا بچنے کے لیے ایک اور ہی معیار کی ضرورت ہے، کیوں کہ اس کے ڈراموں میں بظاہر نہ کوئی مقصد نظر آتا ہے نہ کوئی خاص پلاٹ۔ اگر وہ مصلح ہوتا تو خاص معاشرتی مسائل یا عیبوں کو ڈرامے کی شکل دے کر ناظرین کو حقیقت سے آگاہ کرتا اور انہیں اصلاح پر آمادہ کرتا، یا وہ نیکسیر کی طرح انسانی سرگزشت کو جذبات کا کھیل یا تقدیر کا تماشا جان کر سبق آموز اور عبرت انگیز یا پُر لطف داستانیں سُنا تا۔ اس تروف سکی کو یہ دونوں طریقے گوارا نہ تھے، لیکن اس نے جو زلا طرنہ اختیار کیا وہ ڈراما نویسی کے عام اسلوب سے ہرگز گرا ہوا نہیں اور بعض لحاظ سے بہتر ہی ہے۔

اس تروف سکی مصلح نہیں تھا اور جن مسائل پر اس نے جا بجا بحث کی ہے وہ بھی اس طرح سے نہیں پیش کیے گئے ہیں کہ وہ ڈرامے کا مقصد کہے جاسکیں، کیوں کہ وہ سمجھتا تھا کہ زندگی کو تصویر کی طرح چوکھٹے میں رکھنا، اس کی صورت بگاڑنا ہے اور یہ ٹھیک بھی ہے کہ جب ڈراما نویسی کا مقصد کچھ ثابت کرنا یا کوئی خاص نتیجہ نکالنا ہوتا ہے تو وہ زندگی کی شکل کسی قدر بدل یا بگاڑ دیتا ہے۔ لیکن اس تروف سکی اگر مصلح نہیں تھا اور اس کے نزدیک ماحول کو درست کرنا اور رُکاوٹیں دور کرنا ہی انسان کو بہتر اور زندگی کو زیادہ مفید اور خوش گوار بنانے کی صحیح تدبیر نہیں تھی، تو اس کے معنی یہ نہیں کہ وہ طرزِ معاشرت اور فلسفہٴ حیات کی ہر خصوصیت کو جو پُرانی تھی قائم رکھنا چاہتا تھا۔ اسے ہر طرف

عیب نظر آتے تھے اور زندگی کو سدھارنے اور سنوارنے کی ہر ذرا اس کے دل کو ہر وقت بے تاب رکھتی تھی۔ اس کے حوصلے وہی تھے جو ہر سچے مصلح کے ہوا کرتے ہیں، صرف طرزِ عمل جدا تھا اور وہ اسی چیز کی اصلاح کا قائل تھا جسے عام طور سے مصلح نظر انداز کرتے ہیں یا چھیڑنے کی ہمت نہیں کرتے، یعنی انسان کا دل۔ اس سے کوئی انکار نہیں کرتا کہ انسان پر جو مصیبتیں آتی ہیں اور سماجی زندگی میں جو بڑی دشواریاں پیدا ہوتی ہیں وہ صرف دل اور نیت کے بگاڑ سے اور اگر انسان کا دل اور اس کی نیت درست ہو تو پھر کسی اصلاح کی ضرورت نہیں رہتی۔ لیکن انسان کے دل کو مخاطب کرنے کی جرأت کسی کو نہیں ہوتی اور سب زندگی کے خارجی نظام کی مرمت کیا کرتے ہیں، اس لیے کہ وہ بہت زیادہ آسان کام ہے۔ اس تردد سکی نے اہل دشواری سے منہ موڑ کر اپنا کام آسان نہیں کیا، دستہ لف سکی کی طرح وہ بھی مصلح نہیں، ناصح تھا اس نے ماحول درست کرنے کی ترغیب نہیں دلائی، نیت اور دل کو سدھارنے کی تلقین کی نصیحت کو آرٹ کا جامہ پہنا تا بہت مشکل ہے، کیوں کہ اس کوشش میں نصیحت اور آرٹ دونوں کے مضحک بن جانے کا اندیشہ رہتا ہے اور اس تردد سکی ان چند اُستادوں میں سے ہے جنہوں نے اس کوشش میں نمایاں کامیابی حاصل کی۔

دوسری خصوصیت جو اس تردد سکی کے ڈراموں میں پائی جاتی ہے، یعنی بلاٹ کی عدم موجودگی، وہ بھی اس تامل کا نتیجہ ہے جو ہر سچے

آرٹسٹ کو اپنی غرض پوری کرنے کی خاطر زندگی کی صورت بدلنے میں ہوتا ہے۔ یورپی ڈراما نویسوں کو جو معیار یونانی مصنفوں سے ورثے میں ملا ہے اس میں زندگی کی کشمکش ڈراما کا موضوع مانی گئی ہے، اور اسی کو مد نظر رکھ کر ڈرامے کے پلاٹ کا انتخاب کیا جاتا ہے۔ یہ کشمکش انسانی ہمت کی خصوصیتیں پیدا کر سکتی ہیں یا معاشرتی رواج اور قانون یا ایسی قوتیں جو انسان کے قابو سے باہر ہیں مگر اسے زنجیروں کی طرح جکڑے ہوئے ہیں یا طوفان اور بھونچال کی طرح اس کی بے بسی پر ہنستی ہیں۔ فی نقطہ نظر سے بڑی بات یہ ہے کہ ڈرامے میں جو کشمکش دکھائی جائے وہ زندگی میں موجود ہو، ڈرامے کی خاطر پیدا نہ کی جائے، لیکن یہ کشمکش ہمیں بہت کم اتنی صاف نظر آتی ہے کہ ہم اس کی تصویر اتار سکیں۔ ڈراما نویس اس پر مجبور ہوتا ہے کہ اپنے ادراک اور بصیرت سے دھندھلے نقشوں پر روشنی ڈالے اور ان کہی باتوں کو کہہ دے۔ یونانی اصول کے مطابق ڈراما نویس کو اپنا مطلب ادا کرنے کے لیے واقعات کا ایک مکمل مجموعہ تیار کرنا چاہیے اور جس طرح ایٹھ کا پردہ اٹھنے سے منظر سامنے آتا ہے، اسے تماشاخیوں کے سامنے واقعات کا سلسلہ پیش کر کے آہستہ آہستہ ان کے جذبات میں ایسی کیفیت پیدا کرنا چاہیے کہ وہ ڈرامے کے مرکزی واقعے اور اس حقیقت سے جو اس میں مضمر ہو پورا اثر لے سکیں۔ اس کے برخلاف وہ طرز ہے جو اس تردد سکلی اور اس کے بعد چخوف نے اختیار کیا۔ اس میں کشمکش نام کو بھی نہیں، ڈراما کی کیفیتوں کا مجموعہ

چاہے ہو بھی جائے، واقعات کا مکمل مجموعہ نہیں ہوتا اور وہ اس طرح نامکمل چھوڑا جاتا ہے کہ ناظرین جو کچھ ایسٹج پر دیکھیں اس سے بہت زیادہ ان کا تخیل ڈرامے سے متاثر ہو کر انہیں دکھائے اور فنی رسموں نے زندگی اور ڈراما کے درمیان جو فرق پیدا کر دیا ہے وہ مٹ جائے۔ اوس تردف سکی کے متعلق ایک روسی نقاد نے لکھا ہے کہ ”اس کے ہر ڈرامے کے پلاٹ کی سب سے ممتاز صفت اس کی سادگی ہے۔۔۔ کسی کسی ڈرامے میں تو خیال ہوتا ہے کہ کچھ پیش نہیں آتا، ایک منظر کے بعد دوسرا دکھایا جاتا ہے اور سب کے سب خصوصیت سے محروم، معمولی روزمرہ زندگی کا نقشہ ہوتے ہیں۔ مگر پھر ہم یک بارگی چونک اٹھتے ہیں اور ایک دل سوز ڈراما نظر دے کے سامنے دیکھتے ہیں۔ واقعی یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہم کو ایسٹج پر اوس تردف سکی کے ڈرامے نہیں دکھائے جاتے بلکہ ہماری زندگی ایک گہرے دریا کی طرح بہتی ہوئی سامنے سے گزرتی ہے اور ہم اس کا گزرنا محسوس بھی نہیں کرتے“ اوس تردف سکی کے کسی ڈرامے کا مقصد بیان کرنا یا یہ بتانا کہ اس میں کیا تعلیم دی گئی ہے مشکل ہوتا ہے، مگر ہمیں اس کا یقین ہو جاتا ہے کہ ہم نے زندگی کا بغیر افروز مشاہدہ کیا ہے اور ہمارے دل میں وہ در کچھ اور شدید ہو جاتا ہے جو سچے علم اور کھری انسانی ہمدردی کی خاص علامت ہے۔

ہم عصر روسی نقادوں کو اوس تردف سکی کے ڈراموں کی فنی خصوصیات تو انوکھی یا قابلِ اعتراض نہیں معلوم ہوتیں، لیکن ان کی

نکستہ چینیاں اور تعریفیں دونوں اکثر بے جا ہوتی تھیں، کیوں کہ دونوں صورتوں میں ان کی نیت ادبی تنقید ہوتی تھی۔ یورپ دوست خیال کے لوگ اوس تروف سکی پر یہ الزام لگاتے رہے کہ وہ قدیمت پسند اور روسی قوم کی ذہنی اور معاشرتی اصلاح کا مخالف ہو، مسلمان دوست فرقے نے اسے اپنا ہم خیال اور مغربی تہذیب کا جانی دشمن سمجھ کر اس کے ڈراموں کو اپنے خیالات کی تبلیغ کا ایک ذریعہ فرض کر لیا۔ اوس تروف سکی کو ہمدردی اسی فرقے سے تھی اور وہ روسیوں کو اپنی خود داری بھلا کر اور انفرادیت سے ہاتھ دھو کر یورپ کی اندھا دُھند تقلید کرنے سے روکنا چاہتا تھا، مگر اس کا ہرگز یہ ارادہ نہیں تھا کہ اپنی تصانیف کو مسلمان دوست عقیدوں کے پرچار کا ایک ذریعہ بنائے اور جن لوگوں نے اس کے ڈراموں کو یہ معنی پہنچائے انھوں نے اس کے ساتھ بہت نا انصافی کی۔

اوس تروف سکی کا پہلا موضوع، جیسا کہ بیان ہو چکا ہے، تاجہ طہق کی زندگی تھی، اور اس زندگی کا وہ رُخ جس پر عدالت کے ملازم کی حیثیت سے اس کی نظر سب سے پہلے پڑی۔ عدالتیں اور ہسپتال، یہ دو مقام ایسے ہیں جہاں ہر قوم کی زندگی کا سب سے ناگوار اور قابلِ اعتراض پہلو ہی دکھائی دیتا ہے اور اوس تروف سکی نے روسی زندگی کا بھی یہی پہلو دیکھا۔ چنانچہ ”خاندان کی تصویر“ میں شرابی، آوارہ اور بدتمیز مردوں اور بدچلن عورتوں کی ایک دن کی کارگزاری

دکھائی گئی ہو جس سے ان کے باہمی تعلقات اور ان کے ظاہر اور باطن کی حالت معلوم ہو جاتی ہو؛ مرد دن بھر دوستوں کے ساتھ شراب پیتے پھر کرتے ہیں، عورتیں اپنی دل چسپی کے لیے دوسرے مردوں سے آشنائی پیدا کرتی ہیں اور جس طرح مرد انھیں جھوٹ بول کر دھوکا دینا چاہتے ہیں، ویسے ہی وہ بھی انھیں چکے دیا کرتی ہیں۔ ”اپنے لوگ ہیں، آپس میں سمجھ لیں گے“ تو بد چلنی کی یہ شدت نہیں دکھانا لیکن اس میں اور عیب کھولے گئے ہیں جو ساج کے لیے بد چلنی سے کم مضر نہیں کہے جاسکتے۔ ایک تاجر اپنے قرض خواہوں کو دھوکا دینے کے لیے دیوالیہ بن جاتا ہو اور ایک کارندے کے ساتھ اپنی لڑکی کی شادی کر کے کل ملکیت اس کے حوالے کر دیتا ہو۔ اس کا کارندہ، جو پہلے علم اور فرمان برداری کی ایک اعلیٰ مثال تھا، دولت ملتے ہی طوطے کی طرح آنکھ بدل لیتا ہو اور تاجر کی لڑکی کو بھی دھوکے باز باپ پر ترس نہیں آتا۔ اس بے ایمان تاجر پر جس نے یوں منہ کی کھائی کچھ افسوس تو ہوتا ہو؛ ڈرامے کی فضا دل میں جو کیفیت پیدا کرتی ہو وہ انتہائی مایوسی، نیراری اور نفرت کی ہوتی ہو، لیکن اوس ترس کی کاہل ارادہ نہ تھا کہ تاجروں کی طرف سے لوگوں کو بدظن کرے، یا اس فلسفہ حیات کی جس کے وہ معتقد تھے اور جو صحیح معنوں میں ردی تھا تحقیر کرے۔ اس نے جو شکایتیں کی تھیں وہ ایک دوست اور ہمدرد کی حیثیت سے اور اس نے اسی کے بعد ہی ایک دوڑ رہا

میں ثابت کر دیا کہ وہ اس طبقے کی دل سے قدر کرتا تھا جس میں ایسے لوگ بھی تھے جیسے کہ ”اپنے لوگ ہیں۔ آپس میں سمجھ لیں گے“ کی سیرتیں۔

”بڑے منافع کا عہدہ“ (۱۸۵۵) اور ”بے پالک“ (۱۸۵۸) اسی شکایت کو جاری رکھتے ہیں جو ”اپنے لوگ ہیں، آپس میں سمجھ لیں گے“ میں شروع کی گئی تھی۔ پہلا رشوت خور سرکاری ملازموں کا فلسفہ اور طرزِ عمل بیان کرتا ہے، دوسرا ۱۸۶۱ سے قبل کے اُن زمینداروں کا رویہ جو اپنی رعایا کی جان اور عزت کے مالک تھے۔ دونوں ڈرامے اپنے اپنے رنگ میں بے مثل ہیں۔ دونوں میں کوئی بے درد نہیں، کوئی مرکزی سیرت یا واقعہ نہیں اور اسی وجہ سے وہ فضا جو ایک طبقے میں رشوت خوری نے اور دوسرے میں بے باک خود مختاری نے پیدا کر دی تھی اپنی اصلی صورت میں اور اپنی کل خصوصیات کے ساتھ نظر آتی ہے، اور جس طرح نیک نیتی اور رست بازی کی خواہشوں اور ارادوں کا اس فضا میں گلا گھونٹا جاتا تھا وہ بھی صاف ظاہر ہو جاتا ہے۔

اسی دور کے دو ڈرامے اور ہیں جن میں زندگی کا تاریک پہلو دکھایا گیا ہے، گو ان میں کسی خاص طبقے کے گمراہوں کی شکایت نہیں۔ ”گناہ اور آفتیں سب ہی کا حصہ ہیں“ ایک غریب مگر محنتی اور نہایت درجہ وفادار اور محبت کیش دکاندار کراس نوٹ کے گھر کی تباہی کا

قصہ ہے۔ کہ اس نون نے ایک لڑکی سے شادی کی ہے جس کی پرورش ایک امیر گھرانے میں ہوئی تھی اور گو وہ ہر طرح سے اس کی دل جوئی کرتا ہے، اس کی بیوی نہ اس کی مطلق قدر کرتی ہے اور نہ اس کی محبت کی۔ اتفاق سے اُسی امیر کا لڑکا جس کے گھر میں کہ اس نون کی بیوی نے پرورش پائی تھی، اس شہر میں کسی کام سے آتا ہے، اس عورت کو نہ خود داری کا لحاظ رہتا ہے نہ شوہر کے احسانات یاد آتے ہیں اور وہ اس شریف زادے کے ساتھ بھاگ جانے پر تیار ہو جاتی ہے۔ لیکن انتہائی مکاری اور چال بازی کے باوجود وہ اس میں ناکام میاب ہوتی ہے اور کہ اس نون غصے میں آپے سے باہر ہو کر اسے مار ڈالتا ہے۔ اس ڈرامے میں کہ اس نون اس کی بیوی اور سالی کی سیرتیں، بیوی کی احسان فراموشی اور عیاری، شوہر کی سادہ لوح و نادارگی اور بعد کا خونخوار غصہ سب بہت خوبی سے دکھائے گئے ہیں۔

کہ اس نون کا اندھا چچا جسے اس کی بیوی کے برتاؤ سے بہت تکلیف پہنچتی ہے۔ روسی عجز اور انکسار اور قوت اعتقاد کا ایک اچھا نمونہ ہے اور اس کی گفتگو داستان کو اور بھی عبرت آموز بنا دیتی ہے۔ اسی ڈرامے کی طرح ”نازک مقام“ روسی زندگی کا تاریک پہلو دکھاتی ہے اور اس کی مرکزی سیرت ایک کسان ہے جو ایک سرائے کا مالک ہے، اپنا کاروبار بڑھانے اور مہانوں کی تعداد میں اضافہ کرانے کے لیے اپنی بیوی کی نیک نامی کا مطلق خیال نہیں کرتا اور

اور اُسے امیر مسافروں اور مہایوں کو پہنانے کے لیے ہستمال کرتا ہے۔ بیوی کو اس میں عذر نہیں، صرف کسان کی بہن اپنی آبرو کا پاس رکھتی ہے اور اسی کی وجہ سے ڈرامے کے آخر میں کسان کے دل میں کچھ روشنی پہنچتی ہے۔

”مغلسی عیب نہیں“ ایسے تروف سکی کا پہلا ڈراما ہے جس میں اس نے روسی سیرت اور طرز معاشرت کے بارے میں اپنی رائے ظاہر کی، اور معاصر زندگی سے چند ایسی سیرتیں منتخب کر کے جن کی مثالیں ہر طرف مل سکتی تھیں ایک بصیرت افروز داستان بنائی ہے۔

تورٹ سوٹ ایک دولت مند تاجر ہے جو یورپی وضع پر رہنا چاہتا ہے اس نے ایک اپنے ہی جیسے امیر کارخانہ دار کورٹونوف کو اپنا رہبر بنایا ہے۔ کورٹونوف یورپی تہذیب کی اصلی خوبیوں سے بے بہرہ ہے، صرف پھیلا بننا اور عیاشی کرنا جانتا ہے، اور یہی وہ تورٹ سوٹ کو جس میں پہلے سے بہت سے مزاحیہ عیب موجود تھے سکھا دیتا ہے۔

اسی کورٹونوف نے کچھ عرصہ پہلے ماسکو میں تورٹ سوٹ کے چھوٹے بھائی لیویم تورٹ سوٹ سے دوستی گانٹھی تھی، جس زمانے میں اسے ورثے میں بہت سا نقد روپیہ ملا تھا اور اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اسے کیسے صرف کرے۔ کورٹونوف نے اس کا سارا روپیہ خود دھوکے سے حاصل کر لیا یا لٹا دیا اور جب وہ بالکل کنکال ہو گیا تو اس سے نہایت بے مروتی سے اپنا پیچھا چھڑا لیا۔ جس وقت

ڈرامے کا قصہ شروع ہوتا ہے لیو بم تورٹ سوٹ کو اس کے بڑے
 بھائی نے کورٹھونوف کے کہنے پر گھر سے نکال دیا ہے اور وہ مسخرہ پن
 کی حرکتیں کر کے لوگوں کو ہنساتا ہے اور بھیک مانگ کر گزر کرتا ہے۔
 اسے رستے سے ہٹا کر کورٹھونوف ایک قدم اور آگے بڑھتا ہے اور
 تورٹ سوٹ کی لڑکی سے شادی کرنے کی خواہش ظاہر کرتا ہے۔
 تورٹ سوٹ اس کا ایسا معتقد ہے کہ بیٹی کا اس کے ساتھ نکاح
 کر دینا اپنی عزت افزائی سمجھتا ہے، گو کورٹھونوف کی عمر ساٹھ کے
 قریب ہے اور اس کی بیٹی نوجوان۔ خاندان کے لوگ سب اس سے
 بہت خائف رہتے ہیں اور شادی کی مخالفت کرنے کی کسی کو بھی
 جہت نہیں ہوتی، مگر آخر وقت جب سنگنی کی رسم ادا ہونے والی
 ہے اور کورٹھونوف اسی غرض سے تورٹ سوٹ کے یہاں آیا ہے،
 لیو بم تورٹ سوٹ ممانعت کے باوجود گھر میں کورٹھونوف کی موجودگی
 میں بھائی کو اپنی ساری سرگزشت سُناتا ہے اور آخر میں اس سے
 التجا کرتا ہے کہ کورٹھونوف کی بجائے بیٹی کا نکاح اپنے کارندے کے
 ساتھ کر دے جو مدت سے اس پر عاشق ہے، مفلسی سے باوجود نہایت
 شریف طبیعت رکھتا ہے، کسی کا احسان نہیں بھولتا اور کسی سے بے
 مردتی نہیں کرتا۔ بھائی کی منتیں بالکل خلافت توقع کارگر ہوتی
 ہیں اور ڈراما خوشی کے گیت پر ختم ہوتا ہے مگر یہ اندیشہ دل میں ضرور
 باقی رہتا ہے کہ اس کا انجام بالکل برعکس ہو سکتا تھا، بلکہ اس کا

برعکس ہونا ہی زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتا ہے۔ ٹورٹ سوف کی فرعونیت، کورٹونوف کی چالیں، اس زندگی کی دل فریبی جس کا لایح ٹورٹ سوف کو دیا جا رہا تھا، وہ فرماں برداری جو روسی فلسفہ حیات نے اولاد پر لازم کی تھی، اگر یہ سب مل کر ٹورٹ سوف کی بیٹی کو قصائی کے کھونٹے سے ہانڈھ دیتیں، اس کی بیوی کا دل توڑ دیتیں اور بھائی سے عمر بھر بھیک منگوائیں تو کوئی تعجب کی بات نہ ہوتی، کیوں کہ یورپی طرز معاشرت یہی فرعونیت، بے مروتی اور بے دردی روسی قوم کو سکھا رہا تھا۔

اس ڈرامے میں یورپی اور روسی فلسفہ حیات کی بے تکی آئینہ کا انجام صرف یہ ہونا کہ امکانات پیش کر کے نہیں واضح کیا گیا ہے۔ ڈرامے میں دو چار سین ایسے بھی ہیں جہاں معمولی باتوں میں دونوں کا فرق ظاہر ہو جاتا ہے اور ساتھ ہی روسی طرز معاشرت اور ذہنیت کی فضیلتیں بھی دکھائی جاتی ہیں۔ ٹورٹ سوف کی بیوی بہت ملن سار، خوش مزاج، مسادات پسند اور صاحب ذوق ہے۔ ایک منظر ہے جس میں اس نے گھر میں محنت کی بہت سی لڑکیوں اور لڑکوں کو جمع کیا ہے، سب گارہے ہیں اور نہایت بے تکلفی سے مگر انتہائی سناسنائی کے ساتھ گفتگو اور سنسنی مذاق ہو رہا ہے، کہ ایک بار لڑکی ٹورٹ سوف اپنے مرشد کورٹونوف کو لے کر پہنچتا ہے۔ کورٹونوف کے آتے ہی جلسے کی فضا بالکل بدل جاتی ہے، جو لوگ شوق سے گاہے

تھے ان سے روپے کے بدلے گالے کو کہا جاتا ہے اور جہاں پہلے بے تکلفی اور معصومیت تھی وہاں کورٹونوف کی ذات شہوت کی بو پھیلا دیتی ہے۔ یہ بُری تاثیر روسی سیرت میں دولت اور دولت پرستی نے پیدا کی ہے اور یوہیم تورٹ سوٹ بالکل ٹھیک کہتا ہے کہ ”ارے، اگر میں غریب ہوتا تو مسکن ہی انسان بھی ہو جاتا مفلسی عیب نہیں ہے“

اس کے بعد کا ڈراما، ”اپنی ہی مرضی پر مت چلو“ (۱۸۵۴) بے اصول زندگی بسر کرنے کی زیادہ صاف طور پر مخالفت کرتا ہے۔ اوس تروتسکی نے اپنا خاص طرز چھوڑ کر نصیحت یا تنبیہ نہیں کی ہے نہ زندگی کی عام روش یا عام انسانی تجربے کے باہر قدم رکھا ہے اور ایسے حالات کو اپنا موضوع بنایا ہے جو دوزمرہ پیش آتے ہیں۔ ایک میاں بیوی ہیں جن کی شادی کو صرف ایک ہی سال گزرا ہے اور جنھوں نے محبت کی بنا پر شادی کی تھی۔ ان کے درمیان ناچاقی ہو جاتی ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اپنی محبت کے باوجود دونوں ایک دوسرے سے بیزار ہو جاتے ہیں۔ شوہر اپنا غم غلط کرنے کے لیے گھر میں آنا تقریباً ترک کر دیتا ہے اور بیوی اس کی سرد مہری دیکھ کر ایسی برداشتہ خاطر ہو جاتی ہے کہ میکے واپس جانے کی غرض سے گھر سے بھاگ نکلتی ہے۔ شوہر سے ناچاقی کی خبر اس کے بوڑھے ماں باپ تک پہنچ جاتی ہے، وہ اسے سمجھانے کے لیے آتے ہیں اور

اتفاق سے ان کی رستے ہی میں ملاقات ہو جاتی ہے۔ اس موقع پر ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اس نوجوان عورت نے ماں باپ کی رضامندی کے بغیر شادی کی تھی اور اس خوف سے کہ کہیں وہ مخالفت نہ کریں اپنے محبوب کے ساتھ چھپ کر بھاگ گئی۔ اس کے ماں باپ ناراض نہیں ہوئے، گو اس کے ردیے سے انھیں صدمہ بہت پہنچا، لیکن جس طریقے پر شادی ہوئی تھی ویسی ہی بعد کی زندگی رہی۔ فراموشی کا احترام اور ذمہ داریوں کا احساس نہ ہونے کی وجہ سے ذرا سی لچاقتی پر میاں بیوی ایک دوسرے سے بگڑ گئے اور وہ نازک رشتہ جو جوانی کی محبت اور جوش نے قائم کیا تھا ٹوٹ گیا۔ بیوی کے ماں باپ نے یہ رشتہ پھر قائم کر دیا۔ اور اپنی نصیحتوں سے وہ تلون جو جوانی کے جذبات میں ہوتا ہی دور کر کے ان کے رشتے کو استوار کر دیا۔

”مفلسی عجیب نہیں“ میں لیویم ٹورٹ سوٹ اور اپنی ہی مرضی پر مت چلو“ میں نوجوان بیوی کے ماں باپ جس فلسفہ حیات کے معتقد ہیں اس کا ”پرائی گاڑی میں مت بیٹھو“ اور ”مزاج موافق نہ تھے“ میں یورپی طرز معاشرت اور آئین زندگی سے مقابلہ کیا گیا ہے۔ ”پرائی گاڑی میں مت بیٹھو“ ایک مال دار تاجر کی لڑکی ازدتیا کی سرگزشت بیان کرتا ہے جسے ”مہذب“ بننے کا شوق ہے اور اسی شوق میں وہ ایک فوجی افسر سے شادی کرنا چاہتی ہے۔ اس کی بھوپھی جس نے کسی یورپی ڈھنگ کے اسکول میں تعلیم پائی تھی اور تاجروں کے

رہن سہن کو نہایت وحیانہ سمجھتی ہے اپنی نا تجربہ کار بھتیجی کو اور بھی کساتی ہے اور اسی کی مدد سے وہ فوجی افسر کے ساتھ فرار ہو جاتی ہے کیوں کہ باپ کی منظوری ملنے کی اسے کوئی توقع نہیں۔ لیکن پہلی ہی منزل پر فوجی افسر کو معلوم ہو جاتا ہے کہ تاجر کی بیٹی کے ساتھ تاجر کی دولت ملنے کی کوئی امید نہیں اور چوں کہ اسے دولت ہی کی فکر تھی اس وجہ سے وہ محبت جس کا وہ بڑی لسانی اور گرمی کے ساتھ اظہار کیا کرتا تھا سرد پڑ گئی اور افسردہ دنیا کو جب اپنے عاشق کی اصلی نیت معلوم ہوئی تو وہ اپنے باپ کے پاس بھاگ آئی۔ اس ڈرامے میں روس کے دونوں طبقوں کی کمزوریاں دکھائی گئی ہیں۔ تاجر شادی بیاہ کے معاملے میں اپنی اولاد کی خواہشوں کا لحاظ نہیں کرتے اور نہ انھیں اتنی آزادی دیتے ہیں کہ وہ اپنی خواہشیں ظاہر کر سکیں یا تجربے کے ذریعے سے صحیح اور غلط میں تمیز کر سکیں۔ تعلیم یافتہ طبقے کے لوگوں میں آزادی ہے اور سلامت روی کے واسطے جتنے تجربے کی ضرورت ہوتی ہے وہ بھی انھیں حاصل ہے، لیکن ان کے اوجھے فلسفہ حیات میں عاقبت اندیشی کو کوئی دخل نہیں، وہ تہذیب کے معنی عیش و آرام سے زندگی بسر کرنا سمجھتے ہیں اور انھیں بس اسی کی فکر رہتی ہے کہ ایسی زندگی کے لیے جس سرمایے کی ضرورت ہے وہ فراہم کریں، چاہے اس کوشش میں کتنا ہی جھوٹ بولنا اور دھوکا دینا پڑے۔ اندویش اور اس کی پھوپھی قدیم روسی طرز معاشرت کے ان نمائندوں کی

مثالیں ہیں جو تہذیب کے صحیح مفہوم سے واقف نہیں ہیں، نہ اپنے آئین کی قدر کر سکتی ہیں نہ دوسروں کے اور اسی قسم کے لوگوں کی گمراہی اور ان کی زندگیوں کی تباہی پہ اوس تردف سکی کو سب سے زیادہ رنج ہوتا تھا۔ اس قسم کی شادیاں جن کی آرزو اور ناکامی اس ڈرامے میں دکھائی گئی ہو دس میں بہت ہوا کرتی تھیں اور اسی طرح لوگ ایک دوسرے کی اصل نیت کو معلوم کر کے پشیمان بھی ہوا کرتے تھے۔ اوس تردف سکی نے وہ غلط فہمی جس میں مبتلا ہو کر نوجوان مرد اور عورتیں اپنی زندگی دو بھر کر لیتی تھیں واضح کر دی اور سیرت اور تربیت کی وجہ سے تاجراور ”مہذب“ طبقے کے لوگوں میں جو آگ پانی کی سی عداوت ہونا لازمی تھی اس کی اصلیت بھی ظاہر کر دی۔ ”مزاج موافق نہ تھے“ اسی حقیقت کو دوسرے لباس میں دکھاتا ہے۔ ایک نوجوان تاجر کی بیوہ مہذب کہلانے کے لالچ میں ایک رئیس زادے سے شادی کر لیتی ہے جس کے پاس ریاست کے حوصلوں کے سوا کچھ بھی نہیں اور جس نے صرف اپنا فرض ادا کرنے اور ٹھاٹھ سے رہنے کی نیت سے شادی کی ہے۔ تاجر کی بیوہ کو چند روز ہی میں معلوم ہو جاتا ہے کہ مہذب بننے کے لیے اسے اپنا سارا روپیہ شوہر اور مہذب زندگی کی لوازمات کی نذر کرنا ہوگا، اور وہ اپنے شوہر کو چھوڑ کر میکے میں جا بیٹھتی ہے۔ ایسے حادثوں کو لوگ مزاج کی ناموافقت سے تعبیر کرتے ہیں۔

فنی کمال اور شاعرانہ خوبیوں کے اعتبار سے اوس تردف سکی کے

پہلے دور کے کارنامے ”غریب کنواری“ اور ”طوفان“ ہیں۔ ”غریب کنواری“ ایک مفلس مگر تعلیم یافتہ اور حوصلہ مند لڑکی کے بیاہ جانے کی داستان ہے۔ لڑکی کی ماں ایک کمزور اعصاب کی اور کم عقل عورت ہے جو ہر وقت پریشان اور مشیر اور مددگار کی تلاش میں رہتی ہے اور وہ لڑکی کے لیے سہارا ہونے کے بجائے الٹی اس کے لیے ایک مصیبت ہو جاتی ہے۔ لڑکی صورت کی اچھی ہے اور بین نوجوان اس سے شادی کرنے کے امیدوار ہیں۔ ان میں سے ایک ایسا جھپو اور دیوہرہ لڑکا اپنی خواہش زبان سے ادا نہیں کر سکتا اور دو محض ایک دوسرے کو زہر اور مات کرنے کی فکر میں ہیں، لڑکی سے بے دریغ جھوٹ بولتے ہیں اور اس کی روحانی تکلیف کا مطلق پاس لحاظ نہیں کرتے۔ آخر میں ایک سرکاری ملازم شادی کے آرزدہ مندوں میں نمودار ہوتا ہے اور لڑکی کو مجبوراً اس سے شادی کرنا پڑتی ہے کیوں کہ زیادہ انتظار کرنے میں بھوکوں مرنے کا اندیشہ ہے۔ سرکاری ملازم خود پرست، بے غیر اور بدجن ہے، اس سے پہلے وہ کئی لڑکیوں کو دھوکا دے کر ان کی زندگی برباد کر چکا ہے، لیکن اس کے پاس کھانے پینے کو ہے اور یہ صفت ان نوجوانوں میں سے کسی میں نہیں جو لڑکی کی نظر میں تھے۔ بھوک سے بچنے کے لیے ایک شریف لڑکی کو اپنی انسانیت اور انسانیت کے حوصلوں سے باہر دھونا پڑتا ہے۔ اس طرف سہل نے زندگی کی یہ دل سوز تصویر دکھاتے ہوئے ناظرین پر کسی طرح کا اثر ڈالنے کی تدبیر

ہنہیں کی ہی، ان حالات کی سچائی اور عمویت خود دل کو تر پاتی
ہی اور آنکھوں میں آنسو بھر آتے ہیں۔

”طوفان“ میں یہی تباہی دوسرے اور زیادہ پُر تاثیر رنگ
میں نظر آتی ہے۔ قدیم روسی طرز معاشرت نے جو انوکھی سیرتیں پیدا
کی تھیں اور جن میں سے بعض کا اوس قرون سکی نے اس سے پہلے کے
ڈراموں میں عکس اُتارا ہے ان سب کی تصویریں ”طوفان“ میں ڈراما نویس
کا منبھا ہوا قلم ایسی نفاست سے کھینچتا ہے جو پہلی کوششوں میں نہیں
پائی جاتی۔ دیکھوئی اور کا بانو دافر عونت، بے باک نہ خود مختاری اور
خود رانی کے مجھے ہیں۔ کا بانو کا بیٹا کا بانو اس بودے بن کا شہل
نمود ہے جو والدین کی سختی اور تند مزاجی اولاد میں پیدا کر دیتی ہے؛ ایک
ستر برس کی بڑھیا، جو لوگوں کو عذاب سے ڈراتی پھرتی ہے اور نوجوان
عورتوں کو حکم دیتی ہے کہ خدا سے دعا مانگیں کہ ان سے حسن کی دین داپس
لے لے، اس مذہبیت کا عبرت آموز نمونہ ہے جس کا کل سرمایہ عذاب کا خوف
ہوتا ہے، گولی گن، ایک مستری، اس خط میں مبتلا ہے کہ اس نے ایک
دائم حرکت کل ایجاد کر لی ہے، بس ایک پیسے کی کسر اور ہے، بوریس
گرگیور وویچ، دیکھوئی کا ایک رشتہ دار، ان روسیوں کی مثال ہے جن کے
ذہن اور طبیعت میں یورپی تہذیب نے ہر طرح کی نفاست اور شناسکی
پیدا کر دی، مگر انھیں ہمت اور ارادے کی قوت سے بالکل محروم کر دیا۔
ڈرامے کی مرکزی سیرتیں کا بانو کا بانو کی بہن وارورا اور اس کی بیوی

کارترینا ہیں۔ واروہرا اپنے بھائی کی طرح ماں سے ڈرتی ہے، اور بھائی کی طرح چھپ کر دل کے ارمان پورے کرتی ہے۔ یوں وہ بزرگوں کے تحکم اور ان کی روکھی اخلاقی تعلیم کو برداشت کر لیتی ہے، کارترینا کو نیاپنی طبیعت پر اتنا قابو ہے نہ سخت کلامی اور جبر کا جھوٹ اور دھوکے بازی سے جواب دینے کی عادت، اور اسی کی سرگزشت اس ڈرامے کا موضوع ہے۔ شادی سے پہلے اس نے پرندوں کی سی آزاد اور بے فکر زندگی بسر کی تھی، دل کی ہر خواہش پوری کرتی اور سن کی ہر موج کے ساتھ بہ جاتی۔ اس کا دل بھی پرندوں کا سا صاف اور معصوم ہے، نہ جانے کسی کیسی شاعرانہ اسنگوں سے چور رہتا ہے، آنکھیں آنسو بہانے پر تیار رہتی ہیں اور عقل گم ہو جانے پر۔ اسی وجہ سے وہ کسی قسم کی بے اتفاقی یا سرد مہری نہیں سہہ سکتی، مگر قسمت نے اسے ایسا شوہر دیا جس کی محبت اس کو تسلی نہیں دے سکتی اور ایسی ساس جو ہر وقت اس کے دل کو دکھانا اور تڑپانا اپنا خاص فرض سمجھتی ہے۔ شوہر اور ساس کی طرف سے بالکل مایوس ہونے کے باوجود کارترینا خاندانی زندگی کے اصولوں کی خلاف ورزی نہیں کرنا چاہتی۔ لیکن جب اس کی پولیس گرے گیو ووج سے ملاقات ہوتی ہے اور پولیس کی شرافت اور نشا نگاہ اور اس کے خوبصورت چہرے کا مایوسانہ انداز اور کھلائی ہوئی نگاہ اسے بتا دیتی کہ وہ بھی اسی غم میں مبتلا ہے اور اسے بھی ناقدر دانی ہلاک کر رہی ہے تو وہ ہم جنسی کا حق ادا کرنے سے انکار نہیں کر سکتی۔ پولیس کی

محبت کا جذبہ جس قدر قوی ہوتا جاتا ہے اسی قدر کارترینا کا ضمیر روکتا ٹوکتا
 ہے، مگر آخر میں محبت اسے بے بس کر دیتی ہے اور وارورا کے مشورے پر
 اور اسی کی مدد سے وہ چھپ کر بورس سے ملاقات کرتی ہے۔ وارورا کا
 بھی ایک بار ہے، دونوں روز ملتے ہیں اور اپنا دل چھپانے میں اس قدر کامیاب
 رہے ہیں کہ دوسروں کو ان پر کبھی شبہ نہیں ہوتا، وارورا کا جذبہ محض
 جسمانی ہے، کیوں کہ جسمانی خواہشوں کے سوا اور کچھ ماحول کی ناموزدیت
 اور طبیعت کی افتاد نے اس کی سیرت میں باقی نہیں رہنے دیا۔ ان
 خواہشوں کو جائز طور پر پورا کرنے کی اسے اجازت نہیں اس لیے وہ
 بے دھڑک انھیں چھپ کر پورا کرتی ہے اور کارترینا سے اس کا اقرار
 کرتے ہوئے اسے شرم بھی نہیں آتی۔ کارترینا لذت پرست نہیں ہر نیک
 زندگی کا دل میں بہت لحاظ رکھتی ہے۔ وہی چوری جو وارورا کا معمول
 بن گئی تھی پہلے بچہ بچے کے بعد کارترینا کے ضمیر کو ایسا پریشان کر دیتی ہے کہ
 وہ مذمت کے جوش میں اپنے شوہر سے ساس کی موجودگی میں جرم کا
 اقبال کرتی ہے اور عشق اور معشوق کو خیر باد کہہ کر دریا میں کود پڑتی ہے۔
 اسی رات کو بڑا زبردست طوفان آتا ہے، اندھیرے میں بہت دیر تک
 سب اسے ادھر ادھر تلاش کرتے رہتے ہیں اور آخر میں اس کی
 لاش دریا کے کنارے پڑ جاتی ہے۔

اوس تردت سکی نے ۱۸۵۸ میں قوم پرست عالموں کی ایک
 جماعت کے ساتھ ودلگا کی وادی میں سیاحت کی اور وہیں ”طوفان“

کا موضوع اس کے خیال میں آیا۔ کاترینا کے جذبات کی شدید جنگ کے لیے دریا کے طوفان زدہ کناروں سے زیادہ موزوں پس منظر تصور کرنا دشوار اور ڈرامے کے آخر میں کالی گھاؤں کی کرکس اور گرج جو کاترینا کے دل کو دھلا دیتی ہے اس روحانی ہنگامے کی ایک آسمانی صدائے بازگشت معلوم ہوتی ہے جس میں جذبات کی خانہ جنگی اور آرزوؤں کا ظالم انسان کو مبتلا کر دیتا ہے۔ لیکن اس طوفان کی اور تشریکیں بھی ہو سکتی ہیں، کاترینا کی دہشت زدگی اور دردناک توجہ کو ہر شخص اپنے مذاق اور تجربے اور تعصبات کے لحاظ سے معنی پہتا سکتا ہے، وہ عشق کا انجام بھی قرار دی جاسکتی ہے، زمانے کی ناساز گاری سے ایک غریب حوصلوں بھرے دل کا ٹوٹنا بھی، ”ناصر“ چاہے تو اسے اخلاقی آئین کی خلافت ورزی کی سزا بھی بتا سکتا ہے اور اس تردف سکی کا مقصد صرف ایک منظر، زندگی کی ایک تصویر دکھانا تھا۔

”طوفان“ کے بعد اس تردف سکی نے کئی ڈرامے لکھے، بعض فرحیہ، بعض المیہ، لیکن ”طوفان“ کا مرتبہ اس دور کے کسی اور ڈرامے کو حاصل نہیں اور کوئی تعجب نہیں کہ لوگ یہ سمجھے کہ اس تردف سکی کا فن انتہا کو پہنچ چکا ہے۔ پھر حال کچھ نقادوں کی سرد مہری کچھ ٹھیٹھروں کے منتظموں اور مالکوں کے برتاؤ نے اس تردف سکی کو تاریخی ڈرامے لکھنے کی طرف مائل کر دیا۔ شروع کے ڈراموں میں

اوس تروف سکی کا مقصد تھا ہی نہیں کہ وہ اسٹیج پر دکھائے جائیں، وہ صرف روسی تاریخ کے چند واقعات پیش کرنا چاہتا تھا، مگر ڈرامے کے طرز سے گریز کرنے کی خواہش کے باوجود اوس تروف سکی اپنی طبیعت اور خاص رجحان پر قابو نہ لاسکا اور اس کا ڈراما ”وسی لی سائے لذت یفنا“ اس فن کا ایک اعلیٰ نمونہ ہو اور اسٹیج پر دکھانے کے واسطے بہت موزوں ہو۔ اس کی داستان میں کچھ یونانی المیہ ڈراموں اور کچھ شکسپیر کی تصنیف کا رنگ اور ڈھنگ نظر آتا ہے، کیوں کہ وہ تاریخی واقعات جو اس میں بیان کیے گئے ہیں ان قصوں سے بہت ملتے جلتے ہیں جنہیں یونانی ڈراما نویسوں اور شکسپیر نے اپنا موضوع بنایا۔

۱۸۶۸ء سے اوس تروف سکی کی تصانیف کا قیسا دور شروع ہوتا ہے۔ جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے، ۱۸۶۱ء کی اصلاحوں کے بعد روسی معاشرت اور اس کے ساتھ روسی فلسفہ زندگی نے ایک پنٹا کھایا، اور جہاں پہلے چند ادارے اور رواج اصلاح طلب تھے یا چند رسمیں اور تعصبات ترک کر دینے کا سوال تھا، وہاں اب ہزاروں معیے اور پیچیدہ مسائل پیدا ہو گئے جن کا کسی ایک اصول کے مطابق حل کرنا ناممکن تھا۔ روشن ضمیر لوگوں کے لیے اس سے بھی زیادہ پریشان کن یہ بات تھی کہ ان مسائل کا حل کرنا ایک انفرادی ذمہ داری کا معاملہ ہو گیا تھا، گو یا ہر مریض پر یہ فرض عائد ہو گیا تھا کہ اپنے مرض کا علاج خود ہی کرے۔ اوس تروف سکی نے بہت سے مسئلوں پر جو اسے غور کے لائق

معلوم ہوئے اپنے ڈراموں میں بحث کی اور حسب استعداد گمراہوں کی رہ نمائی کا فرض ادا کیا، لیکن اپنے خاص انداز سے اس نے نصیحت کرنا، تعلیم دینا یا کسی مخصوص فلسفہ حیات کا پرچار کرنا اپنا مقصد نہیں بنایا، ہم کسی خاص ڈرامے کی نسبت قطعی طور سے یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ اس کا موضوع کون سا معاشرتی یا اخلاقی مسئلہ ہے۔ لیکن جو زندگی ہماری نظروں کے سامنے مشاہدے کے لیے پیش ہوتی ہے، جن سیرتوں کے تجربے اور سرگزشت سے ہم واقف کرائے جاتے ہیں اس سے کوئی نہ کوئی نتیجہ ضرور نکلتا ہے، اور ہم اس سے فائدہ بھی حاصل کرتے ہیں، مگر بغیر یہ محسوس کیے کہ ہماری رہ نمائی کی جا رہی ہے یا ہم کو کسی خاص قسم کی تعلیم دینے کی کوشش کی گئی ہے۔

اس دور کے دو چار ڈرامے ایسے بھی ہیں جن میں نئی زندگی کے مسئلے اور پیچیدگیاں نظر انداز کر کے صرف وہ انوکھی سیرتیں دکھائی گئی ہیں جو اس وقت نمودار ہوئیں اور جو اس وقت کے حالات کی بدولت بہت زیادہ نمایاں بھی ہو گئیں۔ ”ہر چالاک آدمی میں کچھ بھولا پن ضرور ہوتا ہے“ (۱۸۶۸ء) اور ”دل سوزاں“ (۱۸۶۸ء) اس سلسلے میں خاص طور سے قابل ذکر ہیں اور نئے رنگ کی سیرتوں کا بہترین مجموعہ ان دونوں میں نظر آتا ہے۔ ہر چالاک آدمی میں کچھ بھولا پن ضرور ہوتا ہے“ گلو موف نامی ایک نوجوان کا قصہ ہے جو بہت چلتا ہوا آدمی ہے لوگوں کی کمزوریاں معلوم کر کے ان سے فائدہ اٹھانے کا کڑ سمجھتا ہے اور

چند مہینوں کی کوشش کے بعد سب کی نظروں میں بہت رتبہ حاصل کر لیتا ہے۔ لیکن ہر شخص کی نسبت اس کی جو اصل رائے ہے اور ملازموں وغیرہ کو جو اس نے رغبت دی ہے اس کا سارا حساب وہ ایک روز ناچے میں لکھنا جاتا ہے اور آخر میں اتفاق سے یہی روز ناچہ ان لوگوں میں سے ایک کے ہاتھ لگتا ہے جنہیں گلو موٹ نے اُتو بنایا ہے اور یوں اس کا بھانڈا پھوٹ جاتا ہے۔ ان لوگوں میں اس کا دور کا رشتہ دار ایک مالدار تاجر ماماٹ ہے، جو ہر دن صبح سے شام تک رہنے کے لیے مکان تلاش کیا کرتا ہے، گو اسے مکان کی ضرورت بالکل نہیں۔ اس کی بیوی کو حُسن کے قدردانوں کی تلاش رہتی ہے اور وہ منتظر بھی عجیب ہوتا ہے جب ماماٹ گلو موٹ سے کہنا پڑتا ہے کہ اگر تم میری بیوی سے عشق کرو یا اس کے رو برو عاشقوں کا انداز اختیار کرو تو مجھے کوئی شکایت نہ ہوگی، کیوں کہ ماماٹ اپنی بیوی کی کمزوری سے واقف ہے، اسے معلوم ہے کہ کسی نہ کسی نے اس کا یا رانہ ضرور رہے گا، اور اس صورت میں گلو موٹ ہی یہ منصب اپنے ذمہ کر لے تو بہتر ہوگا۔ ان میاں بیوی کے علاوہ اور لوگ جو گلو موٹ کا شکار بنے کچھ کم دل چسپ نہیں۔ تو روسی نا ایک نوجوان بیوہ، دہم پرستی کی انہما ہے۔ ڈراے میں پہلی بار جب اس کا ناظرین سے تعارف کرایا جاتا ہے تو وہ گاڑی پر بیٹھ کر کہیں جانے والی ہے، مگر رستے میں کچھ بُرے ننگوں نظر آنے پر وہ واپس آ جاتی ہے۔ اسے مالوں پر بہت اعتقاد ہے، جو کچھ کرتی ہے فال دیکھ کر اور گلو موٹ ایک

رہا کہ کورشوت دے کر تو روسی نامہ کے مستقبل میں خاص اہمیت حاصل کر لیتا ہے۔ تو روسی نامہ کی ایک سشتہ دار مارش کا ہے جو صرف اس نیت سے شادی کرنا چاہتی ہے کہ بھڑکیلے کپڑے پہنے، ٹھیکڑ میں سب اسی کو دیکھا کریں اور وہ سوسائٹی کے اعلیٰ طبقے میں شمار کی جائے۔ اسے مطلق پروا نہیں کہ اس کی شادی کس سے ہوتی ہے، بشرطیکہ اس کے یہ جو صلے پورے ہو جائیں، اور وہ اچھی طبیعت کی مہذب روسی عورتوں کا ایک مثالی نمونہ ہے۔ اسی کی طرح گورو دولن جو اپنے آپ کو اس وقت سے بہت انتہا پسند سمجھنے لگا ہے جب سے کسی نے اس پر بربل لٹے ہوئے کا الزام لگایا ایسی ذہنیت کا نمونہ ہے جو روس کے سرکاری ملازموں میں بہت پائی جاتی تھی اور گورو دولن کے سے لوگ روسی نادوں میں بہت ملتے ہیں۔ اسے اس خوف سکی نے اس آزاد خیالی اور بے باکی کی، جس پر اس قسم کے لوگوں کو ناز تھا، ساری کیفیت ظاہر کر دی ہے۔

”دلی سوزاں“ روسی سوسائٹی کے اس طبقے کا ایک تصویر خانہ ہے جس پر یورپی تہذیب کا زیادہ اثر نہیں پڑا، اگرچہ آزادی کی امنگیں نوجوانوں کے دلوں میں پیدا ہو رہی ہیں۔ اس ڈرامے کی ہیروئن پراشنا اپنی سوتیلی ماں اور خطبی باپ سے دہتی اور ڈرتی نہیں ہے اور ایک موقع پر جب اسے اندیشہ ہوتا ہے کہ اپنی مرضی کے مطابق شادی نہ کر سکے گی تو بلاتامل گھر چھوڑ کر بھاگ نکلتی ہے۔ پراشنا کی سیرت نہایت

لے یعنی آزاد خیال۔ اس زمانے میں آزاد خیال سمجھا جاتا ہے غور اور بڑے اندیشے کی بات تھی۔

پیاری ہے، اس میں وہ شوخی اور ہمت ہے جو جوانی کی خاص نشان ہوتی ہے
 اور وہ دل کی نیک بھی بہت ہے۔ اسے تاجر طبقے کی لڑکیوں کا جن کی سیریں
 دکھانے میں اس تروف سکی نہایت مشاق تھا، بہترین نمونہ سمجھنا چاہیے۔
 لیکن ڈرامے میں دلچسپی کامرگز وہ اور اس کی سرگزشت نہیں، بلکہ اس کا
 باپ، کوروسلے پون اور اسی شہر کا ایک اور مال دار تاجر خلی نون
 کوروسلے پون نے بہت سی دولت پیدا کر لی ہے، اور عمر کے آخری
 سال چین سے گزارنا چاہتا ہے، مگر اسے ایک خط ہو گیا ہے جس کی وجہ
 سے وہ ہر وقت بے حد پریشان رہتا ہے۔ اسے اندیشہ ہے کہ قیامت
 آنے والی ہے اور یہ اندیشہ اس کے دل میں ایسی وحشت پیدا کرتا ہے کہ
 وہ اکثر سوتے سے چونک پڑتا ہے اور باہر جا کر دیکھتا ہے کہ کہیں آسمان
 پھٹ تو نہیں گیا خلی نون اس سے بھی زیادہ مال دار ہے، وہ کسی
 خاص خط میں تو مبتلا نہیں مگر اس کے کسی طرح سمجھ میں نہیں آتا کہ
 اپنا وقت کیسے نکالے اور اپنی دولت کیسے صرف کرے۔ اس نے شرفا
 کے طبقے سے دو مصاحب نوکر رکھے ہیں، ایک نئی وضع کی تمام ہارکیاں
 اور نکات سکھانے کے لیے، وہ سراسر اس لیے کہ وہ وقت گزارنے کی
 نئی اور دل چاہی چیزیں سوچے۔ زندگی میں لطف پیدا کرنے کی آخری
 تدبیر جو خلی نون کا مصاحب سوچتا ہے وہ یہ ہے کہ سب کے سب
 ڈاکو بن کر شہر کے قریب جنگل میں چھپ کر بیٹھیں، جو مسافر رستے سے
 گزریں انھیں زبردستی گرفتار کر کے خوب شراب پلائیں اور پھر خفست

کر دیں۔ انھیں مسافروں میں سے پرانا بھی ہے، جو اپنے گھر سے بھاگ
 گئی تھی اور اسی کی گرفتاری سے ڈرامے کے تمام مسائل حل ہو جاتے ہیں۔
 ”دل سوزاں“ لکھنے کے بعد سے اس طرف سکی نے نئی معاشرت
 کے معاملات پر غور کرنا شروع کیا اور ظاہر ہے کہ سب سے پہلے اسے
 نئی اور پُرانی سیرتوں کا مقابلہ کرنے کا خیال ہوا۔ ”مفت کی دولت“
 (۱۸۶۹ء) کا موضوع بھی ہے۔ وسیل کوف، مضافات کا ایک تاجر جس
 نے جدید تجارت کے تمام گُر سیکھ لیے ہیں اور خاصاً روپیہ کمایا ہے شرفنا
 کے طبقے کی ایک لڑکی لہیا پر عاشق ہو جاتا ہے، لہیا کو وہ پسند نہیں
 لیکن دولت کی ہوس میں وہ اس سے شادی کر لیتی ہے۔ شادی کے
 چند روز بعد ہی دونوں میں ناچاقی پیدا ہو جاتی ہے۔ لہیا کو خیال تھا
 کہ وسیل کوف بہت مال دار آدمی ہے اور اسے ڈھیروں روپیہ خرچ
 کرنے کو ملے گا، مگر وسیل کوف ایک بندھی ہوئی رقم سے جو لہیا کو بہت
 ناگہانی معلوم ہوتی ہے زیادہ دینے پر راضی نہیں ہوتا اور ماں کے اکٹھے
 پر وہ وسیل کوف کو چھوڑ کر اپنے گھر واپس چلی جاتی ہے۔ اس کی ماں
 اپنا کل سرمایہ گنوا چکی ہے، ”ٹھاٹھ“ سے رہنے کے واسطے اپنے شوہر کی
 جائیداد تک بکوا دی ہے اور چونکہ دونوں کے پاس کچھ نہیں اور قرض خواہ
 مکان اور کپڑے تک نیلام کرانے کی دھمکی دیتے ہیں لہیا کو مجبوراً
 شوہر کے پاس واپس آنا پڑتا ہے۔ لیکن وہ با اصول آدمی ہے اور لہیا کے
 واپس آ جانے پر وہ اسی وقت راضی ہوتا ہے جب وہ اس کی چند

شرطیں منظور کر لیتی ہیں، یعنی یہ کہ لیدیا دو سال تک گانویں رہ کر خانداری
 کافن سیکھے گی، اس کے بعد بھی فضول خرچی نہ کرے گی اور ریسا نہ
 مشاغل کے بجائے اپنے شوہر اور اپنے گھر بار کو دل چسپی کام کر سمجھے گی۔
 لیدیا کو اپنے تمام مصیبتوں کے باوجود یہ شرائط منظور نہیں، لیکن اس
 آڑے وقت میں اسے معلوم ہو جاتا ہے کہ شرفا میں سے اس کے بچنے
 دوست اور اس کے حسن کے مدح سرائتھے وہ سب جھوٹے اور
 دغا باز ہیں اور اگر وہ شوہر کی شرائط منظور نہ کرے گی تو اسے قاقہ کرنا
 ہوگا۔ اسی سلسلے میں اسے یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ مفت کی دولت
 کسی کے ہاتھ میں ٹھیکرتی نہیں اور امیر وہی ہو سکتا ہے اور رہ سکتا ہے جو
 اپنی محنت سے روپیہ کمائے۔ لیدیا کا یہ تجربہ حاصل کر کے مجبوراً راہ
 راست پر آنا ڈرامے کے ناظرین کے لیے خوشی کا باعث نہیں ہوتا،
 لیدیا نہایت درجہ بے اصول عورت ہے، نفس پرستی کے سوا اس کے
 دل میں اور کسی جذبے کا گزر نہیں اور اسے دولت کی اتنی شدید ہوس
 ہے کہ وہ اس پر اپنی عصمت اور آبرو تک شمار کرنے کو آمادہ رہتی ہے،
 ناظرین کے دل میں یہ کھٹکا رہتا ہے کہ اگر وسیلہ کوف جیسے با اصول
 اور نیک آدمی کی جگہ اسے اور کوئی صاحب دولت ملتا جسے اس کی
 زندگی کے بگڑنے اور بننے کی پروا نہ ہوتی اور وہ صرف اس کے حسن کا
 خریدار ہوتا تو لیدیا اپنے آپ کو بیچ دینے میں تامل نہ کرتی۔ بے کاری
 اور مفت کی دولت نے روسی شرفا کو اس حد تک بگاڑ دیا تھا!

لدیا کی سیرت ڈراما نویس کی ایجاد نہیں۔ روس میں ایک طرف
 آزادی، دوسری طرف وہ رئیسانہ عادات جو اس دور کے شرفاء کو درگت
 میں ملی تھیں اور ایک طوق کی طرح ان کے گلے میں پڑی تھیں، ان
 دونوں نے مل کر بہت سی عورتوں کو لدا کا سائبانہ بنا دیا تھا۔ اس اثر
 سکی کے اس دور کے ڈراموں میں جو لوگ ہماری نظروں کے سامنے
 آتے ہیں ان کے جذبات میں کوئی شدت ہی نہ نشان، ان کی
 محبت پر یا تو شہوت اور نفیس پرستی کا رنگ غالب آ جاتا ہے، یا وہ
 ادنیٰ اغراض پر منتشر کی جاتی ہے، مردوں کے حوصلے یہ ہوتے ہیں کہ
 عیش کریں، عورتوں کے یہ کہ اپنے حسن اور رئیسانہ لباس اور بہن
 سہن سے مردوں کے دل بھائیں اور دوسری عورتوں میں رشک
 اور حسد پیدا کریں۔ خانگی زندگی کی کسی کتاب نہیں، مرد اور عورتیں
 یکساں اس سے گریز کرتی ہیں اور بٹا چاہتی ہیں۔ مگر اسی وجہ سے
 کہ ان میں فرائض کا احساس نہیں، ان کی زندگی بالکل بگڑ جاتی ہے۔
 وہی لطف اندوزی جس کے پیچھے سب کچھ کھو یا جاتا ہے ایک نایاب
 دولت بن جاتی ہے، اور وہی آزادی اور تہذیب جو کسی زمانے میں
 رومیوں کو جنت معلوم ہو رہی تھی حاصل ہونے کے بعد دوزخ بن
 جاتی ہے۔

”امیرکنواریاں“ (۱۸، ۵) اور ”بے چہیزدالی“ (۱۸، ۸)
 دونوں ڈرامے روسی سماج کی اس کیفیت کو خوب ظاہر کرتے ہیں۔

پہلے میں ایک لڑکی کی سرگزشت دکھائی گئی ہے جو شروع سے رُمیا نہ زندگی کی عادی بنا دی گئی تھی اور چوں کہ وہ اپنے آپ کو رئیس سمجھتی ہے اسے اس کی بھی فکر نہیں کہ اس کی زندگی کا طریقہ درست ہے یا نہیں اور اس کی اخلاقی حالت کی نسبت نیک چلن لوگوں کی رائے کیا ہے۔ اتفاق سے اس کی ایک نوجوان سے ملاقات ہوتی ہے جو بچپن میں اسے جانتا تھا، وہ لڑکی پر عاشق ہو جاتا ہے، مگر جب اس کے چال چلن کا حال کھلتا ہے تو وہ غصے میں اسے بہت ملامت کرتا ہے اور یوں لڑکی حقیقت سے آگاہ ہوتی ہے۔

”بے جینر دالی“ کی ہیروئن لاریسا کو اس طرح آگاہ کرنے والا بھی کوئی نہیں ملتا۔ اس کی ماں مفلس ہے مگر امیروں کی طرح رہتی ہے کیوں کہ اس کی عادت ایسی ہے، اسے امید ہے کہ کوئی نہ کوئی خوش حال نوجوان لاریسا کے حسن سے فریفتہ ہو کر اس سے شادی کر لے گا۔ لاریسا کے عَمَن کے تو بہت سے لوگ فریفتہ ہوتے ہیں، اس سے شادی کرنے کی خواہش کسی کو نہیں ہوتی، اس کے سارے قدردان اسے دہشتہ بنا کر رکھنا چاہتے ہیں۔ آخر میں وہ ایک ادنیٰ سرکاری ملازم سے جس کا اس کے بارہ دوست مذاق اڑایا کرتے تھے، منگنی کر لیتی ہے، کیونکہ یہ عیش اور شراب خواری کی زندگی سے عاجز آگئی ہے اور سکون کے لیے تڑپنے لگتی ہے۔ لیکن اسے چین نصیب نہیں ہوتا۔ وہ اپنے منگیتر سے بالکل محبت نہیں

کرتی اور وہ محبت کے لائق بھی نہیں۔ شادی سے چند روز پہلے ہی حیب اس کا ایک پُرانا آشنا پر اتوف جس پر وہ اس کی سروسہری اور لاؤ بالی پن کے باوجود دل و جان سے فداہری، یکبارگی نمودار ہوتا ہری، تو وہ اپنے منگیتر اور اپنے شادی کے ارادوں کو بھول جاتی ہری اور براتوف کے ساتھ ایک نابج گانے اور شراب خواری کے جلسے میں شریک ہوتی ہری، جہاں جانے سے اس کے منگیتر نے اسے منع کیا تھا۔ اس کا منگیتر ویسے بھی خطی اور کمینہ آدمی ہری۔ اس دفعے کے بعد رقابت کے جوش میں وہ لاریسا کے پستول مار دیتا ہری۔ لاریسا کو زندگی کے اس انجام پر بھی افسوس نہیں ہوتا، وہ گولی لگتے ہی اپنے منگیتر کا شکر یہ ادا کرتی ہری اور اس سے پستول مانگ لیتی ہری، تاکہ سب سمجھیں اس نے خودکشی کر لی ہری۔

لاریسا کی سیرت میں بہت سی خوبیاں ہیں اور سب سے بڑی خوبی اس کی گہری اور سچی محبت ہری، جو اس کے لیے ہر ایشا کو آسان بنا دیتی ہری۔ مگر جس طرز معاشرت میں والدین اپنا کل سرمایہ بٹھا ٹھ سے رہنے میں صرف کریں، اولاد کے لیے گھر بار کے بجائے عیش اور آسائش کی امیدیں کریں اور اپنے اور اپنی اولاد کی نیک نامی کی فکر ہی نہ کریں اس میں لاریسا جیسی نازک اور نفیس مذاق رکھنے والی مہنتوں کو موت کے سوا اور کسی نعمت کا شکر یہ ادا کرنے کا موقع نہیں ہو سکتا۔

”آخری شکار“ (۱۸۸۷) اور ”حسین مرد“ میں اس تردف سکی نے بتا کر ناجا باہی کہ عورتوں میں آزادی کی خواہش تو پیدا ہو گئی ہے مگر اس کے صحیح استعمال کی وہ اہل نہیں ہیں، کیوں کہ وہی ایتار کا جذبہ جو نسوانی سیرت کا زیور اور مایہ ناز ہے۔ انھیں چالاک اور بے اصول مردوں کا شکار بناتا ہے۔ اس کے آخری ڈرامے، ”بیگناہ مجرم“ (۱۸۸۳) اور ”اس دنیا کے لیے نہیں“ (۱۸۸۴) اس کے اس عقیدے کو بھی ظاہر کر دیتے ہیں کہ معاشرت کے تمام تغیرات کے باوجود اولاد کی محبت اور گھریلو زندگی کی خواہش روسی سوسائٹی میں ناپید نہیں ہو گئی ہے۔ ”بیگناہ مجرم“ ایک لڑکی لیو بوٹ اوت راوی ناکا قصہ ہے جسے ایک نوجوان موروٹ سے محبت ہو گئی ہے۔ دونوں میں میاں بیوی کے تعلقات ہو گئے ہیں، ایک لڑکا بھی ہوا ہے مگر نوجوان نے نکاح نہیں کیا ہے۔ آخر میں لڑکی کو ایک ہی روز میں یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کا شوہر شادی کرنے والا ہے اور لڑکا جو بیا رہتا، قریب مرگ ہے۔ وہ بھاگی ہوئی بچے کے پاس جاتی ہے اور جب موت اس کی آنکھیں بند کر دیتی ہے تو وہ گھر چھوڑ کر نکل کھڑی ہوتی ہے۔ اوت راوی نا اپنا نام بدل کر ٹیٹر میں لوکری کر لیتی ہے اور بہت جلد مشہور ہو جاتی ہے، کیوں کہ اس کے غم نے اسے اس فن کے لیے بہت موزوں بنا دیا تھا۔ سترہ اٹھارہ سال تک وہ روس اور مختلف یورپی ملکوں کی گشت لگاتی ہے اور پھر اتفاق سے پیشے کے سلسلے میں اپنے پیدائشی

شہر میں بھی آتی ہے۔ وہ نوجوان جس سے پہلے اس کا تعلق تھا، اب ایک معزز شخصیت اور رئیس اعظم ہو گیا ہے۔ اس کی بیوی مریجی ہے اور جب وہ اوت راوی نا کو پہچان لیتا ہے تو شادی کی خواہش ظاہر کرتا ہے۔ لیکن اوت راوی نا کو کہیں سے پتا چل گیا ہے کہ اس کا لڑکا مرانہیں تھا بلکہ اب بھی زندہ ہے اور وہ اسی کو شادی کی شرط بتاتی کہ موردن لڑکے کو تلاش کر لائے۔ موردن وعدہ کر لیتا ہے، مگر حیا سے باقاعدہ جستجو کرنے سے باز رکھتی ہے اور آخر میں وہ اس کا اظہار بھی کر دیتا ہے۔ اوت راوی نا کو اپنے عشق کی داستان یاد ہے اور اس کی مامتا بدنامی کے خیال کو اس کے دل میں نہیں آنے دیتی ہے۔ موردن سے وہ شادی نہیں کرتی، مگر اسے اپنا لڑکا مل جاتا ہے اور اسی کو وہ اپنی انتہائی کامیابی سمجھتی ہے۔

”اس دنیا کے لیے نہیں“ اس منطق کے اختلاف کو واضح کرتا ہے جو غورتوں کے ذہن کو گھر گھرستی کے معاملات اور ازدواجی زندگی کے تنگ دائرے تک محدود رکھتا ہے اور مردوں کو اسی دائرے کے باہر لاکر عام زندگی کی دلچسپیاں اور متاغل میں شریک ہونے پر مجبور کرتا ہے۔ کوچوٹ، ایک خوش حال آدمی نے دولت کی ہوس میں ایک لڑکی سے شادی کی ہے جس کی تربیت خاندان میں ہوئی ہے اور قدیم اصولوں کے مطابق وہ شوہر کا فرض سمجھتی ہے کہ فرصت کا سارا وقت گھر پر صرف کرے اور کبھی سیر یا تفریح یا ملاقات

کے لیے جانے تو اپنی بیوی کے ساتھ کسی غیر عورت کی طرف آنکھ
 اٹھا کر بھی نہ دیکھے اور ان تمام تفریح کے ذریعوں کو جو اخلاق پر بُرا
 اثر ڈال سکتے ہیں اپنے اوپر حرام سمجھے، چاہتی تو سب عورتیں یہی ہیں
 مگر تجربہ بہت جلد ظاہر کر دیتا ہے کہ یہ خواہش پوری نہیں ہو سکتی۔
 لیکن کوچوئن کی بیوی کسے نیا اس دنیا کے لیے نہیں بنی ہو وہ
 کئی سال کے تجربے پر بھی اپنی رائے نہیں بدلتی، بلکہ اس کی کنوار پن
 کی آرزوئیں اور زیادہ شدید ہو جاتی ہیں۔ کوچوئن کی طبیعت ایسی ہے
 کہ بیوی کی سیرت اور خیالات سے واقف ہونے کے باوجود وہ اپنا
 رویہ ذرا بھی نہیں بدل سکتا اور اس کشمکش کا انجام یہ ہوتا ہے کہ کسے نیا
 بیمار پڑ جاتی ہے اور اسے ایک آخری صدمہ ایسا پہنچتا ہے کہ وہ اس
 دنیا ہی سے رخصت ہو جاتی ہے۔

اوس تردف سکی کے ساتھ ان لوگوں کا ذکر بھی لازمی ہے جنہوں نے
 اس کے ڈراموں کو اسٹیج پر کامیاب بنایا اور صرف ڈراما نویس ہی
 کے حوصلے نہیں پورے کیے بلکہ اس کے ڈراموں کا حق بھی ادا کیا۔
 ٹھیٹر دس کے مالکوں اور منتظموں سے تو اوس تردف سکی کو ہمیشہ شکایت
 رہی، لیکن روسی ایکٹروں سے وہ ہمیشہ خوش رہا اور ان لوگوں نے
 بھی ڈراما اور ڈراما نویس کی ترجمانی کرنے کی کوشش میں کوئی دقیقہ
 باقی اٹھا نہیں رکھا۔ اوس تردف سکی کے حقیقت نگاری کے اصول
 نے اس کوشش میں انھیں مدد بھی بہت پہنچائی اور ایکٹروں نے

نذاتِ خود قومی زندگی کا جو مشاہدہ کیا تھا اسے وہ پورے طور پر کام میں لاسکے اور ڈراموں کی ساخت اور مصنف کی وسعتِ نظر نے اس کا بھی امکان پیدا کر دیا کہ وہ فن میں جدتیں کر سکیں۔ اکثر یہ ہوتا تھا کہ ناظرین میں سے کوئی ہو بہو اپنی ہی جیسی شکل کا آدمی ایسٹج پر دیکھ کر دنگ رہ جاتا ہے اور ایکٹروں نے ہر طبقے اور پیشے کے لوگوں کی بات چیت، خاص انداز اور حرکتیں اس طرح اپنا لیں کہ اس خاص طبقے والے بھی نقل اور اصل میں امتیاز نہ کر سکے۔ لیکن محض نقل میں کامیابی حاصل کرنے سے اس تردد و سکی کا سارا مفہوم اور اس کی حقیقت نگاری کا پورا مطلب ادا نہیں ہو سکتا تھا۔ ایکٹروں پر یہ بھی لازم تھا کہ جن سیرٹوں کی وہ نقل کریں ان کے ظاہر کے ساتھ ان کا باطن یعنی ان کا فلسفہ حیات اور ان کی ذہنیت بھی اختیار کر لیں اور اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ اپنے ذہن میں ہی وسعت اور ہمہ گیری پیدا کریں جو ڈراما نویس کے ذہن میں تھی اور اسی طرح ہر سیرت میں محو ہو جانا سیکھیں۔ یہ شرط پوری کرنا دشوار ہے اور یہ بھی صحیح ہے کہ ”اس سعادت بزورِ بازو نیست“ لیکن روس میں اس وقت ایسے صاحبِ ہنر موجود تھے جنہوں نے یہ غلطی بھی پوری کر دی اور اس تردد و سکی کے ڈراموں کی خوبیاں دوبالا ہو گئیں۔

تیسرا باب

(اوس تروف سکی سے انقلاب تک)

اوس تروف سکی کے ہم عصر انشا پر داؤد دل میں سے کئی نے ڈراما نویسی کے میدان میں طبع آزمائی کی، لیکن اس فن کی قدرتی استعداد کسی میں نہیں تھی اور کسی نے مشق اور محنت بھی جیسی کہ چاہیے نہیں کی۔ تورگینف نے ۱۸۴۸ اور ۱۸۵۱ کے درمیان کئی فرحیہ ڈرامے لکھے جو زبان کے لحاظ سے بہت اعلیٰ ہیں، مگر فن ڈراما نویسی کے اعتبار سے کوئی غنیمت نہیں رکھتے۔ الکساندر تالسٹائی کے تین تاریخی ڈرامے، ”ادان ہیت ناک کی موت“ ”بورس گودولوف“ اور ”زار فیوڈر اوڈوچ“ اس صنف کے خاصے نمونے ہیں اور روسی دربارہ کے جو مناظر ان میں دکھائے گئے ہیں وہ اسٹیج پر بہت شان دار اور موثر بنائے جاسکتے ہیں۔ الکساندر تالسٹائی زاراٹکساز دوم کا قریبی دوست تھا، درباری زندگی سے خوب واقف تھا اور وہ دشواریاں جو روس جیسے ملک کے بادشاہ کو گھیرے رہتی تھیں وہ

قوتیں جو اسے راہ راست پر آنے سے روکتی تھیں سب تانائیں کی نظر میں تھیں۔ اس وجہ سے وہ تاریخی ڈرامے لکھنے کے لیے بہت موزوں تھا اور اپنی واقفیت اور تجربے سے اس نے فائدہ بھی اٹھایا۔ مگر اور تاریخی ڈراموں کی طرح تانائیں کی تصانیف میں بھی دو مائیت اور مصنف کے اپنے خیالات اور تخیل نے ذرا زیادہ دخل دے دیا ہے اور معاشرتی حیثیت سے ان کی قدر کچھ کم کر دی ہے۔

مقبولیت اور جدت خیال کو دیکھا جائے تو اس تروف سکی کے ڈراموں کے بعد ناول نویس پی سم سکی کے ڈراما ”بدبختی“ کا درجہ آتا ہے۔ ڈراما کا موضوع ۱۸۶۱ء کی اصلاح سے پہلے کے زمینداروں اور کسانوں کے تعلقات ہیں۔ قدرت نے نہ زمیندار کو اخلاقی حس سے محروم رکھا ہے نہ کسان کو، دونوں میں معقول زندگی بسر کرنے کی صلاحیت موجود ہے، لیکن ”بدبختی“ میں ہم دیکھتے ہیں کہ ایک دخیانہ قانون سب کی سیرتوں کو اس طرح بگاڑ دیتا ہے کہ وہ نیم مجرم ہو کر رہ جاتے ہیں اور انتہائی بداخلاقی کی حرکتیں کرتے ہیں۔ ڈراما کا پلاٹ یہ ہے کہ ایک کسان نے، جو قانون کے رو سے غلام تھا، اتنی آنا دی حاصل کر لی ہے کہ گانو چھوڑ کر دارالسلطنت میں اپنی قسمت آزمانے کو جا کے وہ کئی سال وہاں رہ کر واپس آتا ہے تو کیا دیکھتا ہے کہ اس کی بیوی کا زمیندار آقا سے ناجائز تعلق ہو گیا ہے اور آقا سے اس کے ایک بچہ بھی ہو چکا ہے۔ کسان غصے میں آکر بچے کو مار ڈالتا ہے اور پھر اسے اپنے

جرم کی سزا بھگتنا پڑتی ہے۔ جو لوگ غلامی کے قانون سے نفرت کرتے تھے انھیں یہ ڈراما بہت پسند آیا، ہم بھی کسی ایسے قانون کو نفرت ہی کی نگاہ سے دیکھیں گے، لیکن ”بدبختی“ کے بارے میں یہی خیال ہوگا کہ اس میں نفاست اور شائستگی نہیں اور اس کی دلچسپی کا دار و مدار ایسی واردات پر ہے جو حد درجہ ناگوار ہوتی ہیں اور یہ ڈراما مشکل سے یقین کیا جاسکتا ہے کہ وہ عام حقیقت کا آئینہ ہیں۔

”بدبختی“ کے علاوہ اور بہت سے ڈرامے اسی زمانے میں لکھے گئے جن کا محرک خالص ادبی شوق تھا یا اصلاح کی خواہش۔ کو بی لن، پالم (۱۸۲۲-۱۸۸۵) اور پوتیہ خن (۱۸۲۹-۱۹۰۲) ان ڈراما نویسوں میں سب سے ممتاز مانے جاتے ہیں۔ کو بی لن کا انداز طنزیہ ہے، اور اس کے ڈرامے جن میں ”کریش جن سکی کا نکاح“ سب سے زیادہ کامیاب ہوا، سرکاری ملازموں کی رشوت ستانی اور دوسرے عیبوں کو ظاہر کرتے ہیں۔ پالم کا مقصد روسی زمینداروں کی سیرت اور فلسفہ حیات واضح کرنا تھا اور اس طبقے کے جو نمونے اس نے پیش کیے وہ تو گنہگار کی مشہور سیرتوں سے کچھ کم حقیقت نما نہیں۔ پوتیہ خن کا موضوع وہی ہے جو کو بی لن کا، فرق بس یہ ہے کہ اس کے ڈراموں میں جن سرکاری ملازموں کی قلعی کھولی گئی ہے وہ ۱۸۶۱ کی اصلاحوں کے بعد کے ہیں، وہ رشوت نہیں لیتے مگر کسی کا کام بھی نہیں کرتے اور ”ایمانداری“ نے ان کی خود پسندی اور خود غرضی کو اس حد تک پہنچا دیا ہے کہ وہ

ملک کے لیے اپنے پیش رووں سے بھی بدتر ثابت ہوئے ہیں۔
 ان تمام ڈراما نویسوں اور ڈراموں کو دیکھتے ہوئے بھی تسلیم کرنا
 پڑتا ہے کہ اوس تروف سکی کے مرنے پر جو عہدہ خالی ہوا اس کا کوئی حق دار
 ثابت نہ ہوا اور جب ۱۸۹۸ میں ماسکو آرٹ ٹھیٹر نے چخوف کا پہلا
 ڈراما دکھایا تب ہی لوگوں نے محسوس کیا کہ روس کو اوس تروف سکی کا
 ایک جانشین نصیب ہوا ہے۔ یورپ کے اہل ذوق میں اوس تروف سکی
 سے بہت پہلے چخوف کا چرچا ہوا اور یورپ میں چخوف ہی خاص روسی
 طرز کا موجد اور استاد مانا جاتا ہے، لیکن اگر اس کے ڈراموں کا اوس تروف
 سکی کے آخری کام سے مقابلہ کیا جائے تو ظاہر ہو جائے گا کہ چخوف
 نے کوئی نیا طرز ایجاد نہیں کیا بلکہ اوس تروف سکی کے طرز کو ایک
 نیا رنگ دیا ہے۔ اسی طرح ماسکو آرٹ ٹھیٹر کو بھی ایک بالکل ہی نیا
 منظر نہ سمجھنا چاہیے۔ ایکٹنگ کا جو مسلک اس ٹھیٹر نے اختیار کیا اس
 میں پہلا قدم اوس تروف سکی نے رکھا تھا اور اس ٹھیٹر کے وہ اوصاف
 جو یورپ میں نئے اور بہت نراے سمجھے گئے ان ایکٹروں میں موجود تھے
 جنہوں نے اوس تروف سکی سے سبق لیا تھا اور جو گفتگو اور واقعات
 کے سہارے اس خاص فضا کو بھی پیدا کر سکتے تھے جس میں ڈراما کی سیرتیں
 ڈوبی ہوئی ہوتیں۔ چخوف کے ڈراموں کا پورا اثر اسی وقت ہوتا ہے
 جب وہ اسٹیج پر دیکھے جائیں اس لیے کہ وہ اسٹیج ہی پر جا کر مکمل ہوتے
 ہیں اور انہیں ایکٹری تکمیل کو پہنچا سکتے ہیں۔ ایکٹروں کو فن کے وہ

بھید بتانا کہ بھیس بدلنے کے ساتھ ان کی کایا بھی پلٹ جائے اوس تردف
سکی کا کام تھا اور اس کی رہبری کے بغیر روسی ایکٹروں میں وہ مہارت
ہرگز پیدا نہ ہو سکتی تھی جو چخوف کے ڈراموں میں جان ڈالنے کے لیے درکار
چخوف کے ڈراموں کی سب سے نمایاں خصوصیت، جس پر یورپی
نقادوں کی سب سے پہلے نظر پڑی، پلاٹ کی عدم موجودگی، ہر خصوصیت
ہم بیان کر چکے ہیں کہ اوس تردف کی میں بھی پائی جاتی ہے، چخوف نے
ڈراما بالغہ کر کے اپنے آپ کو قصہ سنانے کی پابندی سے بالکل آزاد
کر لیا، جس زندگی کے مناظر وہ دکھانا چاہتا تھا اسے انتہائی وسعت
دے دی اور ان سیرتوں اور روحانی کیفیتوں کو جو اس کا موضوع
تھیں اپنی اصلی اور مکمل صورت میں پیش کیا۔ اس کے زمانے تک وہ
تمام مسائل جن پر اوس تردف کی بحث کرنا ضروری سمجھتا تھا اپنی اہمیت
کھو چکے تھے، معاشرت میں جو تبدیلیاں ہو سکتی تھیں ہو چکی تھیں، اب
ایسی رکاوٹیں نہیں رہی تھیں جو حوصلے کو دبا کر ابھارتی ہیں بس سیاسی
غلامی باقی تھی اور اس سے حوصلے ٹکرا کر پاش پاش ہوتے رہتے تھے۔
روس ایک جنگل تھا جسے باغ بنانے کی خاطر لوگ درختوں کو کاٹ کر
برابر کر چکے تھے، لیکن جب ایک صاف میدان نکل آیا تو اسے
زرخیز اور شاداب بنانے کی ہم سے سب جی چڑانے لگے اور روسی
زندگی کو دیرانی کی ہوا لگ گئی۔ چخوف کا زمانہ شدید مایوسی اور پست
ہمتی کی فضا میں ڈوبا ہوا تھا اور زندگی کی جہل پہل پر بھی سناٹا چھایا

رہتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں چخوف کے ڈراموں میں انفرادی زندگی کے چھوٹے مقاصد بھی نہیں ملتے اور اس کشمکش کا تو نام و نشان بھی نہیں جسے پیش کرنے کے لیے ڈراما کا فن ایجاد کیا گیا۔

چخوف کا کمال اس میں ہے کہ اس نے ایسی سیرتوں اور ایسی زندگی کو جو مقاصد ہی نہیں بلکہ شکل سے محروم تھی ڈراما کی شکل دے دی۔ قصہ سنانا، نصیحت کرنا، اصلاح کو مد نظر رکھ کر عام زندگی کے بصیرت افروز نمونے منتخب کرنا آسان ہے، ایسے لوگوں کے حالات کو جو نہ کچھ ہونا چاہیں اور نہ کچھ کرنا چاہیں، ایسی معاشرت کو جس میں کوئی تحریک باقی نہ رہی ہو ایک سوٹر ڈراما بنا دینا نہایت ہی نازک خیال، نکتہ ہیں اور اپنے فن میں کامل آرٹسٹ کا کام ہو سکتا ہے۔ بظاہر چخوف کے سامنے ڈراما کے لیے کوئی سامان ہی نہ تھا، لیکن اس نے اپنے ہم وطنوں کی بود و باش، ان کی ناکامیوں اور حسرتوں کو لے کر ایک پوری دنیا آباد کر لی ان کی سیرتوں کے اس پہلو کو جو سب سے زیادہ عمومیت رکھتا تھا خاص انداز سے نمایاں کر کے ان کی سرگزشت اور ان کی کیفیتوں کو ایک لطیف ہنگامہ بنا دیا۔ چخوف کے ڈرامے اپنے زمانے کی حقیقت کو یعنی ایک نسل اور اس کی تہذیب کو فنا ہوتے ہوئے دکھاتے ہیں، مگر ناکامی اور زوال کی یہ کیفیت عام انسانی احساسات کا عکس ہے، روسی تاریخ کا ایک دور ہی نہیں، ہماری آپ بیتی کا ایک ٹکڑا ہے۔

چخوف کے ڈراموں میں پلاٹ نہیں ہوتا، بلکہ غور کیا جائے تو

فضا کے سوا کچھ ہوتا ہی نہیں۔ جھوٹ نے حقیقت کا خیال کر کے معاشرتی مقاصد اور ان سطحی اور گہرے تعلقات کو جو یہ مقاصد لوگوں کے درمیان پیدا کرتے ہیں نظر انداز کیا اور آدمی آدمی کے رشتے کو بالکل ہی توڑ دیا۔ اس کے ڈراموں کی ہر سیرت ایک بالکل جدا ہستی رکھتی ہے، نگاہوں کے ملنے پر بھی دل دور رہتے ہیں اور محبت کی تیز آہنج بھی دو ہستیوں کو گلا کر ایک نہیں کر سکتی۔ وہ سمجھتا تھا کہ انسان اتنا تنگ نظر، خود غرض اور سرد مہر ہوتا ہے کہ اس کے وہ اعلیٰ جذبات جن پر وہ ناز کرتا ہے، یا وہ حوصلے جو زندگی میں ربط اور ہم آہنگی پیدا کرتے ہیں اس کی سرشت کے ان عیبوں پر غالب نہیں آ سکتے۔ جھوٹ کے ڈراموں کی گفتگو اکثر بے سر پر ہوتی ہے، ہر شخص اپنی بات کہے جاتا ہے، دوسرے کی سمجھنا تو درکنار نہ سننا ہی نہیں، ہر شخص اپنی ذات میں محور رہتا ہے اور اپنی آرزوؤں اور حسرتوں کے آگے کچھ دیکھتا ہی نہیں۔ یہ بیگانگی جانوروں کی سی بے تعلقی نہیں ہے، ایک مجبوری معلوم ہوتی ہے، ایک سزا جسے سب کو یکساں بھگتنا پڑتا ہے اور جس کا سب کو صدمہ ہوتا ہے۔ سب ذات کی اس کال کو ٹھری سے نکلنا چاہتے ہیں، ایسی جماعت بننا چاہتے ہیں کہ جس پر وہ اپنی انفرادیت نثار کر سکیں، لیکن انھیں نہ اپنی ذات میں ثبات اور استحکام نظر آتا ہے اور نہ جماعت میں، وہ نہ درخت کی طرح زمین کو مضبوط پکڑ سکتے ہیں نہ پانی کے قطروں کی طرح دریا بن کر بہ سکتے ہیں، بس ایک غبار ہیں کہ جس کا اٹھنا بیٹھنا اس کے اپنے اختیار میں نہیں بلکہ بے مقصد

حادثات کا سب سے حقیر اور بے معنی پہلو ہے۔

چخوف کے نقطہ نظر کی تمام خصوصیات اس کے پہلے ڈرامے ”ادانوف“ میں پائی جاتی ہیں۔ ادانوف ایک حوصلہ مند نوجوان ہے جو خاصے مفید کام میں مشغول ہے اور روسیوں اور یہودیوں کے درمیان تعصب کو مٹانے کے خیال سے اس نے ایک یہودن سے شادی کی ہے۔ سیرت کی ناموافقت سے دونوں میں ناچاقی پیدا ہو جاتی ہے، جس کے صدمے سے ادانوف کی بیوی کو دق ہو جاتی ہے۔ بیوی کی بیماری اور آئے دن کی مالی دشواریاں ادانوف کی زندگی کو بالکل بے لطف کر دیتی ہیں اور اس کا مزاج بہت بگڑ جاتا ہے۔ پہلے تین ایکٹ میں میاں بیوی کے تعلقات کا یہ رنگ ہی بس ڈراما کا موضوع ہے اور باقی جو سیرتیں ہیں وہ اپنے اپنے خیال میں محو اور ایک دوسرے سے بے خبر رہتی ہیں۔ بیوی کی بیماری کے زمانے میں ادانوف اور ایک لڑکی ساشا کے درمیان ہمدردی اور ایک نئی زندگی تعمیر کرنے کا اشتیاق خاص لگاؤ پیدا کر دیتا ہے اور (چوتھے ایکٹ میں) جب ادانوف کی بیوی کا انتقال ہو جاتا ہے تو ساشا ادانوف کو خوش رکھنے اور اس کے دل سے گزشتہ غموں کی یاد مٹانے کا بیڑا اٹھاتی ہے۔ لیکن بیوی کے مرنے پر ادانوف کی طبیعت میں ایک اور انقلاب رونما ہوتا ہے، پہلے وہ ہمدردی کی تلاش میں تھا تو اب اپنی سرشت کی خرابیوں کا ہر وقت ذکر کرتا رہتا ہے اور پچھلی غلطیوں اور ناکامیوں کا اس کی اپنی

طبیعت سے جو تعلق تھا اسے بیان کرتا رہتا ہے۔ ساشا کا لڑکھانہ دل جو ایثار پر آمادہ ہو گیا تھا اس قسم کی ایذا رسانی کو برداشت نہیں کر پاتا، وہ اپنے مستقبل سے بہت مایوس ہو جاتی ہے مگر اداؤں سے شادی کرنے کے ارادے پر قائم رہتی ہے۔ ڈراما کے آخری سین اس بے تعلقی کو جو تمام اشخاص کے درمیان تھی بالکل واضح کر دیتے ہیں، سب محسوس کرتے ہیں کہ کوشش کرنے پر بھی وہ ایک دوسرے کی طبیعت کو سمجھ نہیں سکتے اور یہ احساس سب میں ایک عجیب سی بے چینی پیدا کر دیتا ہے۔ آخر میں اداؤں، جو یہ نہیں چاہتا کہ اس کی اپنی زندگی کو سدھارنے کی امید میں ساشا کا مستقبل خطرے میں ڈالا جائے، خود کشی کر لیتا ہے اور ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایسے حالات اور ایسی سیرتیں زندگی میں جو گتھیاں ڈال دیتی ہیں انھیں موت کے سوا کوئی سلجھا نہیں سکتا۔

”اداؤں“ میں بہت صفتوں کے ساتھ وہ خامیاں بھی موجود ہیں جن سے تجربے اور مشق کی کمی کا پتہ چلتا ہے۔ مختلف اشخاص میں جس طرح کی بے تعلقی دکھائی گئی ہے اس پر مبالغے کا شبہ ہوتا ہے، اداؤں کی سیرت اچھی طرح سمجھ میں نہیں آتی اور نفسیات کے معنی پیش کرنے میں سبب اور نتیجے کا اصول کچھ نظر انداز کیا گیا ہے۔ جنون کی ڈراما نویسی کے تمام اوصاف اس کے دوسرے ڈرامے ”بگلے“ میں پائے جاتے ہیں اور انسان کی طبیعت اور اس کی زندگی کی فضا کا ایک

دوسرے سے جو تعلق ہے وہ بھی صاف ظاہر ہو جاتا ہے۔ ”انوانوں“ کے مقابلے میں یہ ہم کو کہیں زیادہ افسردہ اور اُداس کرتا ہے اور اگر پہلے درجے میں ایک اوانوں تھا جسے زندگی کی دشواریوں نے عاجز اور دیوانہ کر دیا تھا تو ”بگلے“ میں کئی سیرتیں ہیں جن کی یہی کیفیت ہے اور جنہیں چند روز کے لیے بھی ساشا کی طرح کا کوئی قدردان اور غم میں شریک ہونے والا نہیں ملتا۔ لیکن بعد کے تینوں ڈراموں ”وانیا مامون“ ”تین بہنوں“ اور ”باغ“ کی طرح یہ بھی جنحوت کے فن کا کامل نمونہ ہے، اس میں کوئی بات ادمووری، کوئی رنگ ہلکا یا پھیکا نہیں رہ گیا ہے۔

”بگلے“ میں کوئی مرکزی مسئلہ یا سیرت نہیں۔ ہر ایک کا اپنا الگ دکھ ہے اور سب یکساں بے بسی میں تڑپتے رہتے ہیں۔ آرکا دینا ایک سن سے اُترتی ہوئی ایکٹرس ہے جو دن رات بس اپنی شہرت اور کامیابیوں کے خیال میں ڈوبی رہتی ہے، یہاں تک کہ اسے اپنے بیٹے کو کنستانٹن سے بھی، جو ایک ہونہار، حوصلہ مند اور شاعرانہ مزاج کا نوجوان ہے کوئی مطلب نہیں۔ کنستانٹن سے آرکا دینا کے داروغہ کی لڑکی ماشا کو ایسی محبت ہے کہ اس کا نام ہی بکھرنے میں ماشا کو بڑا مزہ آتا ہے، مگر کنستانٹن کو اس سے ذرا بھی کچھ نہیں اور اس کو اسی سے الجھن ہوتی ہے کہ ماشا اس کا نام لیا کرتی ہے۔ خود کنستانٹن تن کو پڑوس کے ایک زمیندار کی لڑکی نینا سے محبت ہے

مگر جب دنیا کی سرکار کا دینا کے یہاں ایک مشہور انشا پرداز تری گورن
 سے ملاقات ہوتی ہی تو وہ کوستان تن اور اس کی دوستی کو بالکل
 بھول جاتی ہی اور تری گورن پر عاشق ہو جاتی ہی۔ دنیا کو شہرت حاصل
 کرنے کی ہوس ہی، وہ ٹھیٹر میں نام پیدا کرنا چاہتی ہی اور شاید اسی
 امید میں کہ تری گورن کی سرپرستی اسے جلد کامیاب کر دے گی
 وہ کوستان تن کو چھوڑ دیتی ہی۔ لیکن تری گورن کچھ دنوں اس
 کی محبت سے تاجا نر فائدہ اٹھانے کے بعد اپنا یر تاؤ بدل دیتا ہی
 اور دوسری عورتوں کے پیچھے لگ جاتا ہی اور ٹھیٹر میں بھی دنیا کو
 قابلیت کی داد دینے والے نہیں ملتے، حسن کے خریدار ہی ملتے ہیں۔
 دنیا کا باپ خفا ہو کر اسے گھر سے نکال دیتا ہی اور شریف عورتیں
 اسے دیکھ کر منہ پھیر لیتی ہیں۔ پھر بھی دنیا اپنی شکست کو تسلیم نہیں
 کرتی اور آخری ایکٹ میں کوستان تن کو اپنا سارا ماجرا سنا کر کہتی
 ہی کہ میں یہ اور ایسے اور صدے برداشت کرتی رہوں گی۔ وہ
 جانتی ہی کہ کوستان تن کو اس سے سچی محبت ہی، یہ بھی جانتی ہی
 کہ دنیا میں بس وہی اس کی تمام لغزشوں کو معاف کر سکتا ہی اور
 اس کی قدر بھی کر سکتا ہی، مگر یہ سب جانتے ہوئے بھی وہ تری گورن
 کو نہیں چھوڑتی اور بُرا یر تاؤ اس کی محبت کو گھٹاتا نہیں بلکہ اور
 بڑھا دیتا ہی۔ اس آخری گفتگو کے بعد کوستان تن اپنے افسانوں
 وغیرہ کے مسودے جلا دیتا ہی اور اپنے گولی مار لیتا ہی۔

”بجگے“ میں جذبات کا جوا بھٹاؤ ہوا سے سلجھانا خالی ارادے کے بس کی بات نہیں ایک موقع پر ماشا ڈاکٹر ڈورن سے کہتی ہے۔
 ”میری مدد کیجیے، ورنہ میں کوئی بے تنگی حرکت کر بیٹھوں گی، اپنی جان لے لوں گی، تباہ ہو جاؤں گی... مجھے بڑا دکھ ہے، میرے دُکھ کا حال کوئی بھی نہیں جانتا، کوئی بھی۔ (ڈورن کے سینے پر سر رکھ کر) میں کوستان تن کو چاہتی ہوں !

بچارے ڈاکٹر کے پاس اس بیماری کی کوئی دوا نہیں۔ وہ جواب دیتا ہے۔
 ”تم سب کے اعصاب کیسے کمزور ہیں!.. اور محبت کی بھی کیا بھر مار ہے!.. (نرمی سے) مگر، میری بچی، میں کیا کر سکتا ہوں؟ میں کیا کر سکتا ہوں؟“

ماشانے خود ایک تدبیر سوچی ہے، جو وہ ترمی گورن سے بیان کرتی ہے۔

”میں یہ سب آپ کو اس خیال سے بتا رہی ہوں کہ آپ انشا پر داز ہیں... دیکھیے میں نے بیٹھے بیٹھے طو کیا ہے کہ کوستان تن کی محبت کو اپنے دل سے نکال دوں گی، جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دوں گی... محبت کرنا، جب کوئی امید نہ ہو، برسوں انتظار کرنا کہ شاید کچھ ہو جائے... لیکن جب میں شادی کر لوں گی تب محبت کرنے کی مہلت ہی نہ ہوگی، نئی فکریں اور ذمہ داریاں سب گزرے ہوئے زمانے کی یاد کو مٹا دیں گی۔ اور پھر یہ بھی ہو کہ ذرا تبدیلی

ہو جائے گی یہ

ماشائادی کر لیتی ہے اور اس کے ایک بچہ بھی ہو جاتا ہے، مگر
کونستان تن کی محبت اُسے دیوانہ بنائے رکھتی ہے۔ اسے یہ خیال
ہوتا ہے کہ اگر اس کے شوہر کا کسی اور شہر میں تبادلہ ہو جائے تو شاید
اس کی حالت سنبھل جائے گی، مگر اس کے انداز سے ظاہر ہوتا رہتا
ہے کہ یہ بھی خالی بہلاوا ہے۔

چخوف کے تیسرے ڈرامے ”دانیاماموں“ میں جذبات کا وہ
انجھاؤ نہیں ہے جو روسی معاشرت نے پیدا کیا تھا، لیکن اس درجہ
سے اس کو پڑھ کر دل پر اور بھی زیادہ سخت چوٹ لگتی ہے۔ سریب
ریاکوف، ایک پروفیسر اور انشا پرداز، جس کی پہلی بیوی کا انتقال
ہو چکا ہے دوسری شادی کرتا ہے اور بیوی کے ساتھ اس مکان میں
جا کر رہتا ہے جو اس کی پہلی بیوی کو جہیز میں ملا تھا۔ مکان کے ساتھ
تھوڑی سی جائیداد بھی ہے جس کا انتظام شروع سے اس کے سالے
(پہلی بیوی کے بھائی) ووی نیٹسکی کے سپرد رہا ہے اور سریب
ریاکوف کی لڑکی سونیہ بھی ہوش سنبھالنے کے بعد سے جائیداد کے
کام میں اپنے ماموں کی مدد کرتی رہی ہے۔ ماموں بھانجی دونوں
خوش اور مطمئن تھے اور چوں کہ انھیں خیال تھا کہ سریب ریاکوف
علمی اور ادبی دنیا میں بڑی حیثیت رکھتا ہے اس لیے وہ اس کی خدمت
کرنا ضروری اور اچھا سمجھتے تھے۔ مگر جب پروفیسر اپنی جوان اور

خوبصورت بیوی کے ساتھ مکان میں آکر رہنے لگتا ہے تو دونوں کی آنکھیں کھل جاتی ہیں۔ سونیا شروع میں اپنی سوتیلی ماں سے بات تک نہیں کرتی، دومی نیٹ سکی کو یقین ہو جاتا ہے کہ پروفیسر اوجھے علم اور کمینی طبیعت کا آدمی ہے، وہ اسے خوبصورت بیوی رکھنے کا مستحق نہیں سمجھتا، اسے موقع بے موقع بُرا بھلا کہتا ہے اور اس کی بیوی سے ایسی باتیں کرتا ہے جو کوئی شریف عورت گوارا نہیں کر سکتی۔ دومی نیٹ سکی کو سب سے زیادہ شکایت اس بات کی ہے کہ وہ ۴۴ برس کا ہو گیا ہے قابلیت میں کسی سے کم نہیں، مگر ایک غلط فہمی کی وجہ سے اس کی عمر کا بہترین حصہ ضائع ہو چکا ہے اور اب اس کے لیے زندگی کا لطف اٹھانے کا موقع نہیں۔ سریب ریا کوٹ کو عورتیں نہ معلوم کیوں پسند کرتی ہیں، وہ واقعی نہایت خود غرض اور تکلیف دہ مزاج کا ہے اور ہمیں اس پر مطلق افسوس نہیں ہوتا کہ دومی نیٹ سکی اسے طعنہ دے کر گھر سے بھگا دیتا ہے۔ لیکن اس کے چلے جانے سے کوئی مشکل آسان نہیں ہوتی۔ دومی نیٹ سکی کے شکوہ شکایت کا انداز وہی رہتا ہے اور بیچاری سونیا کو دنیا سے کوئی امید نہیں رہتی۔

جب تک پروفیسر مکان میں رہا، آسٹرون، ایک ڈاکٹر، اسے اکثر دیکھنے آیا کرتا تھا۔ سونیا کی ڈاکٹر سے پہلے بھی ملاقات ہوتی تھی، اور سونیا کو اس سے بڑی محبت تھی، مگر سونیا کی صورت شکل اچھی نہیں تھی، اس لیے ڈاکٹر نے کبھی اس کی محبت کی پروا نہیں کی۔

باپ کی موجودگی کے زمانے میں سونیا نے ایک مرتبہ اپنی سوتیلی ماں سے کہا کہ آستروف سے باتوں باتوں میں دریافت کر لے کہ وہ شادی پر راضی ہوگا یا نہیں، اسے کیا خبر تھی کہ اس درمیان میں آستروف اس کی سوتیلی ماں کا گرویدہ ہو گیا ہے، اور وہ بھی اپنے اصولوں کے باوجود ڈاکٹر سے بالکل بے اتفاقی نہیں برت سکی ہے۔ وہ گفتگو جس میں سونیا کی قسمت کا فیصلہ ہونے والا تھا ڈاکٹر کے لیے اپنے جذبے کے اظہار کا موقع بن جاتی ہے اور ڈاکٹر کو سونیا کی سوتیلی ماں کے میلان کا بھی پتہ چل جاتا ہے۔ گفتگو کا نتیجہ صرف یہ ہوتا ہے کہ ڈاکٹر سونیا کی سوتیلی ماں کو دو چارہ مرتبہ پیار کر لیتا ہے اور وہ شوہر کے ساتھ جانے لگتی ہے تو یادگار کے طور پر ڈاکٹر کی ایک پنسل اپنے پاس رکھ لیتی ہے۔ آخر میں جب سب چلے جاتے ہیں تو سونیا اور اس کے ماموں کے لیے کسی نہ کسی طرح دل کو سمجھا بھجا کر تنہائی اور بے لطفی کی زندگی برداشت کرنے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں رہتا۔ چخون نے ڈرامے کے آخری سین میں اپنے دل کا سارا درد بھر دیا ہے:-

وہی نیت سکی (سونیا کے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے) میری بچی میرے دل پر بڑا بوجھ ہے، تجھے کیا بتاؤں کیا بوجھ ہے! سونیا: کیا کریں، چننا تو پڑے ہی گا (خاموشی) تو کیا ہوا، وانیاموں، پھر جنیں گے۔ دنوں کا ایک لگاتار سلسلہ، شام کا گراں وقت، گزار دیں گے، قسمت ہماری جس طرح پر بھی آزمائش کرے، ہم اُسے صبر کے

ساتھ بھگت لیں گے۔ اب اور بڑھاپے میں ہم دوسروں کے لیے محنت کریں گے آرام کا نام نہ لیں گے۔ اور جب ہماری گھڑی آئے گی تو عافیت کے ساتھ مرجائیں گے اور قبر کے اس پار پہنچ کر ہم کہیں گے کہ ہم نے مصیبتیں جھیلی ہیں، روئے ہیں، ہم کہیں گے کہ ہمارے لیے زندگی تلخ تھی، خدا کو ہم پر رحم آئے گا اور تب ماموں، میرے پیارے ماموں، ہم پر ایک روشن چین، بڑے لطف زندگی کا دروازہ کھلے گا، اس وقت کے غم پر ہم کو حیرت ہوگی، اس کا خیال کر کے ہم مسکرائیں گے اور تب ہمیں آرام ملے گا۔ مجھے یقین ہے، دل دجان سے یقین ہے... (گھٹنوں پر کھڑی ہو کر ماموں کے ہاتھوں پر سر رکھ دیتی ہے، تھکی آواز سے) ہم کو آرام ملے گا... مجھے یقین ہے یقین ہے... (ماموں کے آنسو پونچھتی ہے) میرے پیارے، پیارے ماموں، آپ رورہے ہیں... (خود رو کر) زندگی میں تو آپ کو کوئی خوشی نصیب نہیں ہوئی، مگر ٹھیرے، وایا ماموں، ٹھیرے، ہم کو آرام ملے گا... (ماموں کو لپٹ کر) آرام ملے گا... آرام ملے گا۔“

”وایا ماموں“ کے آخر میں ان آنسوؤں کے ساتھ تھوڑا بہت غم بھی یہ جاتا ہے اور طبیعت کچھ ہلکی ہو جاتی ہے، ”تین بہنوں“ میں تسلی کا یہ بہانہ بھی کام نہیں آتا اور شروع سے آخر تک ایک ایسی اداسی چھائی رہتی ہے کہ جس سے دم گھٹتا ہے۔ ڈراما کی مرکزی سیرتیں تین بہنیں، اولگا، ماشا اور ایرینا ہیں۔ پہلے ہی سین میں ان کی ساری کیفیت معلوم

ہو جاتی ہو، ان کے ارمان، ان کی مصیبتیں اور وہ غم جو ہر ایک کے دل میں گھر کیے ہوئے ہیں۔ ان کا باپ فوج میں کسی بڑے عہدے پر ملازم تھا اور کسی زمانے میں وہ سب دارالسلطنت ماسکو میں رہتی تھیں۔ لیکن باپ کا انتقال ہو گیا، مالی دشواریوں نے ان کو ایک قصبے میں جا کر رہنے پر مجبور کیا، جہاں رہتے انہیں گیارہ برس ہو گئے ہیں۔ اولگ اسکول میں پڑھاتی ہو، مگر اس کام میں اس کا جی نہیں لگتا اور اسے اتنی محنت کرنی پڑتی ہو کہ اس کے ہر وقت سر میں درد رہتا ہو۔ غالباً اس خیال سے کہ اس کی عمر بہت زیادہ ہو گئی ہو وہ شادی کا حوصلہ نہیں کرتی، مگر اس کے دل میں محبت اور انسانی ہمدردی کا جذبہ اتنا قوی ہو کہ اپنا اور پرایا دکھ درد اسے ہر وقت بے چین رکھتا ہو۔ دوسری بہن ماشا کی ایک اسکول کے استاد سے شادی ہو گئی جسے وہ پہلے بہت لائق سمجھتی تھی اور اس سے ڈرتی دبتی بھی تھی۔ لیکن ساتھ رہنے نے شوہر کی قلعی کھول دی ہو اور ماشا کو معلوم ہو جاتا ہو کہ اس کی ذہانت اور علمی قابلیت معمول سے بھی کم ہو اور وہ ایک دلو، خوشامدی اور بد مذاق آدمی ہو۔ ماشا نے اس کا ادب اور لحاظ کرنا بالکل چھوڑ دیا ہو، اپنے آپ کو بالکل آزاد رکھتی ہو مگر اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ اس آزاد دی کو کسے کیا۔ سب سے چھوٹی بہن ایرینا کو اس کا حوصلہ ہو کہ ماسکو جا کر وہاں رہے اور اسے یقین ہو کہ وہ ایسا کر سکی تو اس کی تمام مصیبتیں ختم

ہو جائیں گی اور اسے جینے میں وہ مڑاٹے گا جس کو وہ اب تک ترستی رہی ہے۔ وہ صرف بڑے شہر میں رہنے، شائستہ لوگوں سے ملنے، اچھا کھانے اور اچھا پہننے کی خاطر ماسکو نہیں جانا چاہتی، وہ ایک موقع پر کہتی ہے کہ ”محنت کرنا چاہیے، محنت۔ ہم خوش اس وجہ سے نہیں رہتے، زندگی کو ہم ایسی اُداس نظروں سے اس لیے دیکھتے ہیں کہ ہم محنت کرنا نہیں جانتے، ہم ایسے لوگوں کی اولاد ہیں جو محنت کو حقیر جانتے تھے۔“ وہ خود محنت کر کے عمل اور خیال میں مطابقت قائم رکھتی ہے۔ مگر اس کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی ہے کہ اگر وہ ہسکو نہ جاسکی تو سب کچھ بیچ ہو گا اور اس لیے محنت کرنے پر بھی اس کی طبیعت پڑ مردہ رہتی ہے۔ ایک فوجی افسر تیزن باخ، جو ایرینا سے محبت کرتا ہے، محنت کر کے روٹی کمانے کے شوق میں ملازمت سے ہتھوڑا دے دیتا ہے۔ ایرینا جانتی ہے کہ وہ بڑی خوبیوں کا آدمی ہے اور دل سے اس کی قدر کرتی ہے۔ مگر اُسی دل کو اس کی طرف سے ٹھنڈا بھی پاتی ہے، اس سے شادی کرنے پر راضی ہو جاتی ہے، مگر جو محبت اس کے خیال میں عورت کو مرد سے ہونا چاہیے اس سے اپنے سینے کو خالی دیکھتی ہے۔ شادی کی نوبت نہیں آنے پاتی، اس لیے کہ تیزن باخ کا ایک ملاقاتی فوجی افسر رنک میں اسے مار ڈالتا ہے اور ایرینا ہاتھ مل کر رہ جاتی ہے۔ ماسٹا پر اس سے بھی زیادہ سخت مصیبت آتی ہے۔ وہ ایک فوجی افسر سے ملتی ہے، دونوں ایک دوسرے کو بہت

پسند آتے ہیں، لیکن پھر محبت کی آگ بجھانے کی تدبیریں کرنا پڑتی ہیں کیوں کہ فوجی افسر بیوی بچوں والا آدمی ہے اور اس کی شاعرانہ گفتگو بے بسی اور منطو مینیت کا ترانہ ہے۔

”تین بہنوں“ کو پڑھنے کے بعد یہ خیال ہوتا ہے کہ روسی سوسائٹی زیادہ دن قائم رہنے والی نہیں اور چخوف نے اپنی طرف سے اس کے عنقریب فنا ہو جانے کی پیشین گوئی ”باغ“ میں کی۔ ڈراما میں مرکزی حیثیت ایک شریف خاندان کی عورت لیوبوف آندرے یفنا کو دی گئی ہے۔ اس نے اپنے گھر والوں کی مرضی کے خلاف ایک وکیل سے شادی کر لی تھی جو طبیعت کا بہت اچھا مگر بہت گیا گزرا شرابی تھا اور اسی لت کی وجہ سے جلد مر گیا۔ اس کے مرنے پر لیوبوف آندرے یفنا کی ایک اور شخص سے آشنائی ہو گئی جس کی خاطر اس نے اپنی ساری جائیداد گنوا دی اور پھر اس کے قریب رہنے کے لیے پیرس میں جا کر پڑی۔ ڈراما کا قصہ جب شروع ہوتا ہے تو وہ پانچ برس کے بعد پہلی دفعہ گھر واپس آئی ہے۔ اپنا پیدائشی گھر دیکھ کر اسے جو خوشی ہوتی ہے، جس محبت سے وہ ہر ایک سے ملتی ہے اس سے ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ وہ دل کی بہت اچھی ہے، مگر ہم یہ بھی دیکھ لیتے ہیں کہ اسے اپنی طبیعت پر ذرا بھی قابو نہیں اور نہ وہ سمجھتی ہے کہ دنیا میں گزر بسر کرنے کے لیے کیسی احتیاط اور عاقبت اندیشی درکار ہے۔ اسے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا مکان اور

ملے ڈراما کا پورا عنوان ”چی کا باغ“ ہے۔

باغ نیلام ہونے والا ہو تو اسے بچانے کی وہ خود کوئی فکر نہیں کرتی اور کسی دوسرے کو بھی کچھ کرنے نہیں دیتی۔ لیکن جب مکان اور باغ نیلام ہو جاتا ہے تو وہ ہر شخص اور ہر چیز سے اس طرح رخصت ہوتی ہے کہ آنکھوں میں آنسو بھر آتے ہیں۔

لیوبوف آندرے یفنا کا بڑا بھائی گایف اپنی طبیعت میں کچھ کم تباہی کا سامان نہیں رکھتا۔ وہ ذہین تو ہے مگر ساری عمر بیکاری میں گزارنے سے پچاس برس کی عمر میں اس کا یہ حال ہو گیا ہے کہ اس کی بچوں کی طرح دیکھ بھال کرنا اور اسے بات بات پر ٹو کنا پڑتا ہے۔ معاملے کی کوئی بات اس کی سمجھ میں نہیں آتی، وہ ہر وقت یا تو تقریر کرتا ہے یا بلیرڈ کے ہاتھ دکھاتا ہے۔ اسی ذہنیت اور مزاج کا ایک اور نمونہ تروفی موف ہے، جو کسی زمانے میں لیوبوف آندرے یفنا کے بچے کو پڑھایا کرتا تھا اور اس کے انتقال کے بعد بھی گھر میں پڑا رہا۔ اس کی تقریریں سن کر خیال ہوتا ہے کہ وہ نہایت بلند حوصلہ اور مضبوط ارادے کا آدمی ہے اور ضرور کچھ کر دکھائے گا، دراصل اس کے تخیل کی بلند پروازی گایف کی تقریروں کی طرح ایک لت ہے، جس نے اس کو بالکل ٹکٹا کر دیا ہے۔ ڈراما کی سیرتوں میں اگر کوئی ہے جس میں زندہ رہنے کی استعداد ہے تو وہ ایک تاجر کا لڑکا لوپوخن ہے۔ وہ ڈنڈے کھا کھا کر پلا ہے، یورپی تہذیب سے بے بہرہ ہے، مگر اپنے فائدے نقصان کو سمجھتا ہے اور اس میں اتنی جستی اور دوردھوپ کا مادہ ہے کہ اپنے

منصوبے پورے کرے۔ اس تردت سکی کو روسی سوسائٹی کی فلاح اسی طبیعت کے آدمی پیدا کرنے میں نظر آئی تھی، چخوف نے بھی اس حقیقت سے انکار نہیں کیا، لیکن وہ جانتا تھا کہ تعلیم یافتہ روسی دنیا سے رخصت ہو جانا اپنی وضع بدلنے سے زیادہ آسان سمجھیں گے۔

چخوف کو رونے اور زلزلے کے ساتھ ہنسنے اور ہنسانے میں بھی کمال حاصل تھا۔ اس کے فرحیہ ڈرامے، جو بہت مختصر ہیں اپنے طرز میں بے مثل ہیں۔ لیکن ان کا مزہ سیرتوں کی خصوصیات میں نہیں بلکہ گفتگو میں ہے۔ اور بغیر ڈراموں کو پڑھے حاصل نہیں ہو سکتا۔

چخوف کا خاص طرز بہت مقبول ہوا، لیکن چخوف استاد کا کام نہ دے سکا، اس لیے کہ اس کے طرز کی نقل کرنا ممکن نہیں۔ اس کے اور ان استعاریت پسندوں کے درمیان جن کا جنگِ عظیم سے پہلے چرچا تھا صرف گورکی کا ڈراما ”قرندلت“ ذکر کے لائق ہے، جس پر چخوف کا اثر نظر نہیں آتا بلکہ دستہ نعت سکی کا۔ روسی نقادوں نے تو اس میں کوئی خاص خوبی یا حدت نہیں پائی، کیوں کہ ان کے نزدیک گورکی اور دوسرے انشا پرداز ایسے فلسفیانہ مزاج کے خانہ خراب لوگوں کو جن کی ذہنیت اور حالات اس ڈراما کا موضوع ہیں بہتری تصانیف میں پیش کر چکے ہیں، مگر یورپ میں یہ ڈراما بہت پسند کیا گیا اور واقعی وہ ہزار خوبیوں کی چیز ہے۔ اس کا پس منظر ایک سرائے ہے جس میں بے روزگار اور جہایم پیشہ لوگ رات کو پناہ لیتے ہیں اور

ایک چور، ایک خرابی، ایک مفلس خطاب یافتہ زمیندار، ایک لوہار اور اس کی مدقوق بیوی، سرانے کی بھینارن، اس کی ایک رشتہ دار جوان لڑکی تاشا، اس کی خادمہ ناستیا ڈراما کی ممتاز سیرتیں ہیں۔

ان سب کے دن کسی نہ کسی طرح کٹ رہے ہیں کہ اچانک لوکا، ایک فقیر آکر ان کی طبیعتوں میں انقلاب پیدا کر دیتا ہے۔ کسی کو معلوم نہیں کہ وہ کون ہے اور کہاں سے آیا ہے، لیکن اس میں معاملے کو سمجھنے اور سلیقے سے بات کرنے کی ایسی حیرت انگیز قدرتی صلاحیت ہے کہ وہ فوراً اعتبار حاصل کر لیتا ہے اور سب کا راز داں بن جاتا ہے۔ اس کے لہجے میں کچھ ایسی نرمی، اس کی زبان میں ایسا جادو ہے کہ سب اسی کی بات کو سنتے ہیں اور اسی کو سننا چاہتے ہیں، دنیا ان سے جو برتاؤ کرتی رہی ہے اسے معاف نہیں کرتے مگر لوکا کے سامنے سر جھکا لیتے ہیں۔ لوہار کی مدقوق بیوی، جس نے ساری عمر میں ایک لمبے بغیر تکلیف کے نہیں گزارا ہے خدا کے رحم و کرم اور جنت کے سکون اور آرام کی کہانی سننے سننے آخر کو مسکراتی ہوئی اپنی آنکھیں ہمیشہ کے لیے بند کر لیتی ہے، شرابی کو، جس کے قومی آہستہ آہستہ جواب دے رہے ہیں لوکا ایک ہسپتال کا قصہ سناتا ہے جہاں خرابیوں کا سخت علاج کیا جاتا ہے اور ان کو اس ہلکے عادت سے نجات دلائی جاتی ہے۔ ہسپتال کا ذکر سن کر شرابی کی ڈھارس بندھ جاتی ہے اور یہ امید کہ وہ ہسپتال تک پہنچ جائے گا اس کی زندگی کا ایک اکیلا

سہارا بن جاتی ہے، ایسا سہارا کہ جب لوگ شرارت میں اس سے کہتے ہیں کہ یہ ہسپتال فقیر کی ایجاد ہے اور کوئی اصلیت نہیں رکھتا تو نثرانی مایوس ہو کر خود کشی کر لیتا ہے۔ فقیر کی خاص توجہ چور اور نتاشا کی طرف رہتی ہے اور انھیں وہ نئی اور پاک صاف زندگی کی رغبت دلانے کی بڑی کوشش کرتا ہے۔ چور دراصل خاصا نیک دل ایمان دار آدمی ہے، جس کا باپ چور تھا اور جسے لوگوں نے چور کہتے کہتے باپ کا پیشہ اختیار کرنے پر مجبور کر دیا۔ اس کا چوری کرنا اور مذہب اور اخلاق کو ڈھکوسلا سمجھنا اس کے اخلاقی حس کا پتہ دیتا ہے، اسے عیب اور ریاکاری پر غصہ آتا ہے، نیکی پر ہنسی نہیں آتی۔ ایک موقع پر وہ فقیر سے پوچھتا ہے کہ بتاؤ خدا ہی یا نہیں، اور فقیر جواب دیتا ہے کہ ”مانتے ہو تو ہی اور نہیں مانتے ہو تو نہیں“ یہ جواب سن کر چور ایسا چپ ہوتا ہے کہ دیر تک اس کے منہ سے کوئی بول نہیں نکلتا اور وہ فقیر کا دل سے مستفاد ہو جاتا ہے۔ لیکن فقیر کا حوصلہ کہ چور اور نتاشا ایک دوسرے سے محبت کریں پورا نہیں ہوتا، اس لیے کہ چور کا بھٹیاریں سے یا رانہ ہی اور وہ اسے نتاشا کی طرف مائل دیکھ کر ایسا فتنہ برپا کرتی ہے کہ چور اور فقیر دونوں غائب ہو جاتے ہیں۔

”قعر مذلت“ کے علاوہ گور کی نے اور کئی ڈرامے لکھے جو کوئی خاص خوبی نہیں رکھتے۔ شاعر دیا چلاف اداؤں نے چخوف کے طرز

میں طبع آزمائی کی، لیونڈ آندرے یف نے ڈراما کو اعصابی دیوانہ پن میں رنگنے کی کوشش کی، اگلے ہی تاستائی نے نئیاتی جمیدگیوں اور روحانی امراض کے مطالعے کو چھوڑ کر صمیم العقل یورپی انشا پردازوں کی طرح قصے اور کشمکش کو نمایاں کرنا چاہا اور استعاریت پسندوں نے ڈراما میں اپنے خاص انداز کو کھپانا چاہا۔ ان میں سے کسی میں اتنا مادہ نہیں تھا اور کسی کے پاس علم، تصورات اور عقائد کا اتنا ذخیرہ نہیں تھا کہ ایک نیا ڈھب اختیار کیا جاسکے اور انشا پردازی کی دوسری قسموں کی طرح انقلاب سے پہلے کی ڈراما نویسی بہت سے رنگوں کی یک جہتی پر جسے تصویر نہیں کہا جاسکتا۔ ان کوششوں میں اگر کوئی قابل ذکر ہیں تو استعاریت پسندوں کی، جن میں سب سے ممتاز شخصیت اگسٹ بیلوک کی ہے۔

بلوک کے ڈرامے بہت اٹوکھے اور نرالے ہیں، ان کی زبان بہت فصیح ہے اور ان میں سے جو ایٹج پر دکھائے گئے وہ خاصے مقبول ہوئے۔ لیکن زندگی کو بلوک جس رنگ میں دکھاتا ہے، انسانی کیفیتوں کو جس انداز سے وہ پیش کرتا ہے اسے سمجھنا ذرا مشکل ہے اور نتیجے کے طور پر جو حقیقت آخر میں واضح ہوتی ہے وہ ہمیں ایسی بلند اور بصیرت افروز نہیں معلوم ہوتی کہ جس کی خاطر روزمرہ زندگی کا نقشہ اس طرح بگاڑا جائے جیسے کہ استعاریت پسند جانتے ہیں۔ مثلاً بلوک نے اپنے ڈراما ”انجان عورت“

میں اس حجاب کو اپنا مومنوع بنایا ہے جو دیدار کے مشتاق شاعر کو
 حسن کامل سے جُدا رکھتا ہے۔ حسن کامل کا مجسمہ ایک انجان عورت
 ہے جو آسمان پر ایک ستارہ تھی اور زندگی اور جذبات کی بیج و تاب
 کا مژہ اٹھانے کے شوق میں زمین پر اتر آئی۔ چوں کہ شاعر میں اتنا
 حس نہیں کہ اس کے قرب کو محسوس کرے نہ آنکھ میں اتنی قوت
 کہ اسے پہچان سکے، انجان عورت کا کوئی پُرسانِ حال نہیں۔

پہلے وہ ایک شراب خانے کے دروازے پر جس کے اندر اور لوگوں
 کے ساتھ شاعر بھی بیٹھا شراب پی رہا ہے منتظر کھڑی رہتی ہے، پھر
 ایک میدان میں نازل ہوتی ہے جس میں سے کچھ پہلے دو آدمی مست
 اور بے خبر شاعر کو پکڑ کر لے جا چکے ہیں، شاعر کو کچھ تو خیال ہوتا ہے
 کہ وہ کہیں قریب آئی ہے، مگر جب تک اس کا نشہ اترے اترے
 انجان عورت کو ایک بواہوس لے اڑتا ہے۔ تیسرا منظر ایک مکان
 ہے جس میں بہت سے مہمان جمع ہیں، انھیں میں شاعر بھی ہے اور
 اس وقت جب وہ اپنی ایک نظم سناتا ہوتا ہے، انجان عورت بھی
 آجہنچی ہے۔ شاعر اسے پہچان تو لیتا ہے، مگر خاکساری اور بے مائگی
 کا احساس اسے انوکھے مہمان سے دور رکھتا ہے، انجان عورت
 مایوس ہو جاتی ہے اور پھر آسمان پر جا کر ستارے کی طرح چمکنے لگتی ہے۔
 اس ڈراما کا وہ پہلو جو استعاریت پسندوں کے نزدیک اس کی جان
 ہے سچ پوچھا جائے تو بہت کمزور ہے، البتہ وہ حصے جن میں عام

زندگی کی بیہودگی اور لغویت ظاہر کی گئی ہے، یعنی اس میں حقیقت نگاری کا جو پہلو ہے، وہ بہت مؤثر ہے اور واقعی دنیا کو شائستہ اور پاک کرنے کا حوصلہ پیدا کرتا ہے۔

۱۹۱۰ء تک سمجھنا چاہیے چخوف کے طرز کا دور ختم ہو گیا اور استعاریت کی ادبی تحریک کمزور پڑ گئی۔ اسی کے ساتھ ایکٹنگ کے وہ اصول جن کے مطابق حقیقت نگاری اور ڈراما کی فصاحت پر پیدا کرنا فن کا اصل مقصد تھا چھوڑے جانے لگے۔ خود ستانداں سکی، ماسکو آرٹ تھیٹر کے بانی نے پُرانے مسلک سے ہٹ کر نئی راہیں تلاش کرنا شروع کیا اور انقلاب، جو تھیٹروں کے حق میں بہت مفید ثابت ہوا، نئے تجربے کرنے کی تحریکوں کی سرپرستی کرتا رہا۔ ان مظاہر پر یہاں بحث نہیں کی جاسکتی، اس لیے کہ ایسی بحث بالکل اصطلاحی ہو جائے گی اور ہمارا موضوع ایکٹنگ اور سٹیمنگ کا فن نہیں بلکہ ادب ہے۔

